

یونہی آئیں جینا

شقیق برلاس

کتاب خانہ عابد روضہ حیدر آباد دکن

تیسرا باب :-

نظریہ خودی تکمیل خود کی تعریف -

انفرادیت اور شخصیت میں فرق -

۳۱ انفرادی زندگی کا قانون -

چوتھا باب :-

۳۲ انفرادی زندگی

پانچواں باب :-

۳۳ اجتماعی زندگی

چھٹا باب :-

۳۴ توہمات فلسفہ اور مذہب -

ساتواں باب :-

۳۵ اسلامی ریاست حکومت الہیہ -

دوسرا حصہ

پہلا باب :-

فطری ضروریات کی تکمیل کا بہترین

۳۶ طریق کیا ہے ؟

دوسرا باب :-

عشق و محبت جنسی بھوک خوبصورتی

۳۷ اور عورت باہمی تعلق

تیسرا باب :-

۳۸ سماجی مستقریں

چوتھا باب :-

پکنک - پارٹیوں - دعوتوں وغیرہ کا

اخلاقی اور مذہبی پہلو ۱۵۸

پانچواں باب :-

عورت اور شراب ۱۶۷

چھٹا باب :-

علم و ہنر ۱۸۸

ساتواں باب :-

کامیاب زندگی ۱۹۸

آٹھواں باب :-

دولت سرمایہ اور مزدور محنت .. ۱۰۵

تیسرا حصہ

پہلا باب :-

آئین مسرت ۲۲۹

دوسرا باب :-

کلمہ نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج کا

صحیح مفہوم ۲۳۸

تیسرا باب :-

ایک تجویز ۲۵۱

ہر اُس شخص کے نام —
جس نے اِس دُنیا کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔

پیش لفظ

جب ہم اپنے گرد و پیش بکھری ہوئی زندگی پر نظر دوڑاتے ہیں تو بیشمار تجلیوں، مصائب اور آلام کی دیوار ہمارے سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے۔ انسان کی زندگی بے کیا ہے؟ مشاہدے اور تجربے کی بدولت ہم اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ زندگی المناک حقائق کی ایک طویل داستان ہے۔

زندگی کے سمندر کی خواہی حساس اور سمجھدار انسان کا روز ازل سے محبوب ترین مشغلہ رہی ہے۔ ہر ذہین انسان نے اس کی تلخی کو چکھا اور اسے کم کرنے کی کوشش کی۔ خدا پر بھی شاید انسانی زندگی کی ہولناکیاں آئینہ نہیں ماسی لئے وہ اپنی مخلوق کی خاطر اپنے سینہ میں بھرتا رہا۔ اُسے بھی شاید معلوم تھا کہ انسان کیلئے اس گتھی کو سلجھانا بہت دشوار ہے۔

تاریخ عالم کے لہذاق اُلٹنے سے پہرے چلتا ہے کہ مختلف مقامات پر مختلف پیغمبر مختلف پیغامات لیکر آئے۔ انہوں نے پیغام خدا کو دنیا کے ہر کونے تک پہنچایا۔ ان کی رہنمائی کو کروڑوں انسانوں نے قبول کیا۔ ان کے پیغام کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت کے باوجود دنیا میں میحان و مضطرب، تاریکی و گمراہی انتشار و خلفشار موجود ہے۔ لیکن ایسا کیوں ہے؟ انسان کو اثرات المخلوقات کہا گیا ہے۔ لیکن وہ

میرے بچے میں تم کو نہیں کر سکتا۔ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ انسان کی سرشت نیکی کی ضد ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا نیک انسانوں سے خالی نہیں ہے۔ شرافت اور انسانیت کا فقدان نہیں مگر ہمیں ساتھ ساتھ یہ بات بھی ماننا پڑے گی کہ پیغمبروں کے مؤثر پیغامات بے اثر ہو کر رہ گئے۔ ایسی وہ بھی ہو سکتی ہے کہ تعجب حیرت اور حیرتس انسان کی عادت ثانی بن چکا ہے جس راستے کو خوفناک بتا کر اُسے اُس پر چلنے سے روکا جاتا ہے۔ وہ اسی طرف قدم اٹھاتا ہے جس طرف آدم کو جنت سے نکلوانے والا یہی سختس اور یہی تعجب تھا۔

زندگی کے متعلق بشمار نظریات سننے میں آتے ہیں۔ زندگی گماہر زاد یہ نگاہ سے پرکھا جاتا ہے ارض مغرب میں جہاں مذہب کو ایک ثانوی حیثیت دے دی گئی ہے۔ وہاں سائنس زندگی کی کسوٹی ہے اور مشرق میں جہاں مذہب آج بھی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ دیتا ہے۔ زندگی کی کسوٹی مذہب ہی ہے۔ لیکن جدید سائنس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ سائنس بھی جہاں سے چلی ہے گھوم پھر کر وہیں آ رہی ہے۔ انسانیت مذہب کے انحراف کرنے کے بعد دوبارہ مذہب کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یہ بات قرین قیاس بھی ہے۔ زندگی کے لئے کوئی مذکورہ لائحہ عمل مرتب کرنا ہی پڑتا ہے۔ زندگی کو کبھی تنظیم کا پابند کرنا ہی پڑتا ہے جیسی تو ایک مشہور فلسفی نے کہا تھا کہ اگر کوئی خدا نہیں ہے تو ہمیں ایک خدا ضرور بنالینا چاہئے۔ اس دعویٰ کو شکست خوردہ ذہنیت قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ زندگی ایک نظام کے تحت ہی خوشحال رہ سکتی ہے۔

اب چونکہ خدا نے دنیا میں اپنے پیغمبر بھیجا بند کر دیئے ہیں۔ اس لئے انسان تاریکی میں اپنا رستہ آپ ڈھونڈنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ یہ درست ہے کہ اُس کے پاس خدا کے پیغامات الہامات صحیفہ دل میں موجود ہیں لیکن زمانہ ترقی کر گیا ہے۔ انسان نے کیوں۔ کیسے۔ اور کس طرح کہنا سیکھ لیا ہے۔ ان سوالات کا جواب الہامی کتب میں موجود نہیں۔ اسی لئے تمام دنیا پریشان ہے۔ پریشانی اور اضطراب میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اضطراب کے اعتبار سے موجودہ دور مہموری و دوس ہے۔

انسان تاریکی میں بیٹھا ہوا چہرہ راہے پر کھڑا ہے۔ کدھر چلے؟ کہاں جائے؟۔

کون سا راستہ اختیار کرے۔ اس تذبذب کا ملمس ابھی نہیں ٹوٹا۔ یہ بات بھی نہیں تاریکی میں استہ
مٹول مٹول کر چلنے والے بھی اس دنیا میں موجود ہیں۔ شاید ان مختلط راہگیروں کی کوششیں ایک
دن شروع ہوں اور دنیا مسرور اور خوشحال ہو جائے۔ ان مختلط راہگیروں میں قیمتی سے ایک ہیں
بھی ہوں۔ زندگی کے غائر مطالعہ اور تبادلاً خیال کے ذریعہ زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کی
ہے اور میری وہ کوشش اس کتاب کی صورت میں حاضر خدمت ہے۔

میں نے اس کتاب میں — اپنے تجربات کو جمع کر دیا ہے۔ نفسیات کی روشنی میں ہر چیز کا جائزہ
لیا ہے۔ تجربات کی نفسیاتی تحلیل سے ان کے حسن و قبح پر روشنی ڈالی ہے۔ صداقت کو صداقت اور
نہایت کو نہایت بتایا ہے۔ پردہ پوشی سے کام نہیں لیا۔ کسی کے ساتھ جانب داری نہیں کی غیر
جانب دار ہو کر اور ہر قسم کے تعصب سے بے نیاز ہو کر دنیا کے ہر موضوع پر بے لاگ تبصرہ کیا ہے۔ حکماء
کا قول ہے کہ صحیح فن کا ردی ہے جو حالات کا تجزیہ کرے اور پھر ہمیں درست راستہ دکھائے۔
میں نے اسی مثل پر عمل کیا ہے۔

میں نے تصور کے دونوں رخ دکھائے ہیں۔ جنت بھی۔ جہنم بھی۔ میں عیوب و محاسن بنا کر
بی نہیں رہ گیا۔ بلکہ میں نے سچے راستے کی رہنمائی بھی کی ہے۔ میں پیغمبر نہیں ہوں۔ بلکہ ایک انسان
ہوں اور وہ بھی آپ سے مختلف نہیں۔ میں نے کہیں بھی درس و تدریس کی کوشش نہیں کی۔ خطا
کا رنگ کہیں بھی اختیار نہیں کیا۔ اس زندگی میں بے شمار تجربے کئے ہیں۔ ان کے حسن و قبح پر
غور کیا ہے جو منظر میں نے دیکھا ہے اسے آپ کو بھی دکھانے کی سعی کی ہے۔ منطق اور دلائل سے
صحیح رستے کے انتخاب میں آپ کی مدد کی ہے۔

زندگی کا موضوع بڑا دشوار ہے۔ اس پر کچھ لکھنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ میں نے
دوسروں کے تجربات سے بھی فائدہ اٹھایا ہے لیکن اپنے تجربات کو مستند سمجھا ہے۔ کیونکہ میں اس
سلسلے میں تاریک اور قلعن سے بھرے ہوئے غار میں بھی کود پڑا ہوں اور گلستانوں کی سیر بھی کی
ہے۔ دیکھتے اور پہلہا نئے ہوئے گلستانوں کی۔

دنیا میں خلوس کی کمی ہے۔ لیکن اس کتاب میں عاجز و خلوص کا مظاہرہ کیا ہے۔ اگر خلوص

عام ہو جائے تو مصائب ختم ہو سکتے ہیں۔ سی۔ ای۔ ایم جوڑ اپنی تازہ کتاب
GUIDE TO MODERN THOUGHT کے آغاز میں لکھتا ہے۔

”ایسے روایتی سوالات بھی ہیں جنہیں مردوں اور عورتوں نے ہر دور میں پوچھا ہے اور
یہی سوالات آج بھی پوچھے جا رہے ہیں۔ کیا یہ کائنات ایک ہنگامی ترتیبِ فترات سے آیا ایک
خاص مقصد اور تجویز کا آئینہ ہے؟ کیا یہ دنیا جس میں ہم سانس لے رہے ہیں۔ ایک حادثہ ہے کہ
تجویز — کسی کا فن پارہ؟ کیا زندگی مادی نظامِ کار کی حادثاتی پیداوار ہے؟ انسانی آبادی
کبھی انتہائی منازلِ ترقی پر کامزن ہو سکے گی کہ نہیں؟ یا یوں ہی ناکام رہے گی؟ ہمیں اپنی مرضی
کے مطابق زندگی بسر کرنے کا اختیار ہے کہ ہم خواہشات کے غلام ہیں؟
میں آخر میں صرف اسی قدر کہنا چاہتا ہوں کہ یہ کتاب انہی سوالات کا جواب ہے۔ میں
خوش ہوں گا۔ اگر اس کتاب نے آپ کو صحیح راستے سمجھانے میں مدد دی۔“

شفیق برلاس

جائیدہر چھاؤنی
۲ فروری ۱۹۴۶ء

پہلا حصہ

پہلا باب

زندگی کا مقصد علم الاخلاق — جذبات فطری خواہشات اور ضرورت

سیدھی چوڑی اور سرنگیں ٹرک پر رونق بازار کو چیرتی ہوئی گزر جاتی ہے بچک کے ایک کونے پر جہاں کانٹیل کھڑا ہوا ناز بیت یافتہ آبادی کو راہ روی کی تعلیم دیتا ہے۔ ایک رستوران ہے۔ ایک اوسط درجے کا رستوران جس میں اوسط درجے کے لوگ ہی آتے ہیں لیکن یہ بات بھی نہیں کبھی کبھی فوج کے افسران اعلیٰ بھی سروں پر اپنی عیالہ کج کئے ہوئے اس میں داخل ہوتے ہیں۔ ان کے داخلے پر رستوران کا مالک اپنی مخصوص نشست پر سے اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں چمک آ جاتی ہے۔ شاید یہ چمک اس مسرت کا مظہر ہوتی ہے جو کسی غریب کی بھونپری میں کسی ٹھولے بھٹکے اور ساتھیوں سے بچھڑے ہوئے راجہ کی آمد پر پھیل جاتی ہے۔

اس رستوران کی فضا کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ یہ رستوران ایک کافی بڑے کمر پر مشتمل ہے۔ اس کے ایک حصے میں کچن ہے۔ دوسرے حصے میں ٹاٹ کے پوچوں سے بنائے ہوئے مختلف کمرے ہیں۔ ہوٹل کا مالک ایک بوڑھا ہے۔ باقونی اور تند مزاج۔ آپ کوئی بات کرنا اُس کے پاس اس بات کیلئے ایک کہانی موجود ہوگی اور آپ کی مرضی کے خلاف وہ داستان سنانے کے لئے ہر وقت تیار نظر آئے گا۔ اس بوڑھے کی باتوں سے بعض اوقات الجھن بھی ہوتی ہے لیکن چونکہ بیٹھنے کے لئے اور کوئی موزوں مقام احباب کو جنگ کی وجہ سے میسر نہیں آتا۔ اسے اس بوڑھے کے ناز و نخر سے سہنا ہی پڑتے ہیں۔ ہوٹل کے بوڑھے مالک کا بیٹا بھی صبح سے شام

گرمی پڑیٹھا ہوا نہایت سستی قسم کے ناول پڑھتا رہتا ہے۔ وہ احباب کی گفتگو میں بہت کم مداخلت کرتا ہے۔ ہوٹل کا باورچی ایک پالتو کتے کی طرح وفادار ہے۔ جسے بلیئر، مرغ اور گوشت بھوننے کے سوا کسی اور چیز میں کوئی دلچسپی نہیں۔ نسل آدم کیونکہ طبقات میں بانٹ دی گئی ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ باورچی پچھلے طبقے کا فرد ہے۔

رستوران میں ہمیشہ تفریحی اور کاروباری باتیں ہوا کرتی ہیں۔ کوئی اپنے دوست کو چائے پلانے یا کھانا کھلانے لانا ہے۔ اگر اتفاق سے رستوران میں آنے والے پروسی ہیں تو کھانے کو بد مزہ پاکر یہ گلہ کرتے ہیں کہ بازار کا کھانا کسی حال میں نہیں کھانا چاہئے۔ گھر کی وال روٹی کا مقابلہ یہ رستوران اور ہوٹل کہاں کر سکتے ہیں اور ان کی گفتگو کا بیشتر حصہ کھانے کی لذت اور بدزنگی تک محدود رہتا ہے۔ دوستوں کی شکایت، محبت کی ناکامی، کسی پڑوسے ڈالنے کی نچاوڑ، کاروبار میں نقصان اور فائدے کے تذکرے، طنز و مزاح، فوجی زندگی کے عجیب و محاسن، پڑوسیوں کی بُرائی یعنی یہ رستوران عام اور مانوس گفتگو کا مرکز ہوا کرتے ہیں۔

رستوران اور ہوٹلوں میں خاص گفتگو بھی ہوا کرتی ہے۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ یہی اوسط درجے کا رستوران جو ہوٹل بھی ہے۔ سال بھر ایک نہایت اہم گفتگو کا مرکز بنا رہا۔ یہاں بیٹھ کر زندگی کے مسائل طے کئے گئے۔ یہاں نہایت کارآمد باتیں ہوتی رہیں۔ انسانی زندگی کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا گیا۔ انسانی زندگی کو بہتر اور منظم بنانے پر بحث ہوتی رہی۔ اس لئے اس رستوران کو نظر انداز کر دینا قطعاً بے انصافی تھی۔ لہذا آغاز ہی میں اس کا ذکر ضروری سمجھا گیا۔

یہ پُر مغز سلسلہ مضامین کیونکر چھڑا — سنئے۔

ایک دن میں اسی رستوران فردوس میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں ہوٹل کے مالک کی پُر لطف مگر قہم سے لمبہ زبانی استہان سن چکا تھا۔ اتنے میں مائیکل اور انصر ہوٹل میں داخل ہوئے۔ انصر کچھ اُداس اُداس سا نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کی اُداسی سے اندازہ لگایا تھا کہ آج وہ اپنی بیوی سے جھگڑ کر آیا تھا۔ اس لئے میں نے اُس کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا اور خاموش رہا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ خود ہی بات چھڑے۔ اطمینان سے بیٹھ جانے کے بعد اُس نے کہا: ”مجھ سا بھی

کوئی معلوم ہوگا اس زمانے میں۔ میری بیوی کے نزدیک مقصدِ حیات یہی ہے کہ بیشمار دولت ہو اور میں کو لھو کا بیل بنا رہوں۔

میں نے اسے چراغِ پا کرنے کے لئے سوال کیا تھا۔ لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ میرا دورِ تہذیب اٹھا ہے اور یہ سوال سنتے ہی وہ مجھ پر برس پڑے گا۔ لیکن میں آج خوش ہوں کہ میرا وہ سوال ایک نہایت نرا معلوماتِ مضمون کی شکل اختیار کر گیا۔ پہلے تو مجھے وہ برا فرود خنہ لہجے میں میسج سوال کا جواب دیتا رہا۔ لیکن بعد میں ہماری گفتگو متانت کا رنگ اختیار کر گئی۔

”زندگی کا مقصد کیا ہے؟“ میں نے پوچھا

مائیکل۔ ”یہ تو آپ جانتے ہیں کہ نظامِ کائنات اور فطرتِ آدم میں ایک ٹھٹ بڑا بنیادی فرق ہے۔ سوائے انسان کے قدرت کی ہر چیز جاندار یا غیر جاندار کسی ایک اصول پر کاربند ہے۔ ایک ذرہ بھی قانونِ قدرت سے منحرف نہیں ہو سکتا۔ جو بریم اسی اصول کی تشریح ہے جو پریم دھات کے ایک ذرے کو توڑنے سے وجود میں آیا۔ ذرہ ٹوٹا اور قیامت آگئی۔ یہی فرق انسان کو صرف اشرف المخلوقات کہلانے کا مستحق قرار دیتا ہے۔ کیونکہ وہ آزاد ہے۔ اس کا عمل اس کی اپنی مرضی پر موقوف ہے۔ لیکن درحقیقت یہی آزادی اس کے تمام مصائب کی بھی ذمہ دار ہے۔ کائنات کا ہر ذرہ ایک فرض انجام دیتا ہے اور وہ ہے انسانی خدمت۔ اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کے ذمے کیا کیا فرض ہیں۔ اسطو کا قول ہے ”جب ایک مروجی یا ایک بڑھئی اپنا اپنا فرض انجام دیتا ہے تو کیا بحیثیت مجموعی انسان کے ذمے کوئی فرض نہیں ہے؟“ اس سوال کے جواب کی طلب کا نام علم الانسان ہے۔ اس سوال کے حل کے لئے فطرتِ آدم کا مطالعہ ضروری ہے۔ علم نفسیات کی زد سے انسان مہیروانوں کی طرح کسی فوری جذبہ کے ماتحت حرکت کرتا ہے اور نہ اس کا فعل فقط ادراک پر موقوف ہے انسان کی زندگی کی ہاگ ڈور اس کی مرضی کے ہاتھ میں ہے جس میں جذبات و ادراک دونوں کو دخل ہے۔ انسانی حرکات کی دو صورتیں ہیں شعوری اور غیر شعوری۔ غیر شعوری حرکات کی اقسام سب ذیل ہیں مثلاً دل کا دھڑکنا۔ آنکھوں کا جھپکنا۔ بچوں کا روننا۔ ہاتھ پاؤں مارنا۔ آگ کو بھوتے ہی ہاتھ کا پیچھے ہٹا لینا وغیرہ۔ ان تمام حرکات میں شعور یا مرضی کو کوئی دخل نہیں ہوتا

حکات خود بخود سرزد ہوتی رہتی ہیں لیکن شعوری حکمت سوچ سمجھ کر کی جاتی ہیں مثلاً آپ کو غصہ آتا ہے یہ قدرتی فعل ہے لیکن قصور وار نہ کر کو کالی دینا یا مارنا یا معاف کر دینا آپ کے اختیار میں ہے۔ انسان ہمارے جیوں میں یہی فرق ہے جیوان کو تنگ کر دے تو وہ مقابلہ کرے گا مگر انسان کیا کرے گا۔ یہ کوئی وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ یہ اس کے اخلاق پر منحصر ہوگا۔

یہ قدرتی جذبہ کیا چھپے گا؟ میں نے کہا۔

گنگو ڈی دلچپ ہوتی جا رہی تھی۔ ہنر کا مالک بولا۔ ”جائے میں بس اب کوئی کسر نہیں۔ ذرا اسے دودھ پینے کے لئے گیا ہوا ہے۔“

مائیکل۔ جذبہ ایک قدرتی فعل ہے جو مخصوص حالات میں اور مخصوص انداز میں رونما ہوتا ہے۔ بلی کی کرک یا کسی اور قسم کی ڈراؤنی چیغ سن کر انسان وہیں کا وہیں رہ جاتا ہے۔ اس کی کھٹا رہے۔ علمی اصطلاح میں اس فعل کو سہم جانا یا دم بخود ہو جانا یا دیکنا کہتے ہیں۔ یہ مخصوص فعل قصد کے پیش نظر وجود میں آتا ہے۔ یعنی بھاگنے کی تیاری۔ بلی یا شیر حملہ کرنے یا بھاگنے سے بچنے کے لیے یا اثر اپنے ناخنوں کو پنچوں کو اندر کر لینا ہے۔ جسم کے بال کھڑے ہو جاتے نفس تیز ہو جاتا ہے۔ یہ انداز بھاگنے یا حملہ کرنے کا پیش خمیہ ہے اور یہی اثرات انسان ماری ہوتے ہیں۔ اسی طرح خود سے مختلف جذبات ہیں۔ ان کی ایک فہرست میں اپنے وقت رکھتا ہوں۔ یہ نقشہ نفسیاتی تحقیق میں بڑا کام دیتا ہے۔ میں اس کی مدد سے انسانی کچے پچیدہ مسائل حل کیا کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے ایک نقشہ میز پر پھیلادیا۔ جسے میں تل کرتا ہوں۔ اتنے میں چائے بھی میز پر آگئی۔ واقعی یہ نقشہ تمام انسانی جذبات خواہ چھوٹے روایات کا آئینہ تھا۔ چائے میں کوئی لطف نہ تھا۔

انسان کی فطری ضروریات

احساسات	خواہش یا ضرورت	قدرتی جذبہ
ٹھوک۔ سرسوی۔ نیند۔ بھڑکائی۔	جسمانی آسائش	(۱) عام جذبات مثلاً کھانا پینا
دلچسپی		کھیلنا۔ چھوڑنا۔ آرام چاہنا وغیرہ

نہ مود اور رحمت کی نفسیات۔ مینڈر کا ایک نقشہ

۲۔ دم بخود ہونا	جان کی حفاظت	ڈر۔ خوف۔ دہشت
۳۔ بھگان	جان بچانا	سراہنگی۔ ہراس
۴۔ گرگڑانا۔ عاجز ہونا۔ خوشامد کرنا۔	جس چیز سے خوف آتا ہو۔ اس کو اپنانے کی خواہش۔ مثلاً حاکم و یا آگ و غیرہ جس کی خوشنودی پر زندگی اور مددی کا انحصار ہو	عاجزی۔ ذلت۔ خوشامد کرنے میں مسرت۔
۵۔ ظاہر داری۔ بناوٹ۔ بننا۔ تننا۔ اکڑنا وغیرہ	اپنے ہمجنسوں کی نظر میں۔ (۱) اہمیت حاصل کرنا (۲) عزت (۳) شہرت	خود داری۔ غرور۔ احساس برتری یا کسری
۶۔ طمان یا حملہ کرنا	(۱) نقصان پہنچانا (۲) فتح یا مغلوب کرنا (۳) برتری کی خواہش۔	(۱) غصہ۔ حسد۔ دشمنی۔ نفرت۔ (۲) کسی چیز کو بس میں لاکر تسکین قلب حاصل کرنا۔
۷۔ عشق محبت اور جذبات شہوانی	صفت مقابل کی نظروں میں چلنا اپنی طرف مائل کرنا۔ خواہش و صل وغیرہ	جنسی کشش۔ وصل و فراق کی بے چینی۔ مایوسی اور اُوسی۔ لذت وصال۔
۸۔ مشقت مہربانی اور مہمدی	اپنے سے کمزور کی مدد کرنا مثلاً بیوی بچوں کی پرورش۔ دوسرے کمزور انسانوں کی مدد	ہمدردی۔ سخاوت
۹۔ الفت۔ دوستی	اپنے ہمجنسوں کی صحبت	اجنبیت۔ اکیلا پن۔ اُوسی
۱۰۔ نقل یا تقلید	اپنے ہمجنسوں جیسا بننا۔ رشک منظم ہونا۔	تقریف۔ توصیف۔ تقدردانی مزاح۔ مذاق
۱۱۔ تعاقب کرنا۔	اپنے بس میں لانا	شکار کی جستجو کا تلف اور

تسکین قلب - کامیابی	دریافت کرنا - خود بخود یا	۱۲ - تلاش، جستجو اور تحقیق
تسکین قلب - ذہنی مسرت	مشاہدہ کرنا - نئی معلومات حاصل	
کامیابی -	کرنا - ایجاد کرنا	
حب الوطنی - پاسداری - وضع	اپنے وطن کو واپس ہونے کی خواہش - اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے ملنے کی خواہش -	۱۳ - تعلق رکھنا - وفاداری

”واقعی اس نقشے میں تمام انسانی خواہشات اور ضروریات آگئیں“ میں نے کہا۔

مائیکل :- آپ نے دیکھ لیا کہ انسانی ضروریات کیا ہیں۔ انہی ضروریات کی تکمیل پر انسانی زندگی کی مسرتوں کا دارو مدار ہے۔ یہی ضروریات انسان کے ہر فعل کی محرک ہیں۔ یہ امر کسی سے مخفی نہیں۔ اب اس سے ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ انسان وحشی ہو یا مہذب خواہشات نفسانی اور فطری ضروریات میں کوئی تغیر و تبدل نہ اب تک آیا ہے نہ آئے گا۔ سرشت آدم نہ کبھی بدلی ہے نہ بدلے گی۔ مختلف زمانوں میں فرق یہی ہوتا ہے کہ ان خواہشوں اور ضرورتوں کی تکمیل کے طریقے بدلتے رہتے ہیں۔ وحشی انسان اور جانور انہی ضروریات کو فطری جذبات سے مغلوب ہو کر بغیر کسی تصنع یا بناوٹ کے پورا کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ لیکن مہذب انسان دوسرے ذرائع اختیار کرتا ہے۔ مثلاً ایک مہذب انسان دوسرے مہذب انسان سے نفرت کرتا ہے تو غصے میں آکر اس پر حملہ کرنے کی بجائے جو ایک بالکل فطری فعل ہے۔ وہ غصہ کو دبا لیتا ہے اور اپنے دشمن کو کسی اور طریق سے نقصان پہنچانے کی تدبیر کرتا ہے جو مار پیٹ سے زیادہ مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔ اسی طرح بہتری حاصل کرنے کے لئے وہ بناوٹ کا مظاہرہ کرنے کی بجائے کونسل کی رکنیت حاصل کرنے یا ایورسٹ کی چوٹی کو..... تیسرے کرنے میں تسکین ڈھونڈتا ہے! اس سے پہلا نتیجہ یہ

یہ برآمد ہوتا ہے کہ ہر ایک ذی شعور انسان کا اخلاق دوسرے انسان سے اس لئے مختلف ہے کہ اس نے اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے جدا گانہ ذرائع اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ تمام جذبات و خواہشات ہم سب میں موجود ہیں مگر ان کی شدت احساس میں فرق ہے۔ کسی میں غرور و تکبر زیادہ ہے تو کسی میں خست اور ہمدردی۔ دوسرا نتیجہ یہ اخذ ہوتا ہے کہ کوئی فطری جذبہ یا نفسانی اقتضا بذات خود اچھا یا بُرا نہیں۔ لیکن تسکین خواہش کا ذریعہ اچھا یا بُرا ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر عشقیہ یا شہوانی جذبات کی تسکین ایک فطری اقتضا ہے۔ یہ مختلف طریقوں سے ادا ہو سکتا ہے۔ مثلاً بالجبر سے۔ کسی کو زور کا لالچ دے کر یا خرید کر یا جائز طور پر نکاح کر کے یا داشتہ بنا کر۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کونسا طریقہ اچھا اور انسان کے شایانِ شان ہے؟ — اس مضمون پر آئندہ بحث کریں گے! آج کی شام فلم دیکھا جائے۔“

اجاب چلنے کے لئے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

دوسرا باب

زندگی کے مسائل کو حل کرنے کا طریق اخلاقیات فلسفہ توہم اور دینیات

آج ایک عزیز دوست کی آمد کے سلسلے میں میں اور مائیکل دوپہر کو ہی رستوران میں بیٹھے ہیں۔
 نے گفتگو کا آغاز کیا: اچھا تو مائیکل صاحب! یہ بتائیے کہ انسان کی فطری ضروریات کی تکمیل
 کس طریق سے کی جائے؟ یہ کس طرح معلوم کیا جائے کہ زندگی کا سیدھا سچا اور بہترین راستہ
 کون سا ہے۔؟

مائیکل: کل کی گفتگو میں اس بات کی وضاحت ہو گئی تھی کہ انسانی اعضا کو حرکت میں لانے والی
 طاقت اس کی فطری ضروریات میں۔ ان ضروریات کے علاوہ انسان کے گرد و پیش میں رہا جانے والا اور
 غیر جاندار اشیاء میں جن کا اس کی زندگی سے تعلق ہے۔ انسان کا ان کے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہئے۔
 ان تمام معاملات میں اس کو فہم و ہدایت سے کام لینا پڑے گا۔ اس کا مشاہدہ اور تجربہ اس کی رہنمائی
 کریں گے اور اس طرح وہ ایک راستہ قائم کر لے گا۔ اسی رائے پر وہ ایک رویہ یا طرز زندگی کو اختیار
 کرے گا۔ مثال کے طور پر ایک بچہ آگ کو کھلونا سمجھ کر پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک جاہل آتش پرست
 آگ کو خدا سمجھ کر اس کی پرستش کرتا ہے۔ ایک سائنس دان آگ کو علمی طور پر تحقیق کر کے یہ معلوم کرتا
 ہے کہ آگ ایک کیمیائی فعل ہے اور اس سے بہت کلم لے جاسکتے ہیں۔ عائد ایک اور جاہل اونچے سے بڑے سے
 بالکل مختلف ہوگا۔ کیونکہ جاہل کی رائے کسی علمی ثبوت پر مبنی نہیں ہے اور بچہ کی رائے تجربہ کی بنا پر رد
 ہو جاتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی شخص جب تک ان اہم امور پر مثلاً زندگی کا مقصد کیا
 ہے؟ زندگی کا بہترین راستہ کون سا ہے؟ اس دنیا کا کوئی نالقی ہے یا نہیں؟ موت کے بعد بھی

کوئی زندگی سہیا نہیں ہے کے متعلق ایک واضح رائے قائم نہ کرے۔ وہ اپنے لئے کوئی منزل تجویز کر سکتا ہے اور نہ کوئی راستہ۔ اور جس کی کوئی منزل نہ ہو وہ سوائے بھٹکنے کے اور کیا کر سکتا ہے۔ یہ نہ سمجھتے کہ ان سوالات کا آپ کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے یا صرف سائنس دانوں، فلسفیوں اور مذہبی رہنماؤں کے مشاغل ہیں۔ نہیں بلکہ ہماری تمام زندگی کا دارومدار ان سوالوں کے جواب پر ہے۔ فرض کیجئے۔ دو اشخاص اپنے وطن سے روانہ ہوتے ہیں۔ ایک کی منزل مقصود بمبئی ہے اور دوسرے کی لندن۔ ان دونوں کی سفری تیاری میں جو فرق ہوگا وہ صاف ظاہر ہے بمبئی پہنچ کر ایک کا سفر ختم ہو جائے گا اور ساتھ ہی اس کی مصورت بھی۔ لیکن لندن جانے والے کو بمبئی پہنچ کر بھی اگلے سفر کے لئے مزید تیاری اور تردد کرنا پڑے گا۔ اس کے نزدیک حقیقی سفر پھر شروع ہوگا۔ بمبئی تک کا سفر اس کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھے گا۔ یہی مثال بالکل ہم پر بھی صادق آتی ہے۔ فرض کیجئے۔ آپ کی رائے میں حیات بعد الموت کوئی حقیقت نہیں یعنی آپ سفر زندگی بس موت کے گھاٹ تک محدود ہے۔ دوسرا شخص یہ رائے رکھتا ہے کہ اس گھاٹ سے گزرنے کے بعد اسے ایک دوسری دنیا میں جانا ہے جہاں پہنچ کر اپنے خدا کے سامنے اپنے اعمال کا جواب دہ ہونا ہے۔ غور کیجئے، آپ کے اور اس شخص کے رویے میں کتنا فرق ہوگا۔ اس لئے سعید بھائی ان سوالات کا حل بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

مائیکل واقعی سچ کہہ رہا تھا۔ مگر ان سوالات کا حل بھی تو بتاؤ۔ میں نے کہا مائیکل۔ بس اسی نقطہ پر پہنچ کر زندگی کی سب سے بڑی الجھن پیش آتی ہے یعنی ان تمام سوالات کا حل کہاں سے حاصل کیا جائے۔ مشکل تو یہی ہے کہ نہ تو ان سوالات کا حل آسمان پر لکھا ہوا مل سکتا ہے کہ اسے پڑھ کر ہو کوئی اس پر عمل پیرا ہو اور نہ کوئی ایسا فورم ہے جس سے انسان فطرتاً آگاہ ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ جو بات بشیار ہیں جتنے منہ اتنی باتیں۔ کس کا کہا مانا جائے۔ اسی لئے میں استدلالی، منطقی اور علمی حقیقت سے کام لیتے ہوئے کسی واضح اور جامع نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔

تو آپ نے اس کا کیا حل ڈھونڈ لیا ہے۔ میں نے سوال کیا۔

مائیکلؔ میں بندرتج آپ کو اس حل تک پہنچا دوں گا۔ اتنی جلدی نہ کیجئے۔ اب تک دنیا میں ان مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے تین طریقے اختیار کئے جا چکے ہیں اور یہی امکانی ذرائع بھی ہیں۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ مشاہدات، تجربات اور علمی تحقیق سے کام لیتے ہوئے ان مسائل کے متعلق کوئی نظریہ قائم کیا جائے۔ اس طریق کار میں مفروضات کا کوئی دخل نہ ہو اور سوائے ٹھوس حقیقت کے کوئی بات قیاس نہ کی جائے یہ ہے نظریہ تحقیق۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ فہم و ادراک، قیاسات، دہم و گمان اور دلائل کی اعانت سے کسی نتیجہ تک پہنچا جائے۔ یہ ہے فلسفیانہ نظریہ۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ کچھ مختلف مذاہب کے بانیان مثلاً پیغمبرؐ، نبیؐ، اوتارؐ، رشیؐ، منی وغیرہ بتا چکے ہیں۔ ان پر یقین کر لیا جائے اور اس طرح تمام سر دروی سے نجات پا کر ایک راستہ اختیار کر لیا جائے۔ یہ ہے دینیاتی نظریہ مگر انسان اپنی فطرت سے مجبور ہے۔ تلاش، تجسس اور تحقیق اس کے فطری تقاضے ہیں۔ لہذا یہ تحقیق کرنا ہی ہوگی جب تک انسان نے شعور سے کام لینا شروع کیا ہے۔ دو نظریے ایک دوسرے کے مد مقابل رہے ہیں۔ ایک گروہ اس خیال کا حامی رہا ہے کہ انسان کی فطرت قطعاً جذباتی ہے۔ اس لئے اس کا مقصد حیات خواہشات نفسانی کی بیداری، تسکین یعنی تعیش اور لہو و لعب ہونا چاہئے! مخالف گروہ یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات کہلاتا ہے کہ وہ شعور یا فہم و ادراک کا مالک ہے۔ اس لئے اس کی زندگی بالکل غیر حذبذباتی ہونی چاہئے۔“.....

مائیکل یہاں تک کہنے پایا تھا کہ شام لال جس کا انتظار تھا آپہنچا۔ شام لال ہم دونوں کا باہمی دوست ہے۔ عجب شخصیت کا مالک ہے۔ اتنے ہی بولا۔ مائیکل تمہاری یہ حیرت زبانی کب ختم ہوگی۔ کوئی کام کی بات نہ کرو۔ میں اتنی دور سے تم لوگوں کی خاطر یہاں آیا ہوں اور آج کی رات آخری ہے۔ موسم بھی خوشگوار ہے۔ ایک الوداعی مجلس ہو جائے۔ تھوڑی دیر میں وہ زاہد ہنسناک انصر بھی آجائیگا۔ آج اس کو بھی لے چلو۔“

مائیکلؔ شام بیٹھو تو سہی، ابھی چلتے ہیں۔ پارٹی کا سب سامان تو تیار کر لیا۔ تمہیں معلوم ہی ہے کہ ہونٹوں میں کیسا کھانا ملتا ہے۔ اپنا کچا کر لے چلو۔ کچھ ٹھنڈا ہوا گوشت بچل کے ڈبے

پنیر اور مٹاڑ۔ بھئی اچھی غذا نہ کھاؤ گے تو جیو گے کیسے۔ جب تک ہم باتیں کریں گے۔ تم بالکل ٹھیک وقت پر پہنچے ہو۔ پہلے اس سوال کا جواب دو۔ تمہاری رلے میں زندگی کا مقصد کیا ہے؟

شام لال: میں تو اتنا جانتا ہوں اور زیادہ جاننے کی کبھی کوشش نہیں کی کہ جب مال ہی ایک حقیقت ہے۔ مستقبل کی نہ کسی کو خبر ہوئی ہے نہ ہوگی۔ پھر حال کی مسرتوں کو ٹھکرا کر عاقبت کے سہانے خوابوں میں زندگی بسر کرنا کہاں کی دانائی ہے۔ آئندہ کی فکر کرنا زندگی کا لطف کھونا ہے۔ زندگی کا مقصد ہے۔ مسرت چاہے وہ ایک لمحہ کیلئے ہی کیوں نہ ہو۔ وہی زندگی مسرت آگلیں ہے جس میں شعور کو کوئی دخل نہ ہو اور فطری خواہشات جذباتی طور پر تسکین پائیں۔

مانا جنت کی فضا ہے محسوس	اب تو ہم ہیں اور ہے یہ روزگار
وعدہ فردا ہے کتنا خوش فریب	نہ کی نہیں اور خوریں بے شمار
یہ جہاں فردوس سے کچھ کم نہیں	ہر طرف ملتے ہیں نخل میوہ دار
ہر طرف فردوس کی رنگینیاں	گل بدن ساقی سرود آبتار
ساری دنیا جب فنا انجام ہے	کل کے آنے کا کرے کون انتظار
سود کے لالچ میں بے دود نقد مال	یہ تجارت کیوں کروں میں اختیار
”زندگی زندہ دلی کا نام ہے“	دل کی دنیا میں ہے کیوں انتشار
خود کو گردے عشق کے زیر نگین	عقل کو تجھ پر نہ ہو کچھ اختیار

زندگانی ختم ہوتی ہے یہیں

موت ہے اور اس کے آگے کچھ نہیں

بس میرا تو سیدھا سادہ یہی فلسفہ ہے۔ میں تو عمر خیم کا پیروکار ہوں۔ مغربی فلسفی ہو لیس بھی یہی راگ الاپتا ہے۔ گلشن میں بہار سدا نہیں رہتی۔ چاند کو کبھی کبھی کمال ہے اور کبھی زوال۔ حیات بے لکھ اور دنیا کی ابتدا اور انتہا پر غور کرنا کمزور انسانی ذہن کو خواہ مخواہ پریشان کرنا ہے۔ کثرت علم رنج کا موجب ہے اس لئے جہاں تک ہو سکے مسرت کی تلاش کرو۔ خوب کھاؤ پیو اور خوش رہو۔ یہی حقیقت ہے جو خدا کی عنایت کردہ چند روزہ زندگی میں کام آسکتی ہے۔

مابیکل ” مگر شام صاحب مشرق ہو یا مغرب۔ مسرت کا طالب جب بھی سنجیدہ ہوتا ہے تو اس کا ضمیر بکرا اٹھتا ہے کہ عارضی مسرت انسان کے شایان شان نہیں۔ انسان اس طرف المخلوقات اسی لئے کہلاتا ہے کہ اپنے ماضی حال اور مستقبل پر غور کر سکتا ہے۔ ہوا کی وساطت سے وہ اپنی تمام زندگی قیصر کر سکتا ہے۔ ایک کامیاب چنبا کی زندگی کے لئے بھی عقل و دانش کی رہنمائی ضروری ہے۔ اس لئے اس نظریے کے حامی بھی اپنے اس فلسفہ کو عملی جامہ نہ پہنا سکے اور ان کو تسلیم کرنا پڑا کہ خرد کے بغیر مسرت دوام کا حصول غیر ممکن ہے۔ شاعر کہتا ہے۔

چند لمحوں کے جو سکھ پر ہو مشار دہریں اکثر ہوا کرتا ہے خوار
عقل سے ہے ذقیت انسان کو اس کو ہر ذی روح پر ہے اختیار
یہ نفس اک سانپ ہے پھنکارتا عقل ہی کر سکتی ہے اس کو شکار
ہے خرد سے حق و باطل کی تمیز بھول چن لو چھوڑ دو خاک و خار
دل تو خود ہے خواہشوں کا اک غلام
حکمرانی سے نہیں کچھ دل کو کام

اس طرح ایک استدلال پسند گروہ وجود میں آیا جن کی نظر میں عقل و دانش بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ زندگی کا مقصد عشرت نہیں بلکہ دوامی مسرت اور ابدی راحت ہے۔ اسی مسئلہ پر زیادہ غور و فکر نے اسی گروہ کو قنوطیت پسند بنا دیا جب مسرت کے معنی یہ ہیں کہ رنج و غم انسانی زندگی سے مفقود ہوں تو پھر ہر جذبہ و خواہش کی تسکین کے لئے تگ و دو کرنا بیکار ہے جب خواہش ہی نہ ہو تو تسکین کا سوال ہی پیدا نہ ہو گا۔ کیوں نہ ہر ضرورت سے انسان بے نیاز ہو جائے کیونکہ سب سے زیادہ امیر وہ نہیں جس کے پاس سب سے زیادہ مال و دولت ہے بلکہ وہ انسان ہے جس کی ضروریات برائے نام ہیں۔

رستوران کا مالک بول اٹھا ” میرا بھی یہی خیال ہے۔ چند اشعار اس کے متعلق سنئے۔
دل تو رہتا ہے ہمیشہ بے قرار دل ہے اک اور آرزو میں بے شمار
ایسے نادان کو بھلا بھلائے کون ہر جس شے سے اُسے ہوتا ہے پیارا

حُسن سے وابستگی ہوتی نہیں حُسن ہر اک شے میں ہے ناپائدار
 کس طرح ممکن ہے پھر دائم مکوں جب اساسِ دل نہیں ہے استوار
 اس جہاں میں تو بھی مثلِ سرورِ غم خزاں کا کچھ نہ کچھ رنج بہار
 دل کو اپنے افسوسِ قابو میں کر

یاس و حراں بھی ہو تجھ پر بے اثر

اسی دوران میں زائدِ شکِ انصر صاحب بھی آپہنچے تھے۔ فرمانے لگے:-

انصر:- ان خیالات سے غافل رہے کہ مقصدِ بیشکائیں جذبات ہے مگر ذریعہ جذباتی
 نہیں بلکہ شعوری ہے۔ دانشمندی اور ابدی مسرت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں عقل مند انسان کی
 زندگی جذبات سے بالکل عاری ہونی چاہئے۔ اپنی خواہشاتِ نفسانی پر کامل عبور ہو تاکہ کوئی جذبہ
 سرکشی نہ کرنے پائے عقل ایسی دھال کا کام دے جس پر محسوس دہوا اور حوادث کے تیرے آ
 ہو کہ رہ جائیں۔

عقل سے ہی آدمی کا ہے وقار یہ فلک بھی جس کی ہے اک رنگدار
 عقل کو جذبات سے کیا واسطہ دل ہو تابع اور خسرو ہو تاجدار
 فطرتی جذبے سے حاصلِ نجات راہبانہ زندگی تو پھر گزدار
 مددِ حق کو دار بھی مسراج ہے جاوداں ہے جیسے گردوں وقار
 شامِ لال:- لیکن انصر صاحب یہ پسند و نسیحت زندگی کی دلکشیوں کے سامنے ماند
 پڑ جاتی ہے۔ ایسی نفس کشی نے تو اس خیال کے حامیوں کو دنیا سے کنارہ کرنے کا سبق سکھایا
 مگر میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ

بزدلی ہے یہ نہیں مردانگی

چھوڑ کر دنیا سینھ لے ایک غار

انصر:- آپ نہ مانیں مگر حکیمِ اسطوار افلاطون حبیبی حلیل القندہ سیتیوں کے نزدیک بھی وہی
 زندگی افضل اور برتر تھی جس میں جذبات کو دخل نہیں تھا۔

شام ۲۔ میں بھی جانتا ہوں۔ وہ دنیا کو ایک شہر تصور کرتے تھے جس میں سب انسانوں کو برابر کے شہری حقوق حاصل تھے مگر اس دنیا میں انکو اپنے سنہرے خوابوں کی کوئی تعبیر نہ مل سکی۔
مائیکل ۲۔ عیسائیت میں بھی یہی نظریہ کا فرما ہے۔ یعنی انسان کی جسمانی موت میں ہی اس کی روحانی زندگی کا ماز مضمحل ہے۔ ایک سچا عیسائی حضرت عیسیٰ کا پیروکار ہونا چاہئے یعنی نفس کشی اور ریاضت کا مجسمہ۔ انجیل میں یہی لکھا ہے کہ جو شخص اپنی جان کو بچاتا ہے وہ عاقبت کی زندگی کھوتا ہے اور جو اس زندگی کو قربان کرتا ہے۔ دوبارہ زندگی پاتا ہے۔ عیسائیت نے بھی انسانوں کو رہبانیت کا درس دیا۔ عیسائیت کو دنیاوی زندگی سے بہت کم واسطہ ہے۔ یہ زندگی ایک یا تراس ہے اور اعلیٰ دہتر زندگی اس وقت شروع ہوتی ہے جب روح جسم سے جدا ہوتی ہے۔ مگر علمی حقیقت سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ تمام انتہائی اور متضاد تجسوساتی نظریے اور شعوری نظریے خام ہیں۔ کیونکہ انسانی فطرت کے دونوں پہلو اپنی اپنی جگہ پر بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

عقل ہے دل کیلئے اک حضور راہ عقل ہے دل کے بغیر اک خانقاہ
 چولی دامن کا سا ہے دونوں کا ساتھ حسن ہے گر عقل تو دل ہے شباب
 انصر ۲۔ مائیکل صاحب اس کا قویہ مطلب ہوا کہ آپ عیسائی ہوتے ہوئے بھی عیسائیت کے عقیدوں کو قبول نہیں کرتے۔

مائیکل ۲۔ دنیا میں یہ مذہب رسم اب تک جاری ہے کہ انسان جس خاندان میں پیدا ہو۔ اس کے مذہب کو اپنا بھی مذہب قرار دے۔ آپ اس لئے مسلمان کہلاتے ہیں۔ کیونکہ مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں۔ سوسائٹی کے قانون ایسے ہی ہیں کہ کوئی بھی سرکشی کرنے کی مجال نہیں رکھتا۔ انسانیت کو غلامی میں جکڑنے والی یہ کڑی زنجیریں توڑ کے رکھ دینی چاہئیں۔ مذہب دل سے ہوتا ہے۔ ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ تمام مذاہب کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنے لئے ایک مذہب یا زندگی کیلئے ایک راستہ چن لے۔ اس لئے میں ان تمام راستوں کو زیر بحث لا رہا ہوں۔ تاکہ آپ بھی کسی واضح اور روشن نتیجہ تک پہنچ جائیں۔ امید ہے کہ روزانہ ملاقات ہوتی رہے گی اور یہ سلسلہ تحقیق جاری رہے گا۔ میرا جو

نظریہ ہے۔ وہ آپ پر دامن ہو جائے گا۔ اس وقت ہم پہلے طریقے سے کسی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

اتنے میں رسیٹوران کے مالک نے آواز دی کہ کھانے کا سب سامان تیار ہو چکا ہے۔ جھٹ شام اٹھ کھڑا ہوا اور بولا: "مائیکل صاحب، باقی آج رات کی محفل میں۔ اب چلنے کی کیجئے۔"

ہم چاروں فردوس کا تصور لیتے ہوئے چل دیئے۔ سورش ساتی اور دہکتی بہاریں ہمارے
اظہار میں تھیں۔

تیسرا باب

نظریہ خودی تکمیل خودی کی تعریفِ انفرادیت

اور شخصیت میں فرق۔ انفرادی زندگی کا قانون

انصر نا بد تھا اور شامِ عمر ختام — زامہ کو تو بہ توڑنا ہی پڑی کیونکہ حدود کا اصرار نہ ہو سکن ہوا کرتا ہے۔ انصر عجب مختصہ میں گرفتار تھا کہ اتنے میں مائیکل بولاء انصر صاحب ! آپ کے عقیدہ کمپلٹ آپ دُنیا میں اس لئے گئے ہیں تاکہ اگلے جہان یعنی جنت کی تیاری کر سکیں تو پھر جب یہاں پناؤ نازنینوں سے ملنا نہ سیکھو گے تو جنت میں جا کر شراب کی نہروں اور حوروں سے کیا لطف اٹھا سکو گے شاید وہاں بھی جا کر شامِ سب سے دستِ لینا پڑے۔ ممکن ہے وہاں شامِ صاحب اسی مضمون کے مدرسِ فکر کو دیکھتے جائیں۔ انہوں نے کبھی کسی انسان کی ولازاری نہیں کی۔ اُن کا دل سونا ہے سونا اور میرے نزدیک یہی انسانیت ہی سب سے مقدس مذہب ہے۔

انصر — تو آپ کے نزدیک یہ کوئی بڑا گنہ نہیں؟

مائیکل — گنہ کیا ہوتا ہے۔ اس پر اطمینان سے بحث کریں گے فی الحال تو شام کے

فلسفہ پر عمل پیرانی کا تجربہ کر لو اور تھوڑی دیر کے لئے اپنے فلسفہ کو جامِ رنگین میں غرق کر دو۔

آخر کار انصر کو دختِ ازمنہ سے لگانا ہی پڑی۔ بڑا منہ بنایا۔ مہمت بڑپا یا۔ مگر چپ منٹ

بعد جب کینٹ و سرور کے جھونکے چلے تو اس نے ساقی کو اپنی آغوش میں لے لیا اور ساقی سے غزل چھیڑنے کی درخواست کی۔ شام اُچھل پڑا۔ ہاں ہاں۔ ضرور گانا بونا چاہئے۔ مجھے گانا بہت پسند ہے۔
فضا میں ارتعاش پیدا ہوا اور ساقی نغمہ طراز ہوا۔

آپ جیواں کو طے سے کیا نسبت پانی پانی ہے اور شراب شراب
مجھ سے دیر گنا جب پوچھی سر جھکا کر کہا شباب شباب
رند بختے گئے قیامت میں شیخ کہتا رہا حساب حساب

نوب حسب حال غزل تھی۔ شام مائیکل کے اعزاز کے باوجود بھی جام پر جام پیتے جاتا تھا اور یہ دلیل پیش کرتا تھا کہ جب پینا ہی ٹھہری تو خوب پیو۔ ادھوری نے نوشی کس کام کی ہے۔ ہر روز پرگٹری کب نصیب ہوتی ہے۔ کیونکہ گل میں تم سے بچھڑ رہا ہوں۔

اس کے بعد وہ جھوم جھوم کر دیہاتی گیت سنانے لگا۔ اس کی بانیں۔ اس کے گیت بہت پر لطف ہوتے ہیں۔ عجب زود فطرت اور متلون مزاج انسان ہے۔ انصر بھی ترنگ میں تھا بولا۔ مائیکل صاحب، اب بتائیے گناہ کیا ہوتا ہے اور علی تحقیق کی رو سے زندگی کا مقصد کیا ہے؟ مائیکل۔ زندگی جینے کا نام ہے۔ اس لئے ہر ذی روح مخلوق انسان ہو یا حیوان، اس کا لازمی فرض ہے یا فطری تقاضا یہی ہے کہ وہ اپنی ذات کی پرورش کرے۔ اپنی جان کی حفاظت کرے اور اس کی نشوونما کے لئے کوشاں رہے یا دو نقطوں میں۔ اپنی ذات کی تکمیل کرے یعنی ذات یا خودی میں انسانی فطرت کے دو پہلو جذباتی اور شعوری اپنی اپنی جگہ تسکین اور ارتقا حاصل کریں۔ اس دنیا میں جہاں جینے کے معنی جدوجہد ہیں۔ اپنی ذات کے لئے ایک مقام اور زندگی کے لئے ایک لائحہ عمل بنانا ہی عالمگیر قانونِ حیات ہے۔ اخلاقیات کے دوسرے نظریے بھی اسی مقصد کو پیش کرتے ہیں۔ فرق اس قدر ہے کہ محسوساتی نظریے میں نفسانی ضروریات کی تکمیل پر نظر ہے اور شعوری نظریے صرف روحانی اور ادراکی تکمیل چاہتے ہیں۔ لیکن نظریہ خودی کے

پیشِ نظر دونوں پہلوؤں کی تکمیل ہے۔ انسان ہی اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ ایک علیحدہ خودی۔ ذات یا انفرادیت کا مالک ہے اور اس طرح وہ اپنے ہم جنسوں میں بھی ایک علیحدہ ہستی قائم رکھتا ہے اور یہی وہ صفت ہے جو اسے حیوانوں اور تمام جانداروں میں ممتاز کرتی ہے۔ شخصیت کی تعریف یہی یہ ہے کہ خودی کو انفرادیت سے بہت بلند درجہ حاصل ہے۔ انفرادیت تو ہر حیوان اور جاندار چیز میں موجود ہے۔ اسی لحاظ سے ہر فرد اپنی اپنی جگہ زندگی کی جدوجہد میں مصروف ہے اور اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے دوسرے افراد سے برسرِ پیکار ہے۔ انسان بھی انہی معنوں میں حیوان ان سے مختلف نہیں، جنگلی زندگی کا قانونِ زبردستی حق بجانب ہے۔ ایک فطری امر ہے اس لئے انسان کی زندگی کا بھی یہی اصول ہونا چاہئے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ اسی نقطہ پر پہنچ کر حیوان اور انسان کے دو الگ الگ راستے ہو جاتے ہیں۔ انسانی قانون اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ انسان کی زندگی کا قانونِ راستی ہی طاقت ہے میں تبدیل ہو جائے اور یہی فرقِ خلق کا پیشِ خمیہ ہے۔ انسان ایک فرد ہونے کے علاوہ ایک خودی کا بھی مالک بن جاتا ہے۔ حیوان کہتے تو فطرت کی طرف سے ایک راستہ معین ہے اور وہ اپنی زندگی میں اسی پر کامزن رہتا ہے اور اس طرح اپنی ذات کی تکمیل کر لیتا ہے۔ فطرت ہر کام انجام دیتی چلی جاتی ہے۔ اس لئے اُس کے ساتھ کوئی اخلاق منسوب نہیں کیا جاتا۔ شیر کبھی گھاس نہیں کھاتا اور گائے کبھی گوشت نہیں کھاتی۔ کیا آپ نے کبھی سنا کہ فلاں حیوان کا چال چلن بڑا خراب ہے یا وہ گناہ کرتا ہے۔ کبھی نہیں۔ حیوانی زندگی تو جذبات کی فوری تسکین کا نام ہے اور وہ فطری طریق پر انجام پاتی ہے۔ حیوان کو شعور سے مدد لینے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ بھوک لگی تو کھا لیا۔ نیند آئی تو آرام کر لیا۔ اس کے لئے نہ ماضی کوئی حقیقت رکھتا ہے اور نہ مستقبل۔ حال کی ضروریات کی تسکین ہی اس کا نصب العین ہے۔ قدرت کے بنائے ہوئے راستے سے وہ کبھی گمراہ نہیں ہوتا۔ مگر انسان میں فطری جذبات اور ضروریات تو موجود ہیں مگر فطرت نے اُس کے لئے کوئی قانون مقرر نہیں کیا۔ اس لئے اس کو اپنا راستہ آپ ڈھونڈنا پڑتا ہے یا دوسرے انسانوں کی ہدایات کے موافق عمل کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے فطرت نے انسان کو فہم و ادراک بخشتا تاکہ اس سے مدد لے سکے۔ انسان خود ہی اپنا آتما ہے

اور خود ہی اپنا غلام۔ وہ فطرتاً آزاد ہے۔ اپنی حرکات خود ہی تجویز کرتا ہے اور خود ہی اُن پر تنقید کرتا ہے اس لئے اپنی زندگی کا شمار خود ہے۔ چاہے بنائے یا بگاڑے۔ بات صرف اتنی ہے کہ آیا وہ جذبات کا ملک ہے یا غلام تکمیل خودی میں کامیابی یا ناکامیابی کا دار و مدار اسی بات پر ہے کہ وہ اپنی فطری ضروریات کس طریق سے پوری کرتا ہے۔ یہی راز خودی ہے۔

النصر۔ اس علمی نظریے سے تو یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ ہر انسان کو ایک قانون حیات کی اشد ضرورت پڑتی ہے۔ مذہب بھی تو اسی نقطہ پر اپنی ہدایات پیش کرتا ہے۔ پیغمبر، رسول یا نبی وہ بھی تو یہی کہتے ہیں کہ انسان اشرف المخلوقات اسی لئے ہے کہ اسے اپنے لئے قانون زندگی اختیار کرنے کا حق دیا گیا ہے۔ ہم کو خدا نے وہ قانون انسانوں تک پہنچانے کا فرض سونپا ہے۔ کیونکہ خدا نے ہمیں پیدا کیا ہے۔ اس لئے قانون زندگی یا بہترین طریقہ زندگی سے انسان کو آگاہ کرنا بھی خدا کا فرض ہے۔

مائیکل۔ آپ کا خیال بالکل صحیح ہے۔ میں تو صرف یہی رائے دے رہا ہوں کہ کوئی قانون زندگی اپنانے سے پہلے اسے حقیقت کی کسوٹی پر پرکھ لیا جائے کہ وہ انسانی ضروریات بھی پوری کرتا ہے یا نہیں۔ آخوند خانے فہم و ادراک کو نہ ہی بیکار تو عطا نہیں کیا۔ اگر سب کو ایک ہی لائحہ سے ہانکنا مقصود ہوتا تو انسان کو بھی حیوانی راستہ پر لگا سکتا تھا۔

اتنے میں شام ہو بہت پی گیا تھا اس کی طبیعت خواب ہونا شروع ہوئی اور وہ تے کرنے لگا محفل کا رنگ بد مزہ ہو گیا۔ بڑی مشکل سے اسے تھگہ پر سوار کر کے روانہ کیا۔ سب احباب اگلے دن کاٹنے کا وعدہ کرتے ہوئے رخصت ہوتے۔



پوٹھا باب

انفرادی زندگی

آج اتوار تھا۔ اتوار کو کبھی شیخ سویرے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ بس یہی جی چاہتا ہے۔ کہ آج دل بچہ کے سو رہا ہو۔ چھ دن کی قید کے بعد ساتواں دن آزادی کا ہوتا ہے اور آج تو خاص طور پر طبیعت آرام چاہتی تھی۔ شاید یہ کل رات کے جوش طرب کا نتیجہ تھا۔ مائیکل صاحب سے اس کی نفسیات پر مزار ہے گا۔ دو پہر تک شام اور انصر بھی آگئے۔ رستوران میں محفل حسب معمول گرم ہو گئی۔

شام مکمل رات تو میرا مہبت برا حال ہوا۔ ساری رات پانی پی پی کر گذاری۔ سر میں اب بھی شدت کا درد ہے۔ کوئی بارہ بجے کے قریب اٹھا ہوں۔ دل تو یہی چاہتا تھا کہ لیٹا ہی رہوں۔ یہ شراب بھی کیا چیز ہے۔ بادۂ ذریں میں کتنی کشش ہے۔ مگر بعد کے اثرات مہبت خراب ہیں۔ لینڈ میری تو یہ جوتانی ہیں۔ ماں بھی ناراض ہے اور بیوی الگ منہ پھلنے لگی ہے۔

مائیکل ۲۰۔ اسی لئے رات میں نے قانون زندگی پر بحث شروع کی تھی۔ اب بھی عقل سے کام لینا سیکھو۔ شراب سے بھی وہی لطف اندوز ہو سکتا ہے جو انفرادی زندگی کے اصول پر عمل کرے۔ پرہیز یا اعتدال پسندی یا اپنی ذات سے محبت یا اپنے جذبات پر قابو یا اپنی نفسانی خواہشات پر عبور۔ یہ سب ایک ہی اصول کے مختلف نام ہیں۔ اخلاقاً کوئی خواہش نفسانی اچھی

ہے نہ بری۔ لیکن اس کی تسکین کا ذریعہ یا طریقہ اچھا یا بُرا ہو سکتا ہے۔ کل رات کی بحث میں یہ بات طے ہو گئی تھی کہ تکبیل خودی۔ مقصد حیات ہے۔ زیادہ شراب نوشی سے آپ نے یہ اصول توڑ دیا اور اپنی ذات کی حفاظت اور پرورش کی بجائے اپنے جسم کو تکلیف پہنچائی۔ چند ساعتوں کے نطف کیلئے ایک رات اور دن کرب و اضطراب میں گزارا۔“

انصر۔ اسی بنا پر تو میں نے کہا تھا کہ جب کوئی شخص اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ جس کو اپنے جذبات پر قدرت نہ ہو۔ اُس کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ شراب نوشی سے پرہیز کرے۔ اس لئے اسلام نے مسلمانوں کے لئے شراب حرام کر دی۔ کیونکہ پینے کے لئے ایک مقدار مقرر کرنا مشکل امر تھا۔ مثال کے طور پر مسید صاحب آدمی تو بل بھی پی جاتے ہیں تو نشہ نہیں ہوتا۔ دوسری طرف نابیکل صاحب دو جام پیتے ہی غمزدہ ہو جاتے ہیں اور اصرار کرنے پر بھی انکار کر دیتے ہیں۔ اس لئے اپنے جذبات پر قابو پانے کے لئے عملی طریقہ یہی ہے کہ نفس کشی کی جائے۔“

مائیکل۔ آپ کا کہنا سچا ہے مگر احمدا لپسندی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سرے سے ہی جذبات کو فنا کر دیا جائے۔ بیشک اگر ایک شخص بار بار کے تجربے سے یہ جان گیا ہے کہ وہ اپنی حد کے اندر نہیں رہ سکتا تو اس کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ بالکل ابتنا کرے۔ لیکن جو شخص اپنے جذبات پر غور رکھتا ہے۔ اپنی حد کے اندر رہنا جانتا ہے۔ اس کو حق ہے کہ وہ شراب نوشی سے بھی محتاط رہ سکے۔ شراب کی اتنی مقدار پئے۔ جس سے اس کو یا کسی کو کوئی جسمانی یا اخلاقی گزند نہ پہنچے۔ ورنہ وہ اپنی ذات کو نقصان پہنچا کر خود ہی ظالم و مظلوم ہوگا۔ اس لئے اپنی ذات سے عشق پہلا اصول ہے جو شخص اپنی ذات سے عشق کرنا نہیں جانتا۔ وہ دوسروں سے کیا عشق کر سکتا ہے۔ عشق ذاتی سے مراد ہے کہ اپنی جسمانی۔ دماغی اور اخلاقی قوتوں کو نشو و نما دی جائے انفرادیت کو شخصیت میں بدل دیا جائے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اصل تربیت وہی ہے جس میں کسی فرد کی اپنی فطرت میں کمال حاصل کریں۔ خوش قسمت ہیں۔ وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ قدرت نے ان کو کس کام کے لئے پیدا کیا ہے۔ ان کی خواہشات کیا ہیں؟ ان کی ذاتی صفات کیا ہیں؟ اور پھر ان کی نشو و نما کے لئے جدوجہد میں معروف ہو گئے اور جنہوں نے زندگی کی منزلیں طے کرتے

ہوئے اپنے نصب العین کو پایا۔ ہندوستان میں ایسے خوش نصیب افراد بہت کم ہیں۔ پیشتر
 کی زندگی تو بس ایک پتھر ہے جسم حرکت کو تاتا ہے۔ ہاتھ کام دیتے ہیں مگر روح بے چین رہتی ہے
 دماغ کرب و اضطراب میں مبتلا رہتا ہے مگر پیٹ کے دوزخ کے آگے بس نہیں چلتا۔ روزی
 کے لئے ان کو وہ پیشہ اختیار کرنا پڑتا ہے جس سے ان کو فطرت ہے۔ مثلاً اپنے سعید صاحب
 شاعرانہ طبیعت رکھتے ہیں لیکن پیشہ ان کا کلر کی ہے۔ اکثر افراد کے جذبات مرہو ہو جاتے
 ہیں۔ بعض اپنے پسندیدہ شغل کو شوقیہ طور پر پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے ظاہر
 ہوتا ہے کہ خواہش ابھی زندہ ہے۔ ابھی اس میں دم خم باقی ہے۔ کاش ان کو کوئی اپنی حقیقی منزل
 تک پہنچانے میں سہارا دے سکے!۔ وہ لمحات کس قدر مسرت آگیاں ہیں جو اپنے مجبور مشغلہ کے
 لئے صرف ہوتے ہیں!۔ جسم اور روح اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ کام کے بعد اس کی محنت کا ثمر
 اس کے سامنے آتا ہے۔ اس کا چہرہ خوشی سے تہمتا اٹھتا ہے۔ یہ ہے فحلص کام۔ ہر فرد ایک سیارہ
 ہے اور ہر سیارہ کے لئے گردش اور منزل کا مقام ہوتا ہے۔ اس طرح ہر فرد کے لئے بھی قدرت
 نے ایک جگہ کا راستہ مقرر کیا ہوا ہے۔ آپ نے دیکھ لیا۔ اپنی ضروریات کو جاننا کس قدر ضروری ہے
 آپ کس کام کے لئے پیدا ہوئے ہیں؟ قدرت آپ کی ذات سے کیا کام لینا چاہتی ہے؟ اگر نہیں
 معلوم تو جاننے کی کوشش کرو اور اپنی منزل کی طرف قدم بڑھا دو۔ کامیابی آپ کے قدم چومے گی! یہ
 تمام عشقِ خودی کی بدولت ہو سکتا ہے۔



پانچواں باب

اجتماعی زندگی

دوپہر کے بعد مائیکل - انصر اور میں شام کو ریل پر سوار کرنے کے لئے گئے۔ وہ واپس آپ کام پر جا رہا تھا۔ احباب پر اُداسی کی کیفیت طاری تھی۔ یہ سوسائٹی کی بھی خواہش انسانی فطرت کا ایک اہم جزو ہے! - انسان فطری طور پر سماجی حیوان واقع ہوا ہے۔

مائیکل بولا۔ بیشک انفرادی - اجتماعی اور سماجی زندگی ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ سوسائٹی افراد کی تنظیم سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ بذاتِ خود سوسائٹی کوئی وجود نہیں رکھتی! حقیقی جُز و تو فرہ ہے۔ اگر کسی سوسائٹی کے کچھ کو بلند کرنا چاہو تو اُس سوسائٹی کے ہر فرد کو اپنی اپنی جگہ ترتیت دے کر انفرادیت کو شخصیت میں بدل ڈالو۔ سوسائٹی خود بخود سدھ جائے گی۔ سوسائٹی کے قیام اور وجود کا مقصد ہر فرد کی خودی کی تکمیل ہے۔ سوسائٹی بذاتِ خود کوئی منزل نہیں۔ بشر کے لئے رہنمائے منزل کی ضرورت ہے۔ ورنہ سوسائٹی کا کوئی فائدہ نہیں اس لئے سوسائٹی کا اصول بھی وہی ہے جو ایک فرد کا ہے

عشق اپنی ذات سے احباب سے عشق سے سارا جہاں ہو فیض یاب
جس سے تکمیل تیری ذات کی ہے وہی تیرا عمل کچھ کامیاب
عشق کی دنیا محبت آفریں اس میں چھڑتا ہے اخوت کا رباب

عشقِ خلاقِ جہاں نقشِ بقا
عشق ہی کا نام ہے شاید خدا

انصر: مگر یہ تو واضح کیجئے کہ دوسروں سے عشق کیسے کیا جائے۔ ہر کوئی اپنی ذات سے محبت کرتا ہے۔ انسان خود غرض پہلے ہے۔ سرشتِ آدم کی تاریخ یہی بتلاتی ہے اور یہ ہولناک جنگیں اس کا بین ثبوت ہیں۔

مائیکل: ”خود غرضی اور عشقِ خودی میں بہت فرق ہے! جو حیوان انفرادی زندگی بسر کرتا ہے وہ خود غرض ہوتا ہے مگر ایسے بھی جانور ہیں جو سماجی زندگی بسر کرتے ہیں مثلاً ہنس کا جوڑا — کبوتر اور کبوتری — اپنے بار بار دیکھا ہوگا کہ کس طرح یہ پرندے اپنے بچوں کی چوچ میں دانے لالا کر ڈالتے ہیں۔ اپنی مادہ سے بچہ عشق کرتے ہیں سبب کے جوڑے کی محبت تو بے مثل ہے! دوسروں سے عشق کے یہ معنی ہیں۔ خود جو اور دوسروں کو جینے دو! اور جو دوسروں کے دکھ میں بھی شریک ہو۔ یہی صفت ہے جو انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ دے سکتی ہے۔ ورنہ انسان ہوتے ہوئے بھی وہ حیوانوں سے بدتر ہے۔

یہی وہ صفت ہے جس کے فقدان سے آج بھی اقوام عالم پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں اور آج تک ٹوٹتے آتے ہیں۔“

انصر: اجتماعی زندگی کو بقرار رکھنے کیلئے ہر فرد کے ذمہ کیا فرائض ہیں؟

مائیکل: تمام انسان آپس میں ایک ہی برادری کے افراد ہونے کی حیثیت سے بھائی بھائی ہیں۔ ہر فرد اپنی اپنی جگہ بذاتِ خود ایک منزل ہے۔ اس لئے ہر فرد کے ذمہ یہی فرائض ہیں کہ وہ اپنی ذات کی تکمیل کرے اور دوسرے افراد کی اس سلسلے میں مدد کرے۔ اس ہمدردی کے دو پہلو ہیں۔ انصاف اور سخاوت۔ انصاف اور زنا انصافی دونوں ایک ہی وقت میں اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ مثال کے طور پر خیرات کو لیجئے۔ غریبوں۔ مسکینوں اور لاچاروں کی خیرات کی شکل میں مدد دینا۔ سوسائٹی میں خوبی گنی جاتی ہے۔ مگر فوراً غور کیجئے۔ کیا یہ ان مصیبت زدہ انسانوں کے ساتھ بے انصافی نہیں۔ چاہئے تو یہ تھا کہ سوسائٹی غربت و افلاس کو جڑ سے اکھڑے تاکہ خیرات کی

کوئی ضرورت ہی نہ پیش آئے۔ مگر یہ شرمناک فعل اب تک جاری ہے۔ امیروں نے تو سمجھ رکھا ہے۔ کہ منفس اور لاپچار دنیا میں سسکیاں لیتے رہیں تاکہ ان کو سخاوت کرنے کے موقع ملتے رہیں۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے۔ ایسی کھلی بے انصافی اور اُس پر انسان ہونے کا دعویٰ۔ خیال کیجیے جس وقت سب افراد انصاف کی زندگی بسر کریں گے۔ اُس وقت سخاوت کے لئے کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہے گی۔ انصاف اپنا کام کر چکا ہو گا۔ اس لئے سب سے بہتر سخاوت جو انسان دوسرے انسان پر کر سکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اسے خیرات سے بے نیاز کر دے۔ اسے اپنی مدد کرنا سکھائے یہ ہے حقیقی بہدردی۔ یہ نہیں کہ اسے بہدردی یا خیرات کا آلہ کار بنا کر اپنے احساس برتری کی تسکین کا ذریعہ بنائے۔ اندھی سخاوت کبھی کسی کام کی نہیں جو دوسروں کو اپنا بیج بنا دے۔ مثال کے طور پر لاڈ کرنے والے باپ کی شفقت بچے کیلئے سبقت قاتل ثابت ہوتی ہے۔ یہ مہربانی اُس کی زندگی کو نذر بالاکر دیتی ہے۔ بے جا سخاوت۔ خیرات۔ بہدردی بھی دوسروں کی قوتِ خودی کو کمزور کر دیتی ہے۔ حقیقی معنوں میں سخاوت وہی ہے جو دوسرے اشخاص کی تکمیلِ خودی میں معاون ہو۔ اس کی مثال وچھل شخصوں کی بے غرض دوستی یا محبت ہے جس سے دونوں کی ذات تکمیل پاتی ہے۔ خیرات نہ دنیا آسان ہے۔ مگر اپنی ذاتِ سخاوت کو نامشکل کام ہے۔

انصر۔ اجتماعی زندگی بسر کرتے ہوئے کیا تمام انسان کلی طور پر آزاد نہیں رہ سکتے۔ تاکہ تمام افراد اپنی اپنی جگہ آزادی سے تکمیلِ خودی کر سکیں۔ کیونکہ آپ کے نظریے کے مطابق ہر فرد ایک تیار ہے۔ اس کی اپنی ایک دنیا ہے؟

مائیکل۔ اجتماعی زندگی کے چار ادارے ہیں۔ گھر، سماج، ریاست اور ملت۔ ان سب کا مقصد ایک ہے مگر راستے جدا گانہ ہیں۔ سب اہم ادارہ ریاست یا ادارہ حکومت ہے۔ اس کے قیام کی ضرورت کیوں لازمی ہے۔ اس کی مثال دیوں سمجھئے۔ ایک جزیرہ میں ایک انسان تنہا ہے۔ اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے جدوجہد کر رہا ہے۔ اُس کی انفرادی زندگی میں اگر وہ کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ یعنی عشقِ ذاتی کے اصول کو توڑتا ہے تو اُس کا غمیانہ اُس کی اپنی ذات کو بھگتتا ہے۔ فرض کرو ایک اور انسان بھی اسی جزیرہ میں اٹھتا ہے۔ ایک دوسرے کی موجودگی

دونوں کو علم ہو جاتا ہے۔ گردہ آپس میں ملاپ نہیں رکھتے۔ جزیہ میں ایک ہی آم کا درخت ہے۔ زیادہ سے زیادہ آم حاصل کرنے کے لئے دونوں اپنی اپنی جگہ جدوجہد میں مصروف ہیں۔ درخت کسی کی ملکیت نہیں۔ آخر تم ہونے کے قریب ہیں۔ دونوں میں سے ایک پہلے پہنچتا ہے اور بقایا آم چن کر جانا ہی چاہتا ہے کہ دوسرا بھی آپہنچتا ہے۔ لڑائی ہوتی ہے اور طاقتور مرکز ور سے آم چھین کر لے جاتا ہے۔ اب بھی کسی مجرم یا گناہ کا از نکاب نہیں ہوا۔ خود غرضی انسان کا فطری مذہب ہے۔ حیوانی اور انفرادی زندگی کے قانون کے مطابق زبردستی حق بجانب ہے۔ کچھ وقت کے بعد دونوں میں میل ملاپ بڑھ جاتا ہے۔ انسان سماجی حیوان ہے۔ یہ اس کا فطری اقتضا ہے۔ اب اگر وہ کبھی سابقہ طرز عمل اختیار کریں تو وہ گناہ یا مجرم ہوگا۔

اس طرح اگر سب افراد کو کامل آزادی تیسرے تو افراد مختلف گروہوں میں بٹ جائے میں اور ایک گروہ دوسرے گروہ سے وہی سلوک کرتا ہے۔ جو ایک فرد دوسرے فرد سے انفرادی زندگی میں روا رکھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فاسخ گروہ کے افراد ہی اپنی تکمیل خود ہی کر سکتے ہیں۔ یہ خود غرضی کا دائرہ ایک نقطہ یعنی فرد سے شروع ہو کر وسیع ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ساری دنیا اس کی پیٹھ میں آ جاتی ہے۔ ایک ملک کے اندر کئی گروہ پیدا ہو جاتے ہیں جو آپس میں برتری کی خواہش کے ماتحت دست گردیاں رہتے ہیں اور طاقتور گروہ ان پر حکومت کرتا ہے۔ اسی طرح شخصی راج کی بنیاد پڑتی ہے۔ اور ایک حکومت دوسری حکومت سے جنگ کرتی ہے اور اسے زیر کرنے کے بعد ایک سلطنت کی بنیاد رکھتی ہے۔ پھر سلطنتیں آپس میں اسی جذبے کے ماتحت جنگ کرتی ہیں اور یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ فاتح قوم اپنی تکمیل خودی چاہتی ہے۔ مفتوح اقوام صرف اسی مقصد کی آلہ کار بن کر رہ جاتی ہیں۔ یہ ہے غلامی، بے انصافی اور ظلم انسانوں کے ایک گروہ کا دوسرے کے ساتھ شہنشاہیت ایک عذاب اور قہر الہی بن کر رہ جاتی ہے۔ یہی انسانی خود غرضی ہمیشہ سے امن کی دشمن چلی آرہی ہے انسان نے آج تک انسانیت نہیں سیکھی۔ تاریخ اس کی شاہد ہے۔ دنیا کی دوسری عالمگیر جنگ اس کا نازہ ترین ثبوت ہے۔

• تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ کامل آزادی کا نتیجہ غلامی بے انصافی اور شہنشاہیت کی تخلیق

ہے۔ کیا اس کا کوئی حل ایسا نہیں جس سے ہر انسان آزاد رہ سکے۔ اور اپنی تکمیل خودی بھی کر سکے اور اس مقصد کے حصول میں دوسرے انسانوں سے اسے کوئی مقابلہ یا جنگ نہ کرنی پڑے۔ اور شہنشاہیت کے بچے کی درست برد سے امن میں رہ سکے! امیں نے کہا۔

مائیکل: یہ تو اچھی طرح ذہن نشین ہو گیا ہو گا کہ افراد کی کامل آزادی کے معنی بد نظمی، جنگ اور غلامی ہیں۔ اس لئے آزادی پر پابندیاں لازمی ہیں اور یہی ریاست کا نظام عمل ہے۔ ریاست افراد کی اپنی تخلیق ہے اور سماج کی طرح یہ بھی بذات خود کوئی وجود نہیں رکھتی۔ ریاست کے قیام کی غرض و غایت بھی یہی ہے کہ وہ ہر ایک فرد کو کسی فرد یا افراد کی دسترس سے محفوظ رکھے اور تکمیل خودی میں اس کی اعانت کرے۔ ریاست کے وہ فرائض ہیں مگر افراد کو قانون زندگی پر چلانے کے لئے حکومت کا حربہ لازمی ہے۔ اس لئے ریاست کے ہاتھوں میں حکومت بھی سونپ دی جاتی ہے۔ تاکہ حکم عدلی کو زیر لو کو راہ راست پر چلنے کے لئے مجبور کیا جائے! حکومت انہی افراد کو مجبور کرتی ہے جو اپنے آپ پندرت نہیں رکھتے۔ اجتماعی زندگی کے باقی ادارے مثلاً سماج یا مذہب افراد کے اخلاقی احساس پر چلا کرتے ہیں تاکہ قانون زندگی پر عمل پیرا ہوں کیونکہ ان کی بھلائی اسی میں ہے۔ اس پر بھی جب وہ باز نہیں آتے تو حکومت اپنے اختیار اور اپنی طاقت کا استعمال کرتی ہے۔ مجرم کو سزا دیتی ہے۔

انصر: حکومت کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ مگر یہ حکومت کا حربہ یا حکومت کا اختیار کن اشخاص کو سونپا جاسکتا ہے؟ کیا حکومت کی مرضی فرد کی مرضی کی جگہ نہ لے لے گی اور اس طرح کسی فرد کی خودی کو ضعیف نہ پہنچے گا؟

مائیکل: ہمارے پیش نظر بھی تو یہی مقصد ہے۔ اگر خودی کو مٹا دیا گیا تو حکومت بیکار شے ہے۔ بیشک حکومت تو افراد کی ظاہری عادات و افعال پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ افراد کو طاقت سے مجبور کر سکتی ہے کہ وہ قانون زندگی پر عمل کریں۔ مگر کسی فرد کے باطن یا ضمیر کو مجبور نہیں کر سکتی۔ یہ فرد کے اپنے اختیار میں ہے اور یہ اختیار اس سے کوئی دنیا کی طاقت اس کی مرضی یا خودی کے بغیر نہیں چھین سکتی۔ ایک چور یا غوثی مزید جرم کا ارتکاب نہ کرنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ مگر ذہنی۔ اخلاقی یا روحانی طور پر وہ اپنی اصلاح کرنے کے لئے تیار ہے یا نہیں۔ یہ اس کے

اعتبار میں ہے جسم پر دوسرے کا تسلط ہو سکتا ہے۔ افعال پر نگہداشت ہو سکتی ہے مگر اس کی خودی حکومت کی مرضی کے ساتھ تعاون کرنی ہے یا نہیں۔ اس کا ظاہر و باطن ہم آہنگ ہو آہے کہ نہیں یہ فرد کی تہ دی پر موقوف ہے۔ فاسخ قوم جسم کو غلام بنا سکتی ہے مگر کسی شخص کی خودی کو غلامی میں بدل دینا اس کی طاقت سے باہر ہے۔ یہ کام تو خود خدا ہی کر سکا۔ بندہ اپنے خالق کے آگے جھکے یا نہ جھکے اس کے اعتبار میں ہے۔ بیوقوفہر سے بظاہر جھک سکتا ہے مگر باطنی طور سے کبھی نہیں۔ باطن کو تسخیر کرنے والی ایک ہی طاقت ہے اور وہ ہے عشق و محبت۔ عشق ہی وہ طاقت ہے جس کے آگے خودی ہی اختیار ڈال دیتی ہے۔

انصر۔ بیٹھک ایمان ہی عشق پر منحصر ہے۔

پہلے خطر کو پڑا آتشش فرد میں عشق

تھل ہے عورتا شلے لب بام ابھی

مائیکل۔ اس حقیقت سے صاف نمایاں ہے کہ جبر و خوف۔ سزا اور جزا مضذرائع ہیں۔

مقاصد نہیں ہیں۔ ظاہر کو رام کرنا پہلا قدم ہے۔ انخاص کی باطنی رضامندی حاصل کرنا دوسرا قدم ہے اور یہ عشق ہی سے ممکن ہو سکتا ہے۔ ظاہر و باطن کو ایک کر دینا منزل مقصود ہے۔ اس طرح جب افراد کی رضا حکومت کی مرضی سے ہم آہنگ ہوتی ہے تو حکومت کے لئے قوت کے استعمال کی گنجائش ہوتی ہے۔ افراد اپنی خودی پر آپ اختیار حاصل کر لیتے ہیں۔ حکومت اور افراد کی رضا میں کوئی تضاد نہ ہو۔ یہ ہے حکومت کا نصب العین! اس سے یہ اہم نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ صحیح معنوں میں ریاست اور فرد ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ ایک ہی مقصد کے لئے دو رخ ہیں۔ فرد راہی ہے اور حکومت مشعل راہ۔ ریاست وہی ہے جس میں تمام افراد کی رضا شامل ہو اور صحیح معنوں میں حکومت بھی ایسی ہی ریاست کے سپرد ہونی چاہئے۔ حکومت ریاست کے ادارہ کی روح رواں ہے۔ یہ ہے جمہوریت کا آدرش۔

انصر۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جمہوریت افراد کی رضا سے تشکیل پاتی ہے۔ حکومت بھی تمام افراد کی رضا سے ریاست کی تحویل میں ہوتی ہے۔ مگر تمام افراد کی رضا شامل حال ہونا

بعید از حقیقت بات ہے میرا تجربہ ہے کہ بیشتر افراد کی رضا باقی ماندہ افراد پر ان کی مرضی کے خلاف حکومت کرتی ہے۔

مائیکل : آپ کا اعتراض بجا ہے اور میرا آپ سے تبادلہ خیالات کرنے کا مقصد یہی ہے کہ اس نقص کو کس طرح دُور کیا جائے۔

انصر : میں اپنی رائے سے بھی آپ کو آگاہ کروں گا۔ ابھی آپ اپنے نظریے کی وضاحت کرتے جائیں۔

مائیکل : جمہوری نظام حکومت کو چلانے والے مختلف انسانی گروہوں کے نمائندے ہوتے ہیں مگر ان کے پیش نظر ایک ہی مقصد یعنی ہر فرد کی تکمیل خودی ہونا چاہئے جس وقت حکومت اس آدرش کے خلاف قدم اٹھاتی ہے۔ اس وقت بغاوت کرنے کا حق افراد کو حاصل ہے۔ اسی بغاوت میں بھی تمام شہری اپنا حق استعمال کرتے ہیں۔ جس چیز کی وہ تعمیر کر سکتے ہیں۔ اس کی تخریب کا بھی حق انہی کو حاصل ہے تخریب کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے۔ اس کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ پہلی جن اشخاص کے ہاتھوں میں تمام افراد کی امانت سونپی گئی ہے۔ وہ اس میں خیانت شروع کر دیں یا وہ تمام متفق ہو کر ایک امر کی صورت اختیار کر لیں اور اس طرح ایک ذاتی حکومت یا تہنشاہیت قائم کر دیں۔ اپنی خواہشات کو عوام کی ضرورتوں پر ترجیح دینا شروع کر دیں۔ ان حالات میں بغاوت عوام کا ایسا ہی فرض ہے جیسا کہ دوسری صورتوں میں اطاعت اور رضا۔! فرانسیسی اور انگریز انقلاب اسی طرح وقوع پذیر ہوئے تھے حکومت عوام کا خواہ ہے۔ اس لئے یہ حق انقلاب سے عوام کو واپس مل جاتا ہے اور پھر وہ نئے سرے سے ایسی حکومت کرتے ہیں جس میں منبرہ افراد کی رضائیں شامل ہوتی ہے۔ دوسری صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کسی ریاست کے موجودہ قوانین میں ترمیم و توشیح کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ یہ بھی عوام کی مرضی پر منحصر ہے۔ اس لئے بغاوت یا تحریک اصلاح جو بھی مناسب ہو۔ اس سے عوام کام لے کہ حکومت کو مجبور کر سکیں ہیں۔ حکومت کا نظام بھی چل سکتا ہے۔ جب تک عوام اور حکومت میں تعاون قائم رہے۔ شہنشاہ ہو یا آمر کونسل ہو یا پارلیمنٹ۔ جب تک وہ عوام کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔ ہر سراقہ دار رکھتے ہیں۔ اہل فرمانروا

تو عوام ہیں حکام تو محض عوام کے خدام ہیں۔ ایک جمہوری نظام کے حکام اور شہنشاہیت یا آمرت کے حکام میں زمین آسمان کا فرق ہے۔“

انصرؒ آپ کے نظریے کا آدرش واقعی بلند ہے مگر اس میں نقائص بھی ہیں جو آپ نے بیان کئے۔ اور اس کا مغربی جمہوریت کے پاس کوئی علاج نہیں۔ اس کا علاج فقط مذہب کے پاس ہے میں اس کا اسلامی حل پیش کروں گا۔ ابھی آپ اس مضمون پر جو اظہار خیال کرنا چاہتے ہیں۔ شوق سے کیجئے۔“

مائیکلؒ۔ اب یہ سوال رہتا ہے کہ جمہوری حکومت کے فرائض کیا ہیں؟ اس کے بھی فرائض وہی ہیں جو ہم ریاست یا حکومت کے لئے متعین کرتے ہیں۔ یعنی ایک طرف فرد کو باقی افراد سے دامن امن میں یا دامن پناہ میں رکھنا تاکہ کوئی اس کی تکمیل خودی میں حاصل نہ ہو اور دوسرے فرد کے ایسے مقصد کے حصول کے لئے مدد کرنا یعنی دولتوں میں انصاف اور سخاوت کے فرائض اور انصاف قائم رکھنے کے لئے حکومت پولیس۔ فوج اور عدالتوں وغیرہ سے کام لیتی ہے اور سخاوت کا عملی ثبوت تعلیم و تربیت کے ادارے۔ ہسپتال۔ ریلیں۔ سڑکیں۔ کاخانے وغیرہ بنا کر دیتی ہے۔ اس سے یہ توصیف واضح ہو گیا کہ جمہوری نظام فرد کی انفرادیت کو کیسے قائم رکھتا ہے۔ جو ریاست یا حکومت فرد کو اپنے میں جذب کر لے۔ وہ صحیح معنوں میں ریاست یا حکومت نہیں بلکہ شہنشاہیت یا آمرت یا شخصی حکومت کے مترادف ہے۔“

انصرؒ تو اس سلسلے میں اشتراکیت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا جمہوریت اور آمرت یا آمرت کے اصولوں میں تضاد پیدا نہیں ہوتا۔“

مائیکلؒ۔ اشتراکیت کا انتہائی نظریہ تو واقعی خودی کے حق میں موت کے برابر ہے۔ یعنی ایسی ریاست جس میں کوئی فرد کسی چیز کا مالک نہ ہو اور تمام اشیاء عوام کی باہمی ملکیت ہوں۔ یہ دلیل پیش کی گئی ہے کہ ذاتی ملکیت کی خواہش انسان کو خود غرض بناتی ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے اور اس طرح مال و دولت کے لئے جنگ و جدل کرنا لازمی امر بن جاتی ہے۔ مگر دوسری طرف ہم اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ ذاتی ملکیت کی خواہش ایک فطری ضرورت ہے۔ ملکیت

شخصیت کی ترجمانی کرتی ہے۔ یہ میری کتاب ہے۔ یہ میرا گھوڑا ہے۔ میرا نام یہ ہے۔ یہ سب اسی جذبہ کا اظہار ہیں۔ ملکیت شخصیت سے علیحدہ نہیں کی جاسکتی۔ ملکیت انسان کا فطری اقتضا ہے اسی لئے کوئی شخص کسی کو غریب کہہ کر غلام نہیں بنا سکتا۔ اس کی خدمات ضرور خرید سکتا ہے۔ غلامی شخصیت کو فنا کر دینے والی چیز ہے۔ ایک انسان کو ایک بے جان چیز یا جانور میں تبدیل کر دینے کے مترادف ہے۔ اس لئے ریاست ملکیت کی محافظ ہونی چاہئے، نہ کہ مخالفت! جو چیز وہ عطا نہیں کرتی۔ اس کے چھین لینے کا بھی اسے کوئی حق نہیں۔ ہر فرد کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی محنت کے ثمر کا مالک ہو۔ حکومت اشخاص کے تمام حقوق کی نگہداشت اور تحفظ کی ذمہ دار ہے۔ اسی ملکیت کے متعلق قانون وضع کرنا بھی ریاست کے فرائض میں سے ہے۔ اگر کوئی فرد دوسرے فرد کی ملکیت پر دست درازی کرے تو حکومت کا فرض ہے کہ عدالت کے ذریعے حقدار کو حق واپس دلانے۔ اس طرح ملکیت کو دوسرے کے حوالے کرنا یا بیچنا بھی ایک فرد کا حق ہے!

مالک ہونے کی حیثیت سے وہ اسے جس طرح چاہے استعمال کرے۔ لیکن جس وقت کوئی شخص اپنی ملکیت یا دولت کی مدد سے دوسرے انسانوں کو آزار پہنچاتا ہے۔ ان کی تکمیل خودی میں حائل ہوتا ہے تو حکومت کے انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ اس کو روکا جائے یا سزا دی جائے اسی طرح حکومت کوئی بہتر طریقہ بھی عمل میں لاسکتی ہے جو عوام کے حقوق پر دست درازمی نہ کرنے پائے اور ساتھ ہی ان کے حالات کو بہتر بنائے۔ اس لئے عوام کی رضا کے مطابق طریقے اختیار کئے جاسکتے ہیں۔ یہ طریقہ کیا ہونے چاہئے۔ ان کے متعلق ہم معاشی مسئلہ پر بحث کے دوران میں غور کریں گے۔ فی الحال تو اتنا کہنا کافی ہے کہ انتہائی نظریہ اشتراکیت کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ انسان کی فطرت اسے قبول نہیں کرتی۔

اشتراکیت فنا شدہ کی	بحر میں ہو جاتی ہے گم جوئے آب
آمریت کا ستم راں و بد بہ	اس جہاں کے واسطے ہے اک عذاب
پادشاہی کا محکم اور شکوہ	ذلت انسانیت کی اک کتاب
عشق کی دنیا محبت آفریں	اس میں پھڑپھڑتا ہے انوث کا رباب

میں نے تو یہی نتیجہ اخذ کیا ہے۔ ریاست یا حکومت اس کا نام خواہ کچھ ہی رکھ لو مقصد تکمیل خودی ہونا چاہیے۔ ریاست اسی مقصد کے لئے وجود میں آتی ہے۔ اگر مقصد ہی فنا ہو جائے اور فرد کو شخصیت میں بدل سکے۔ ایسی ریاست بیکار ہے۔ اس کو توڑ دینا ہی مناسب ہے۔ اس لئے ایسا کوئی نظریہ جو خودی کو فنا کر دے۔ انسان کے لئے موزوں نہیں۔“

انصر۔ پھر آپ کے خیال میں جمہوری حکومت کو کن ہدایات پر عمل کرنا چاہئے؟
 مائیکل۔ میں مختصر طور پر یہ فرائض بیان کروں گا۔ ہر فرد کی جسمانی صحت کو بہتر بنانا۔ بچوں کی پرورش اور پیدائش پر پوری نگہداشت کرنا۔ آئندہ نسلوں کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرنا۔ بیماری اور پیدائش کے تقاضوں کو نیت و نوا بود کرنا۔ اسی سلسلے میں تعلیم و تربیت۔ ہسپتال۔ زچہ خانے وغیرہ بنانا۔ یہ سب پہلا فرض۔ دوسرا فرض یہ ہے کہ ہر فرد کو تعلیم کے لئے موقع دینا۔ جبری تعلیم دینا۔ اور تعلیم کے بعد ہر شخص کو اور ہر فرد کے لئے کام مہیا کرنا۔ تاکہ کوئی بیکار نہ رہ سکے۔ ہر فرد کو اس کے قدرتی رجحان کے مطابق تربیت دینا اور اس طرح اس کی تکمیل خودی میں مدد کرنا۔ تیسرا فرض یہ ہے۔ معاشی زندگی نظام میں ترقی یافتہ قائم رکھنا۔ سرمایہ اور مزدوری کو ہم آہنگ کرنا۔ چوتھا فرض۔ افراد کو نسل۔ مذہب یا وطن پر فخر کرنے کی بجائے ذاتی اخلاق اور قابلیت کے بلند درجہ کی اہمیت ذہن نشین کرنا۔ پانچواں ہر مذہب و ملت کے کلچر کو بلند کرنے کے لئے برابر مواقع پیدا کرنا۔ احساس برتری کی خواہشات کو بے ضرر طریقوں سے تسکین کی تعلیم دینا۔ چھٹا معاشی زندگی کے اصول و منہج بلکہ کو نظر انداز کئے بغیر اس جذبہ سے کام لینا سکھانا۔ سیاسی زندگی میں سب کو برابر حصہ دینا۔ ساقواں۔ دونا میں امن قائم رکھنا۔ ہر فرد کے اخلاق کو اس معیار تک پہنچانا کہ وہ گناہ کا تصور بھی نہ کر سکے اور بغیر گناہ کے انسان تمام اپنی فطری ضروریات اور اپنی خواہشات کی تکمیل کر سکے۔ ایسے ہی فرائض کو انجام دے کر ریاست اپنے فرض سے سبکدوش ہوتی ہے۔“

انصر۔ کیا انسان جب اپنی تکمیل کر لے گا۔ اپنا آقا خود بن جائے گا؟ اس وقت ریاست کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ کیا حب الوطنی کی محدود خوبی کی جگہ عالمگیر اخوت ملے لگی؟
 مائیکل۔ یہ سوالات ایسے ہیں جن کا جواب وثوق سے نہیں دیا جاسکتا۔ اغلب یہی ہے کہ

ریاست کی ہمیشہ ضرورت رہے گی۔ جنگ کی بجائے عالمگیر امن قائم رکھنے کے لئے ایک ریاست کا دوسری ریاست کے ساتھ تعلق رکھنا ضروری ہو گا۔ شاید کبھی وہ دن بھی آجائے۔ جب تمام دنیا ایک عالمگیر ریاست میں تبدیل ہو جائے اور یہ ممکن ہے۔ اسی نتیجہ پر میں آپ کو بندید رج لے جانا چاہتا ہوں۔ لیکن فی الحال زمانے کے حالات کے مطابق چلنا بہلا قدم ہے۔ اسی عالمگیر ریاست کی تخلیق کے لئے ہر ریاست کو اس مقصد کی تیاری کے لئے ایک لائحہ عمل پر چلنا ضروری ہے۔ اسلئے عالمگیر اخوت کا خواب دیکھنے کی بجائے حقیقت سے دوچار ہونا چاہئے۔ ہماری اپنے نزدیک شرتہ وارد متحدہ داروں۔ پڑوسیوں اور دوستوں کی خدمت یعنی ان کی تکمیل خودی کے حصول میں۔ اعانت سب سے پہلا زمین ہے اور یہی زمین ہمیں عالمگیر اخوت تک پہنچا دے گا۔ جب ہم اپنی ذات، اپنے خاندان دوستوں اور پڑوسیوں کی مدد نہیں کر سکتے۔ ان کے حالات نہیں سدھار سکتے۔ ان کی زندگی کو بہتر نہیں بنا سکتے۔ ہمارے لئے تمام انسانیت کے سدھارنے کا۔ عوٹے بے معنی ہے۔ اول "خوفش بعد درویش" ایک حقیقت ہے۔

وطنیت اور قومیت کے مسئلوں پر یہی لمبی بحثیں اور مقالات لا یعنی ہیں۔ قومیت کے بارے میں میرے خیالات کیا ہیں۔ یہ کچھ بھی بناؤں گا۔ آج تو بہت دیر ہو گئی۔ آپ کو اور بھی کام کرنا ہوں گے۔



چھٹا باب

توہماتِ فلسفہ اور مذہب

حسب معمول میں، مائیکل اور انصر ہوٹل میں موجود تھے۔ آج سرکاری اداروں میں تعطیل تھی۔ اس لئے فوجی جوت ورجوت دکانوں اور ہوٹلوں کا طواف کرتے پھر رہے تھے۔ مگر اس ہوٹل میں کوئی اکاؤنٹنٹ کا کباب ہی آتا۔ حالانکہ کاروباری لحاظ سے بہترین جگہ پر واقع تھا۔ گنجائش بھی کافی تھی۔ مگر بدانتظامی کی وجہ سے جو کوئی ایک دفعہ آتا۔ دوبارہ نہ آتا۔ ہوٹل کا مالک مکملی باندھے ہوٹل کے پاس سے گزرنے والوں کو دیکھتا رہتا تھا۔ جو اس کی نظروں کے سامنے سے گزرتے ہوٹلوں میں داخل ہو رہے تھے۔ حسرت سے ہمیں مخاطب کر کے بولا: ”مجھے تو یقین ہے کہ میرا ہوٹل کسی نے جادو سے باندھ دیا ہے۔ کل ایک فقیر نے ہمیں بتایا ہے کہ اس ہوٹل کے کسی کونے میں کسی دشمن نے تعویذ زمین میں دفنایا ہوا ہے۔ یہ سب آفت اسی تعویذ کی وجہ سے ہے۔ اس نے مجھے پیر کرامت اللہ شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا منشورہ دیا ہے۔ میں کل ہی ان کی خدمت میں پہنچ کر آداب بجالاؤں گا۔ اللہ والے ہی کچھ میری مدد کر سکتے ہیں۔ یہ کالا علم بڑی طاقت رکھتا ہے۔“

انصر نے پوچھا: ”کوئی گورا علم بھی ہے؟“

مالک: ”دیکھئے انصر صاحب، آپ ایسی باتیں نہ کہیں۔ آپ کو کیا معلوم، اس کلام

میں کتنی طاقت ہے۔“

انصرؔ اچھا بابا اچھا!! — آج بھی دنیا میں بے شمار انسان ایسے بستے ہیں جن کا شعور آج سے ہزاروں سال پیشتر کے انسانوں سے ملتا ہے۔ توہمات نے اب بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ سائنس اور مذہب برسوں سے انہی توہمات کی تخریب پر آمادہ ہیں۔ لیکن پھر بھی انسان کے توہمات زندہ ہیں۔ ہاں تو مائیکل صاحب، کل آپنے صحیح جمہوریت کے فرائض اور اس کے آورش کے متعلق گفتگو کو ختم کیا تھا۔ آج کوئی سامعینوں پر کچھ لانا چاہتے ہیں؟

مائیکل: آپ کو یاد ہوگا میں نے تین طریقوں کا ذکر کیا تھا جس سے ہم زندگی کے مسائل کو حل کر سکتے ہیں۔ دوسروں کا جواب کل کی گفتگو میں مکمل طور پر دیا جا چکا ہے یعنی مقصدِ حیات تکمیل خودی ہے۔ انسان کی فطری ضروریات کی تکمیل کا بہترین راستہ بھی وہی ہے جس سے نہ اپنی اور نہ کسی اور انسان کی ذات کو نقصان پہنچے۔ بقیہ سوالات ایسے ہیں جن کا دھوکہ سے ابھی سائنس کوئی جواب نہیں دے سکتی لیکن ان کے جواب کی فراہمی کے لئے جستجو اور تحقیق جاری ہے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ سائنس خدا کی ہستی اور حیات بعد الموت سے قطعاً منکر ہے۔ ہٹے ہٹے سائنس دان بھی یہ محسوس کر رہے ہیں کہ نظامِ عالم کے دہرہ کوئی قوت کا فرما ہے۔ جسے وہ ذہنِ کامل (Master Mind) کے لقب سے پکارتے ہیں۔ کیونکہ انسان کی روح رواں بھی یہی (Mind) ہے۔ لیکن وہ نظروں سے پوشیدہ ہے۔ اس لئے یہ مسئلہ بھی ابھی سر نہایت راز میں اور سائنس ان کے عملی ثبوت کی تلاش میں ہے۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ سائنس ابھی کوئی رائے نہیں رکھتی۔ سائنس بغیر ثبوت کے کسی نظریے کو تسلیم نہیں کرتی۔ اس لئے علمِ تحقیق موت کی منزل تک محدود ہے۔ اس سے آگے آپ کا مذہب جانے یا کوئی فلسفی دماغ سوزی کرے مگر مجھے معلومات کا بہت اشتیاق ہے۔ اس لئے ان سوالات کا جواب جو مذہب یا فلسفہ کے پاس ہے۔ اس سے مجھے ضرور مستفید فرمائیں۔

انصرؔ دوسرے طریقے پر عمل کرنے والوں نے تین بنیادی نظریے دنیا کے سامنے پیش کئے ہیں۔ پہلا نظریہ سب سے قدیم ہے یعنی دنیا کئی دیوتاؤں کی ملکیت ہے اور کئی کاپیز کے وڈا کی طرح ہر ایک دیوتا کے ہاتھ میں دنیا کی سلطنت کی عنان ہے۔ مثلاً ہندو دھرم، جہادو، یو۔ ایم راج اور دیوتا۔ سرسوتی وغیرہ۔ دیوتاؤں کے وجود کو ماننا ہے اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے

نذرانے پیش کرتا ہے۔ اس عقیدہ کا ماننے والا یہ طرز زندگی اختیار کرتا ہے۔ اس کی ساری زندگی تو بہات کی نذر ہو جاتی ہے اور اس عقیدے کا انسان کسی دیوتا یا کسی تاریخی یا کسی غیر تاریخی ہستی کی پوجا کرتا ہے۔ اس کی قبر پر پھول چڑھاتا ہے۔ مسجد کے کتبے لٹکتے ہیں۔ قربانیاں پیش کرتا ہے۔ تاکہ یہ مردے اُس کی مدد کریں اور اس کو مصیبت سے نجات دلائیں۔ کس قدر مضحکہ خیز ہیں یہ عقائد! مگر بہات کی مفرط سے عقیدت مندوں کی کمی نہیں۔ ہندوستان میں ہزاروں مزار میں اور لاکھوں ان کا طواف کرتے ہیں۔ میں نے بڑی بڑی عجیب رسمیں ان مزاروں پر دیکھی ہیں جو بڑی دیکھی ہیں ان کے بیان کے لئے ایک کتاب چاہئے۔ اولیاء کو پکا سا جانا ہے کہ ان کی مدد کریں۔ میلے لگتے ہیں۔ رنج رنگ ہوتے ہیں۔ خراب لٹھکائی جاتی ہے۔ مگر زبان پڑیا صابر۔ یا خواجہ بہتتا ہے۔ چچے اور بڑے مشکون پر بھی یقین رکھا جاتا ہے۔ کہاں تک بیان کر دوں۔ ایسے تو ہم پرست انسانوں کی زندگی رسومات کی ناقابل شکست سلاسل بن کر رہ جاتی ہے جن سے وہ کبھی آزاد نہیں ہو سکتے۔ ایسے لوگ ریاکار اشخاص کے جھگڑدوں کا شکار رہ جاتے ہیں۔ اس طرح پیر اور پنڈت اپنا تسلط ان کے دلوں پر قائم رکھتے ہیں۔ مرید زندانے گزارتے ہیں۔ عورتیں اولاد کی طلب میں آتی ہیں اور با مراد واپس جاتی ہیں۔ اُن کے شوم فخر سے کہتے ہیں کہ فلاں پیر یا سادھو کی وعا سے ان کے گھر کا چراغ روشن ہوا ہے۔ عقل کے اندھوں کو اُن کا معلوم نہیں کہ اگر دعاؤں سے کام چلتا تو یہ ملاں اور پنڈت لوگوں کی خیرات پر نہ پلٹتے۔ اور یوں علم کی تحقیر نہ کرتے۔ مرے کی بات تو یہ ہے کہ یہ جیسا زلوٹ اپنا ایسا رعب جلاتے ہیں کہ بیچارہ مرید بھی سمجھتا ہے کہ اُن کو نذرانہ دینے بغیر سو رگ یا جنت نہ ملے گی اور نہ اس دُنیا میں کوئی مرادو برائے گی۔ ایک مثال اور مائیکل صاحب آپ کے سامنے موجود ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس ہوٹل کا مالک یہ نہیں سمجھتا کہ ہوٹل اس کی بدانتظامی کی وجہ سے نہیں چلتا۔ اُن کا اپنی قسمت کو کوستا ہے۔ اب دوسرے گروہ کی سنئے۔ ان کے خیال میں یہ واپنا پاپ کا گھر ہے۔ انسان کے رہنے کے لئے یہ جگہ موزوں نہیں ہے۔ راحت ابدی حاصل کرنے کے لئے وہ جھگڑوں اور پہاڑوں میں مارا مارا پھرتا ہے۔ یا کسی کٹیڈ میں جا گھسٹتا ہے۔ رات دن مالا چہتا ہے۔ اگر ان کا خدا یہ کہتا ہے کہ رات دن میری تخریب کیا کر دو تو ایسا خدا انسان سے

بھی بدتر ہے۔ انسان بھی رات دن اپنی تعریف سن کر عاجز آ جاتا ہے۔ عقیدہ مند بڑے ادب سے بیان کرتے ہیں کہ سادھو جی مہاراج بڑے پارسا ہیں۔ اب تک مجھ تو ہیں اور اکیلے جھگل میں ایک گھاس کی کلیا میں بیٹھے بیٹھے رام رام چپتے رہتے ہیں کبھی سیٹھا یا تھیمٹرو بیکنے نہیں جاتے۔ جھوٹ نہیں بیٹتے چوری نہیں کرتے۔ کسی عودت کو بڑی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ کیا کہنے ہیں ان کی پارسائی کے! مزا تو جب ہے کہ اس دنیا میں رہیں۔ شادی کریں۔ بچے پیدا کریں۔ اپنی روزی آپ کمائیں اور پھر ایسے ہی پارسا رہیں تو خدا کی قسم ان کی وہ عزت کروں کہ دنیا دہکتی رہے۔ اب سنتے تیرے گروہ کا حال یہ سب بے بازی سے جا چکے ہیں۔ دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ خدا ہر دے میں موجود ہے۔ انسان کی برکات اسی میں ہے کہ وہ اپنی خودی کو مٹائے اور قطرہ کی طرح فنا ہو کر سمند یعنی خدا کی ذات میں سما جائے۔ اس سے دوسرا خیال پیدا ہوا کہ جب کائنات کا کوئی ذرہ یا کوئی پتہ خدا کی مرضی کے خلاف جنبش نہیں کرتا۔ اس لئے انسان جو کچھ بھی کرتا ہے خدا کی مرضی سے کرتا ہے۔ اس کی تقدیر میں جو کچھ لکھا ہے۔ وہی ہوتا ہے۔ اس فلسفے کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ یعنی اگر آپ چوری۔ زنا یا کوئی اور گناہ کرنے کے سزاوار ہوئے ہیں تو اس میں عین خدا کی رضا شامل ہے۔ کیونکہ خدا کے حکم کے بغیر کوئی کام سرانجام نہیں پاتا۔ بڑا رنگیلا ہے خدا ان لوگوں کا جو کسی سے باز پرس نہیں کرتا۔

مائیکل : انصر صاحب، پھر آپ کون سے خدا کو مانتے ہیں۔ آپ کی نظر میں یہ تو ہات فلسفہ منطوق اور دلائل سمجھی ڈھکوسلے ہیں اور میں بھی آپ سے متفق ہوں۔ سائنس کی کسوٹی پر کھوٹا سنا تو کہا یہ نظریے پتیل اتنی وقعت بھی نہیں رکھتے۔

انصر : مائیکل صاحب! مجھے سائنس سے کوئی شکوہ نہیں۔ سائنس اپنے اصول پر قائم ہے وہ تحقیق کرنا چاہتی ہے اور اسے ایسا کرنا چاہئے۔ ورنہ سائنس سائنس نہیں رہتی مگر میرا قصداً مشورہ یہی ہے۔ اگر کسی سائنس دان کا ضمیر اس سے یہ کہتا ہے کہ انسان کی زندگی جاوداں ہے اس دنیا کا کوئی خالق ہے تو یہی بہتر ہے کہ وہ کوئی دین اختیار کرے اور اپنی تحقیقات ہمارا رکھے۔ تاؤ فلیک یہ ثابت نہ ہو چکے کہ خدا واقعی ہے یا نہیں۔ مگر جہاں تک میرا خیال پرواز کر سکتا ہے مجھے اس کے امکانات نظر نہیں آتے۔ یہ ایک سر بہتہ راز ہی رہے گا۔ اور اک نفس

کی تسکین کے لئے یہی بہتر ذریعہ ہے کہ مختلف مذاہب کا مطالعہ کیا جائے جو اپنے دل کو پسند
مذہبی راستہ اختیار کر لیا جائے۔“

مائیکل۔ دوسرے طریقے کا نتیجہ بھی ظاہر ہو گیا۔ اب تیسرے نظریے کی وضاحت آپ
ہی فرمائیں۔ گو میں نے بھی مذاہب کا مطالعہ کیا ہے مگر میں آپ کے خیالات معلوم کرنا چاہتا ہوں
میں کٹر قسم کے مذہبی لوگوں سے دور بھاگتا ہوں جو اپنے مذہب کے سوا دوسرے کی بات
سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔“

انصر۔ مذہب کی مثال تو یوں ہے کہ آپ کسی عذبی ملک میں ہیں۔ جہاں کی زبان اور رسوم
وغیرہ سے آپ قطعاً نواقف ہیں۔ آپ کو لازماً کسی گائیڈ یعنی رہبر کا سہارا لینا پڑے گا۔ جو آپ کو
تمام حالات سے آگاہ کر سکے مختلف مقامات کی سیر کر سکے۔ اسی طرح پیغمبر یا رسول عالمِ حقی کے
متعلق ہمیں آگاہ کرتے ہیں۔ ہمیں اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ نظریہ قابل قبول ہے یا نہیں۔ پہلا قدم یہ ہے
کہ رسول کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے اور ان کے اقوال و افعال کا موازنہ کر کے یہ دیکھا جائے۔ آیا
ان میں مطابقت ہے کہ نہیں۔ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ نبی (پیغمبر یا رسول رب کی زندگیاں پاکیزہ
مختص) اقوال و افعال میں یکجہتی تھی۔ دوسرا قدم یہ ہے کہ آیا ان کی ہدایات تعلیمات یا طرز زندگی
قابل عمل ہے کہ نہیں۔ زندگی کی حقیقتوں سے ان کا نظریہ کہاں تک دوچار ہو سکتا ہے۔ اور ان کا
طرز عمل اختیار کرنے والوں نے کیا نتائج پیش کئے ہیں۔ اگر اس سوال کا جواب تسلی بخش مل جائے
تو پھر اسے اپنانے میں کوئی دیر نہیں کرنی چاہئے۔ انبیاء فرماتے ہیں کہ یہ دنیا ایک حادثہ کی پیداوار
نہیں بلکہ ایک خدا کی تخلیق ہے۔ اس لئے وہی اس جہان کا مالک ہے۔ دنیا اس کی سلطنت
ہے اور تمام انسان اس کی رعایا ہے۔ انسان کا جسم اور اس کی ساری قوتیں خدا کی عطا کردہ ہیں
اس لئے انسان ان سے خدا کی مرضی کے موافق کام لے سکتا ہے۔ انبیاء خدا کی طرف سے انسان کو
کو زندگی کا طرز عمل سکھانے کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ اس لئے وہ رسول کہلاتے ہیں۔ رسولوں کے
اقوال ہیں کہ یہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے۔ اس دنیا کے اعمال ہی دوسرے جہان کی ابدی زندگی
یا عذاب کا پیش خیمہ ہیں۔ خدا آج تک مستور ہے مگر اس نے انسان کو یہ آواز دی عطا کی ہے کہ

وہ جو جی چاہے راستہ اختیار کرے۔ جو مگناہ کی بھی کوئی سزا دُنیا میں خدا کی طرف سے نہیں ملتی۔ ان تمام رعایات سے یہ دیکھنا مقصود ہے کہ خدا کی بن دیکھے کون اطاعت کرتا ہے۔ خدا ظاہر ہو جائے تو امتحان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس امتحان کا نتیجہ قیامت کے دن نکالا جائے گا اور انسانوں سے ہمیشہ و دوزخ آباد کرنے جائیں گے جہاں وہ ابدی زندگی بسر کریں گے۔ یہ ہے بنیادی عقیدہ جو دُنیا کے مختلف مذاہب اپنی تعلیمات میں پیش کرتے ہیں۔

ماتیکل فی الحال آپ اسلامی عقائد تعلیمات کی وضاحت فرمائیں۔ کیونکہ آپ اپنے مذہب کا حق و اقیقت رکھتے ہیں گے۔

انصر۔ اسلام عقیدہ کے مطابق خدا نے ہر زمانے اور ہر ملک میں وقتاً فوقتاً اپنے رسول بھیجے تاکہ وہ لوگوں کو محمد کے قانون کے مطابق زندگی میں عمل کرنا سکھائیں۔ انبیاء کے سپرد یہی فرض تھا کہ وہ خود خدا کے قانون پر عمل کریں اور خدا کی بادشاہت دُنیا میں قائم کریں۔ کیونکہ سب انسان خدا کی نظر میں برابر ہیں۔ اس لئے تمام انسانوں کو علم اور ہدایت دینا بھی اُس کے فرائض خداوندی میں شامل ہے۔ رسول عربی سے پہلے جنسے انبیاء آئے۔ ان کی ہدایت ایک محدود ملک اور قوم کے لئے تھیں۔ یہ ارتقائی منزلیں تھیں۔ بالکل اسی طرح جیسے گریجویٹ بننے کیلئے بتدریج تعلیمی منازل طے کرنا پڑتی ہیں۔ اس لئے ان کی تعلیم بھی وقت اور لوگوں کے شعوری معیار کے موافق تھیں۔ پھر وہ وقت آگیا کہ رسول عربی پیدا ہوئے اور انہوں نے خدا کے دین کی عمارت کو پائیدار بنانے تک پہنچایا۔ اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ حضرت محمد نے کوئی نیا دین دُنیا میں پھیلایا۔ یہ سلسلہ تو انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا۔ حضرت آدم پہلے انسان ہونے کے علاوہ پہلے نبی بھی تھے اور اس طرح دُنیا کے ہر کونے اور ہر زمانے میں کوئی نہ کوئی رہنا خدا کا پیغام انسانوں تک پہنچاتا رہا۔ رسول عربی اس سلسلے کی آخری کڑی تھے اور اس لئے آپ خاتم الانبیاء کہلاتے ہیں اور آپ کا دین مکمل کہلاتا ہے۔ کیونکہ وہ تمام فطری ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ زندگی کے تمام مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔ سچائی کبھی نہیں بدلتی۔ جھوٹ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ اس لئے سچائی کے یہ اصول رہتی دُنیا تک قائم رہیں گے۔ تاریخ اس بات

کی شاہد ہے کہ جس وقت آپ کا ظہور ہوا۔ اُس وقت دُنیا میں کئی دین موجود تھے مگر ان کی رُوح مُردہ ہو چکی تھی عیسائی کلیساؤں میں حضرت عیسیٰ اور مریم کے بتوں کی پرستش کرتے تھے اور رہنمائے دین روحانی گدی سنبھالے انسانوں پر شخصی حکومت کر رہے تھے۔ ہندوستان میں خدائے سچہ۔ بکڑی اور مٹی کی صورتیں اختیار کر لی تھیں۔ میران کے آتشکدوں میں آگ تو روشن تھی مگر لوگوں کے دلوں کی آگ کُچھ مچی تھی۔ دُنیا میں چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اُجالے کی سخت ضرورت تھی۔ اتنے میں ایک آواز عرب سے بلند ہو کر دُنیا میں چاروں طرف پھیل گئی۔

اے نبی! ایل کتاب کہہ دو کہ آدھم ایک بات پر متفق ہو جائیں یعنی ہم سوائے اللہ کے کسی کی عبادت نہ کریں۔ کسی کو اللہ کا شریک نہ بنائیں اور سوائے اللہ کے کسی کی اطاعت و عبادت نہ کریں انسانوں کے لئے اس سے بہتر اور کیا دعوت ہو سکتی تھی کہ تمام مذاہب مل کر ایک ہی مقصد کے لئے جدوجہد کریں۔ یعنی خدا کی حکومت قائم کریں۔ اسی مقصد کے لئے تمام انبیاء و نبیائیں بھیجے گئے تھے اس لئے مائیکل صاحب مذہب کا عناد تو ان لوگوں کے ساتھ ہے جو خدا کی ہستی سے منکر ہیں اور کسی خدائی قانون پر عمل نہیں کرتے۔ کس قدر افسوسناک حقیقت ہے کہ مذہب مذہب کے ہی ورپے ہے۔ ایک ہی خدا کے نام لیا آ پس میں مذہبی جنگ کرنے پُتلے بھٹے ہیں۔ مذہب کا مقصد کیا ہے۔ صرف یہی۔ انسانوں کو صحیح معنوں میں انسان بنانا۔ کیا کوئی مذہب یہ تعلیم دیتا ہے۔ کہ جھوٹ بولو۔ ڈاکے ڈالو۔ خون کرو۔ انسانوں کا خون چوسو۔ عیسائیت کی تعلیم ہے کہ اگر تمہارے گال پر کوئی ایک تھپڑ مارے تو دوسرا رخسار بھی آگے کر دو۔ بدھ، جین اور ہندو دھرم کسی جاندار چیز مثلاً چوہنی تک کو ہلاک کرنے سے منع کرتا ہے۔ اس کے پیروکار چوہنیوں کو آٹا بھی روز دلاتے ہیں۔ گوشت بھی نہیں کھاتے مگر سارا دن غریبوں اور بے کسوں کا خون چوستے ہیں۔ انسانوں کو نکل جاتے ہیں اور ڈاکا تک نہیں ملتے۔ کیا مذہب یہی سکھاتا ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں کو دیکھو مسجد میں جا کر نماز ادا کرتے ہیں اور عربی زبان میں اقرار کرتے ہیں کہ سوائے خدا کے ہم کسی کی عبادت نہیں کریں گے کسی کی اطاعت نہیں کریں گے۔ جھوٹ نہیں بولیں گے۔ مسکینوں یتیموں۔ رشتہ داروں اور ہمسائیوں کی خدمت کریں گے مسجد سے نکلتے ہی پھر وہی جھوٹا عود کرتا ہے۔ فریب دہی؛

کشت و خون کے منصوبے اور حاکم وقت کی خوشامد شروع ہو جاتی ہے۔ اس کی خوشنودی کے لئے سب کچھ کیا جاتا ہے۔ طرعیّت کی جگہ انگریزی قانون کو ترجیح دی جاتی ہے۔ کیا بیان کروں اللہ اکبر کہنے والے اس کے سوا کسی کے آگے نہ جھکنے کا اقرار کرنے والے بھی غلام ہیں۔ میرا تو خون کھوٹا ہے۔ کیا وہ جو کچھ زبان سے کہتے ہیں۔ اس کا مفہوم نہیں سمجھتے۔ یا پھر اتنے ہیست اخلاق ہو چکے ہیں کہ غیر کی غلامی پر فخر کرتے ہیں اور دعوے ہے کہ مسلمان ہیں۔ تو جید کے پرستار ہیں۔“

مائیکل۔ ایک ہی اللہ کی عبادت اور اُس کی اطاعت سے کیا مراد ہے؟ اپنے مذہب کے مصنوعی لمبواؤں کو کھڑی کھڑی مانتے ہیں۔ میں تو آپ خشک مگر باتیں پتہ کی کہی ہیں۔“

انصر۔ شکریہ! اچھا تو غور سے سنئے۔ لفظ اللہ کے معنی ہیں آقا کے۔ عربی میں اس کا ہم معنی لفظ ”مجید“ ہے۔ اسی ترکیب سے عبیدہ فرو ہے جو اپنے مالک یا آقا کا حکم بجالاتا ہے۔ عبادت ان تمام حرکات کا نام ہے جو ایک عباد ادا کرتا ہے۔ عبادت کے صرف یہ معنی نہیں کہ نماز ادا کر دی۔ نماز تو عبادت کی ظاہری صورت ہے۔ اصلی مقصد کی ترجمانی تو اس طرح ہوتی ہے۔ سیدھے کھڑے ہونا یعنی حکم بجالانے کے لئے مستعدی جیسے فوج میں سپاہی (ایٹینشن) ہوتا ہے۔ ہاتھوں کے باندھنے سے مراد احترام کرنا۔ رکوع اور سجدہ کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ عباد نے کلی طور پر اپنی ذات اور رغبات اپنے آقا کے لئے وقف کر دی ہیں۔ وہ خدا کا ہر حکم بجالانے کے لئے مستعد ہے اور اپنی جان تک کی قربانی سے دریغ نہیں کرے گا۔ یہ ہے عبادت کا مفہوم۔ اسی طرح رب کے معنی میں پڑش کرنے والا۔ پروردگار۔ ایسی ہستی جس سے اُس کی امیدیں وابستہ ہوں جس کی ناراضگی سے اسے خوف آتا ہو۔ جس کے دم و کرم پر زندگی کا انحصار ہو۔ ان معانی کو ذہن میں رکھنے اور پھر دیکھنے کہ انبیاء اور عام انسانوں کے نقطہ نگاہ میں کیا فرق ہے۔ انبیاء یہ جانتے تھے کہ انسان اللہ کو فقط اپنا اللہ اور رب قبول کرے۔ اللہ بحیثیت خالق صرف قابل پرستش ہی نہیں بلکہ فتاویٰ کل بھی ہے حاکم اور قانون ساز ہے۔ لیکن انسان اللہ کی ہستی کا قائل تو ضرور تھا اور اُس کی پرستش یا پوجا بھی کرتا تھا۔ مگر وہ عملی زندگی میں غیر اللہ کے بنائے ہوئے قوانین پر چلتا تھا۔ یہ غیر اللہ کون ہو سکتا ہے صاف ظاہر ہے کہ سوائے انسان کے کوئی جاندار۔ حیوان۔ درخت۔ سورج یا چاند خدائی کا

دعویٰ نہیں کر سکتا۔ یہ صرف انسان ہی ہے جو اللہ یا رب کی منزل تک پہنچنے کی سعی کرتا ہے۔ حرم ہوا اس کو دوسرے انسانوں پر تسلط قائم کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ جاہ و جلال اور حشمت و دولت کی تلاش اپنے بھمنوں کو غلامی کی زنجیریں پہناتی ہے۔ وہ آقا کہلو کر خوش ہوتا ہے۔ خدائی کے ایسے عویدوں کی دو قسمیں ہیں جو خدا کا نہ طریقہ اختیار کر لیتے ہیں پہلی قسم کے سخت ایسے اشخاص آتے ہیں۔ جن کے پاس دولت و قوت کی افراط ہوتی ہے اور اس کی وساطت سے وہ اپنی حکومت استوار کرتے ہیں۔ شہنشاہیت اور آمریت اس کی اونے مثال ہے۔ بادشاہوں پر ہی یہ خصوصیت موقوف نہیں بلکہ جو شخص بھی برسر اقتدار آتا ہے۔ تکرر، نخوت و غرور اس کو اکثر گراہ کر دیتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ایسے اشخاص خدائی کا حکم کھلا دعویٰ کریں۔ وہ ایسا کبھی نہ کہتے کہ ہم خدا ہیں مگر ان کے افعال ثابت کرتے ہیں کہ میں پر وہ کیا جذبہ کام کرتا ہے۔ فرعون نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ میں خدا ہوں۔ وہ بھی جانتا تھا کہ زمین و آسمان کا خالق وہ نہیں بلکہ کوئی اس سے بھی بالاتر قوت ہے مگر اس کے ذہن میں یہ بات نہ آسکی کہ مصر کے لوگوں پر اس کی حکومت کے سوا خدا کی حکومت کیسے ہو سکتی ہے۔ فرود نے بھی خدائی کا دعویٰ کیا تھا مگر اس نے بھی یہ نہیں کہا کہ میں تمام جہانوں کا رب ہوں۔ سوال تو یہ تھا کہ بابل کی رعایا کا رب کون ہے۔ فرود بھی یہ بات سمجھ نہ سکا۔ کیونکہ اس کو تو یہی معلوم تھا۔ کہ اس کی رعایا کی زندگی اور موت اس کے قبضہ قدرت میں تھی۔ جس کو چاہے عزت بخشے جس کو چاہے جان سے مروا دے۔ اس کا ہر لفظ قانون تھا اور کبھی کی مجال نہ تھی جو اس کے سامنے دم بھی مار سکے مگر جب حضرت ابراہیم نے جواب دیا کہ وہ سوائے اللہ کے کسی کی عبادت کرنے کے لئے تیار نہیں تو فرود ششدر رہ گیا۔ اس لئے رب ہونے کا دعویٰ تو کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ مگر فرعون اور فرود کی طرح انسانوں پر حکومت ضرور کرنا چاہتا ہے۔ یہ شہنشاہیت رب اور اللہ ہونے کا دعویٰ نہیں تو اور کیا ہے۔ چاہے زبان سے اس حقیقت کا اعتراف نہ کیا جائے۔

”ان معنوں میں تو کوئی مسلمان توحید کا پرستار ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔“ مائیکل نے کہا۔ اچھا تو دوسری قسم کے خدائی کے عویدار کون ہیں؟

انصر۔ دوسری قسم میں وہ لوگ شامل ہیں جن کے پاس اس قدر قوت و دولت نہیں ہوتی

جس کی مدد سے وہ حکومت قائم کر سکیں۔ اس لئے یہ گروہ دوسرے ذرائع استعمال میں لاتا ہے مثلاً ریکارڈری یا فریب دیمنی ان سے سادہ لوح انسانوں کو مسحور کرتا ہے۔ ایک کارگر اور سہل ترکیب تو یہ ہے کہ کسی قبر۔ روح۔ پُت یا دریا کے ساتھ ایسے معجزات منسوب کر دیئے جاتے ہیں جو لوگوں کی کشش کا باعث ہوتے ہیں اور کچھ عرصہ بعد یہی بے جان اور بے حقیقت چیزیں رب کا درجہ اختیار کر لیتی ہیں اور اس ٹھنک سے سپر اور مجاور۔ پنڈت اور پرہمت بیٹھا سادہ لوح انسانوں پر اپنا سکہ جما لیتے ہیں اور اس طرح حکومت کی بنیاد رکھ دی جاتی ہے۔ یہ سلسلہ خاندان، خاندان، چلا جاتا ہے۔ سماج و نشینوں، جنگاہوں کے مجاوروں۔ رُوم کے پاپلے، اعظم اور زندہ کے پنڈتوں کی بھی اصلیت ہے اگر آپ اس زاویہ نگاہ سے اس مسئلہ پر غور کریں تو یہ امر فنی نہیں رہ سکتا کہ انسان کے تمام مصائب کی جڑ یہی انسان پر انسان کی حکومت ہے چاہے بلا واسطہ یا بالواسطہ۔ اگر جبر منی میں مثلاً انسانوں کا رب تھا تو ان میں مسولینی۔ برطانیہ کے بنکوں کے ڈائریکٹر۔ اوپنچے گھروں کے لارڈ اور سیاستدان بھی پہلی قسم کے گروہ میں شامل ہیں۔ اس طرح نیویارک کی وال سٹریٹ کے چند سرمایہ دار امریکہ کی باگ ڈور سنبھالے انسانوں پر خدائی کر رہے ہیں جس طرف نگاہ اٹھاؤ۔ یہی منظر نظر آئے گا کہ ایک قوم دوسری قوم کی خدا ہے۔ یا ایک پارٹی دوسری پارٹی کے ساتھ اسی منصب کے لئے برسرِ پیکار ہے۔ انسانوں پر انسانوں کی حکومت کے نتائج آپ کے سامنے ہیں۔ پہلی حقیقت تو یہ ہے۔ جب ایک دفعہ حکومت۔ آمریت یا شہنشاہیت کی شراب کا ایک جام پی لیتا ہے تو پھر وہ ہوش میں نہیں رہتا۔ یہی سبب ہے کہ جہاں بھی انسان نے افسانہ پر حکومت قائم کی۔ وہاں وہ رعایا میں عدل و انصاف اور انسانی زندگی میں توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ سوائے حکام اور خوشامدیوں کے کوئی اپنی ٹیکمیل خودی نہ کر سکا۔ آزادی اور حصول مقصد کی دشمنی یہی شہنشاہیت ہے۔ اور اس کا علاج یہی ہے کہ ان ہر دو قسم کے خدائی و خدایوں اور ربانیت کے ٹھیکیداروں سے آزادی حاصل کر کے مالک حقیقی اور حاکم اعلیٰ یعنی صرف خدا کی اطاعت کی جائے۔ نجات کا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ کیونکہ اگر کوئی انسان دہریہ اور مادہ پرست بھی ہو جائے تو دُنیا کے خداؤں کے چنگل سے نہیں بچ سکتا۔ اطاعت اور عبادت تو اسے بہر حال کرنی پڑے گی۔ اللہ کی ذکر سے گاتو حکومتِ وقت کی کرنی پڑے گی۔ یہ تھا بنیادی مصلحی

تشریح انبیاء کرتے آئے تھے۔ ان تمام رسولوں کا نصب العین تھا۔ انسان پر انسان کی حکومت کا خاتمہ۔ اس لئے ان کا ایک ہی پیغام تھا۔ اے لوگو صرف ایک اللہ کی عبادت اور اطاعت کرو حضرت ابراہیمؑ حضرت اسماعیلؑ حضرت سلیمانؑ حضرت عیسیٰؑ حضرت موسیٰؑ اور دوسرے پیغمبر اسی مقصد کے لئے دنیا میں بھیجے گئے تھے۔ یہی رسول عربی کا پیغام تھا۔ اے رسول! تمام انسانوں سے کہہ دو کہ آؤ ہم سب اس بات پر متفق ہو جائیں جو ہمارے سب کے درمیان مشترک ہے۔ یعنی سوائے خدا کے کسی کی عبادت نہ کریں۔ یہ تھا تمام انسانوں کی آزادی کا پر دانہ!

مائیکل: انصر صاحب یہ تو بجا ہے کہ خدا خالق ہونے کی حیثیت سے حکومت کرنے کا بھی مجاز رکھتا ہے۔ مگر آپ کے بیان کے مطابق اللہ کی اطاعت اور عبادت پر پڑا زور دیا گیا ہے کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ اللہ بھی انسانی فرما زواؤں کی طرح۔ تعریف و توصیف، خوشامد اور حکومت کی خواہش رکھتا ہے۔ کیا وہ ہم سے تخلیق کرنے کا صلہ چاہتا ہے۔ یہ تو تمہارے اللہ کے شایان شان نہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر انسانی شہنشاہیت اور اللہ کی بادشاہت میں کیا فرق رہا؟

انصر: آپ کا اعتراض معقول ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ خدا ان تمام خواہشات سے بے نیاز ہے۔ وہ تمام کمزوریوں سے بالاتر ہے۔ کیونکہ وہ جہانی وجود نہیں رکھتا۔ وہ انسان کی طرح تو ہے نہیں۔ کہ اس کو رام رام یا اللہ اللہ کہہ کے بہلا لیا۔ اگر ایسا ہوتا تو بازادوں میں اپنے جسم کو گھسیٹ گھسیٹ کر رینگنے والے اور رام رام کہنے والے برائے نام انسان یوں مفلس و نادار نہ رہتے۔ وہ خدا جس کو انصاف و رحمدلی کا سرچشمہ تصور کیا جاتا ہے۔ کیا وہ اس نظام سے متاثر نہیں ہوتا۔ عقیقت مند اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ ان غریبوں کا دھم دینا میں اس لئے برقرار ہے تاکہ انسانی ہمدردی، سخاوت اور رحمدلی کا امتحان کیا جا سکے۔ فقیر کے روپ میں خدا ہاتھ پھیلاتا ہے تاکہ اپنے بندوں کا امتحان لے اور اس کے حوض و ندر یا جنت عطا کرے۔ واہ کیا فلسفہ ہے۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری۔ اس بات پر غور کیا کریں۔ کیا یہ وہی فلسفہ نہیں جس کا میں نے توہمات پر گفتگو کرتے ہوئے ذکر کیا تھا۔ کہ دنیا نہت سے دیوتاؤں کی ملکیت ہے اور ان کی ذاتی

خوشنودی اور ناراضگی پر انسانوں کی مسرت کا انحصار ہے۔ مذہبی رہنماؤں نے بھی خدا کو ایک دیوتا یا کسی درویش کا مزار بنا کر رکھ دیا ہے کہ اس کا نام جپتے رہو۔ پوچھا کرتے رہو۔ نمازیں پڑھتے رہو۔ دعائیں مانگتے رہو تاکہ تم دونوں جہانوں میں خوش رہو۔ ایسا کرنے والوں کو سورگ یا جنت ملے گی۔ اور ایسا نہ کرنے والوں کو جہنم یا ننگ میں وحلیل دیا جائے گا۔ یہ نو بچوں کا کھیل ہوا مگر کھلونوں اور مٹھائیوں سے بچے ہی بہل سکتے ہیں۔

جنت کی پیش کش سے نادانوں کو لالچ دیا جاسکتا ہے۔ ان کو جہنم کا خوف دلا کر راہِ راست پر لایا جاسکتا ہے۔ مگر مجھ سے خشک طبع یا آپ جیسے سائنسدانوں کے لئے جو ہر چیز کو حقیقت کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتے ہیں۔ یہ طفلِ تسلیم کسی کام نہیں آسکتی۔

مائیکل: تو پھر آپ کے خیال میں خدا کی عبادت و اطاعت کا کیا مفہوم ہے؟

انصر: خدا کی عبادت سے یہ مراد ہے کہ ہر انسان کی زندگی کا دستور عمل خدا کی مرضی کے

موافق ہو۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا۔ سونا کھانا پینا۔ عشق و محبت کرنا۔ دوسرے انسانوں سے سلوک

کرنا۔ مختصر یہ کہ انسانی زندگی کی اونے اسے لے کر اعلیٰ حرکات تک سبھی اللہ کے قانون کے مطابق

ہوں۔ وہ قانون کونسا ہے۔ اس کی وضاحت پھر کروں گا۔ فی الحال یہ ذہن نشین کرنا ضروری ہے

کہ اللہ سے تمام نیکیاں اور خوبیاں منسوب ہیں۔ وہ سچائی اور اچھائی کا سرچشمہ ہے اور اسی طرح

شیطان بھی کوئی جسمانی وجود نہیں رکھتا۔ وہ کوئی شخص تو ہے نہیں جو اگر انسانوں کو بدی

کی طرف مائل کرتا ہے۔ شیطان کے ساتھ تمام بدیاں منسوب ہیں نیکی اور بدی کے محبتوں کی

خلق انسانی دھن کی اپنی اختراع ہے۔ مذہب تو ان چیزوں کو بطور استعلاء استعمال کرتا ہے

لیکن نادان ان کو حقیقتِ تصور کرتے ہیں۔ ان کا شعور اتنا بلند نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر پاسی

جب چوک میں کھڑا ہوتا ہے تو سب بائیں ہاتھ چلتے ہیں۔ یہ تو ظاہری فعل ہے مگر اب چلنے والوں

کی نفسیات کا مطالعہ کیجئے۔ نادان یا کم سمجھ انسان اسے ایک قانون سمجھ کر اس بدایت پر عمل پیرا

ہوتا ہے کہ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو جو ماز کا مستحق ہوگا۔ مگر ایک سمجھ دار انسان اس قانون کے

مقصد کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ یعنی اپنے ہاتھ چلنے سے ایک دوسرے سے تضاد مدام کا امکان

جاتا رہتا ہے اور یہ قانون اس کی اپنی بھلائی کے لئے ہی نافذ کیا گیا ہے۔ اگر سب کو آزادی ہوتی کہ جس طرح اس کا دل چاہے وہ چلے۔ تو بس کوئی شخص بھی حادثات سے دوچار ہوتے بغیر نہ رہ سکتا۔ اس لئے سپاہی کی غیر موجودگی میں بھی ایک سمجھدار انسان اپنے ہی ہاتھ پر چلے گا۔ اگر ایسا موقع یا وقت ہے کہ کوئی آمد و رفت نہیں تو وہ اس کے برعکس بھی عمل کر سکتا ہے۔ مقصد تو صرف اس قدر ہے کہ اپنی جسم و جان کا تحفظ ہو اور کبھی دوسرے انسان کی ذات کو بھی نقصان پہنچنے کا احتمال نہ ہو لیکن ایک نادان انسان دوسرے نظر دوڑاتا ہے کہ کوئی سپاہی چورستہ پر موجود ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے تو پھر عجلت کے ساتھ دعائیں مانگنے کی طرف سے گزرنا چاہتا ہے اور حادثہ سے اکثر دوچار ہو جاتا ہے۔ قانون الہی بھی یہی حقیقت پیش کرتا ہے۔ اللہ یہ نہیں چاہتا کہ انسان جو اس کی تخلیق کا شاہکار ہے جسے دنیا میں اس نے اپنا داسرے یا نائب بنا کر بھیجا ہے۔ ایسے راستے اختیار کرے جو انسان کے شایان شان نہ ہوں۔ ایسے افعال کا مرتکب ہو جس سے خالق کی مذلیل ہو۔ یا مذہبی اصطلاح میں وہ شیطان کا پیروکار بنے۔ نفسانی خواہشات کو ذلیل طریقوں سے پورا کرے۔ اس لئے اس نے انبیاء اور سیدائے نبی بھیجے تاکہ انسانوں کو صحیح طریقہ سے آگاہ کرنے رہیں۔ ان کو اس کا فرض یاد دلانے رہیں۔ کیونکہ یہ بات قسطے شدہ ہے کہ اگر کوئی بھی انسان خدا کے بتائے ہوئے طریقوں پر عمل نہیں کرنا چاہتا تو پھر وہ یہ علم کہاں سے دستیاب کر دیکھا لازمی امر ہے کہ یا وہ خود کوئی طریقہ اختراع کرے گا۔ یا کسی دوسرے انسان کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن ہوگا۔ اس کے علاوہ تو کوئی اور صورت ممکن نہیں۔ اگر انسان اپنی ذات کو رہنا جانتا ہے تو خود غرضی اسے اسطیت سے دو ملے جائیگی۔ انسانی نفس تو یہی مشورہ دیتا ہے کہ خوب عیش و عشرت کر دے مگر کیا کہ میں نے اپنے نظریہ محسوساتی میں اس کی وضاحت کی تھی اور اگر وہ دوسرے انسان کا سہارا لیتا ہے تو وہ بھی خطروں سے خالی نہیں۔ کیونکہ وہ بھی اس جیسا کمزور انسان ہے۔ اس لئے اس ہدایت کا اللہ ہی ایک ایسا سرچشمہ ہو سکتا ہے۔ اس قانون زندگی کا جو تمام انسانی آلائشوں سے پاک ہو جو سچائی کے اصولوں پر واضح کیا گیا ہو۔ ایسا راستہ جس میں سب انسان اپنی تکمیل بخوبی کر سکیں۔

مانیکل :- تو گویا اس کے معنی ہوئے کہ اللہ کی اطاعت و عبادت میں انسان کی اپنی ستر تو

کارا ز مضر ہے۔ خدا کے قانون پر چلنے میں اس کی اپنی فلاح و بہبود پہناں ہے۔

انصر :- بالکل نہیں۔ آپ عبادت کا مفہوم تو سمجھ چکے ہیں۔ یہ تو تصویر کا ایک رخ تھا۔ اب دیکھتے

دوسرا رخ جو عوام کے خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔ مسجدوں میں بڑی خوش الحانی سے قرآن پڑھا جاتا ہے۔ نمازوں میں تلاوت ہوتی ہے۔ اللہ حکم و نسا ہے کہ کسی سے بے انصافی نہ کرو۔ بتیوں اور مسکینوں

کا مال ہضم نہ کرو۔ چوری نہ کرو۔ زنا نہ کرو۔ لڑکیوں کو بھی اپنی جانداؤں سے ایک حصہ دو۔ زکوٰۃ ادا کرو۔ مندروں اور کلیساؤں میں گیت اور رشوک گائے جاتے ہیں کہ کسی حیوان۔ جاندار اور انسان

کو دکھ نہ پہنچاؤ۔ معاف کرو دنیا خدائی صفت ہے۔ کسی سے بدلہ لینے کی فکر نہ کرو۔ مجرم کو معاف کر دو اسی طرح سکھوں کے گرنہ۔ پارسیوں کے زندوستان اور جینیوں کے شاستر خوش الحانی سے پڑھ پڑھ کر

سناتے ہیں بمولوی۔ پنڈت۔ گرنھی اپنی اپنی مسندوں پر بیٹھے ہر وقت یہی رٹ لگاتے رہتے ہیں۔ لیکن ان کا عمل کیا ہے۔ ایک گالی دے کر دیکھ لیجئے۔ مجھے ایک مختصر افسانہ کبھی نہیں بھولتا۔

اس طرح ہے۔ پادری وعظ کر رہا تھا کہ انسان کو معاف کر دینا چاہئے۔ ہر سب سے اعلیٰ طریقہ ہے انصاف کرنا اور سزا دینا یہ خدا کے کام ہیں۔ ایک نادان نے خدا کو گالی دی۔ پادری چپ ہا

نادان نے پادری کو گالی دی۔ پادری نے تھپڑ کھینچ مارا۔ مانیکل واہ واہ کر اٹھا۔ انصر نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ انہیں لوگوں نے تو مذہب کو بدنام کر رکھا ہے۔ مذہب

کی روح رواں کو نہ خود مجھے نہیں نہ دوسروں کو سمجھا سکتے ہیں۔ ان کی نظریں تو اس بات کا جائزہ

لینی رہتی ہیں کہ فلاں مسلمان نے ڈاڑھی منڈائی ہوئی ہے۔ نوہ کوٹ تپوں پہنتا ہے۔ سر پر ہیٹ رکھتا ہے۔ فلاں بیکہ واڑھی اوکیس نہیں رکھتا۔ فلاں جینی انڈے کھاتا ہے۔ آپ ذرا غور کریں کہ

ان چیزوں کا اخلاق سے کیا تعلق۔ مذہبی اعتقاد سے کیا واسطہ۔ اپنی اپنی پسند ہے۔ ہیٹ بڑی کاٹا چیز ہے۔ آنکھوں اور گردن کو دھوپ سے بچاتی ہے۔ ٹوپی اور بگڑھی ہیٹ سے خوبصورت چیز

ہے۔ سرویوں میں ٹوپی یا بگڑھی پہنو۔ گرمیوں میں ہیٹ پہنو۔ سوٹ سرویوں کے لئے بہترین لباس ہے۔ خوب پہنو۔ اچھے اچھے سوٹ گرمیوں میں دھوتی اور ملل کے کرتے بھی پہنو۔ اچھے

مذہب کے بانی کا اس قدر احترام کرتے ہو۔ شوق سے کرو۔ ان کی تقلید کرو۔ دائرہ ہی اور گیمو بھی پسند ہیں تو شوق سے رکھو مگر جو نہیں چاہتے۔ ان کو مجبور نہ کرو۔ ان کو بُرا کیوں کہو۔ ہاں ان کے اخلاق خراب ہیں تو ان کی اصلاح کرو اور اصلاح کرنے سے پہلے خود اخلاق کی بہترین مثال بن کر دکھاؤ۔ لوگ تمہیں دیکھ کر خود بخود سدھ رہ جائیں گے۔ انڈیا کی بہترین غذا ہے۔ آپ اپنی صحت کو بہتر نہیں بنانا چاہتے نہ سہی۔ انڈسے تو آج کل ویسے بھی نہیں ملتے۔ مگر مجھے کھانے دیجئے۔ مجھے آپ کے نہ کھانے پر کوئی اعتراض نہیں۔ ان مذہبی دیوانوں کی تو یہ مثال ہے کہ ایک بادشاہ کے بشپار نوکر اور غلام ہیں دست بستہ اس کے دربار میں کھڑے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ جاؤ میرے دشمنوں اور فحش لفظوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دو۔ شاہی نوکر دیں کھڑے رہتے ہیں شش سے مس نہیں ہوتے اور بڑی خوش الحانی سے آواز لگاتے ہیں کہ سلطان کے سلطان۔ زمین و آسمان کے مالک عدل و انصاف کے بحر و خاریہ حکم دیتے ہیں کہ ان کے دشمنوں اور فحش لفظوں کا صفحہ ہستی سے نشان مٹا دیا جائے۔ آداب بجا کہ پھر دست بستہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیا کسی دنیاوی فرمانروا کے ساتھ یہ سلوک اختیار کیا جاسکتا ہے ہرگز نہیں وہ کان پکڑ کر باہر نکال دے گا کہ مجھے ایسے ملازموں کی ضرورت نہیں۔ لیکن سوچئے یہ مذہب کے اجارہ دار بھی یہی طرز عمل اختیار کئے ہوئے ہیں کہ نہیں؟ گاگا کہ خدا کا کلام پڑھتے ہیں۔ یہ گیت نہیں بلکہ زندگی کے قوانین ہیں۔ یہ آسمانی کتابیں طاق کی زینت بنانے کے لئے نہیں بھی گئیں زندگی حرکت کا نام ہے۔ زندگی اعمال سے بنتی ہے افعال سے نہیں۔ علامہ انبال کا ایک مصرع ہے۔

— عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی۔

مائیکل : انصر صاحب ذرا اس امر کی وضاحت فرمائیے کہ حیب تمام انبیاء یا بابائانِ مذہب کا مقصد ایک ہی رہا ہے یعنی سوائے خدا کے کسی کی اطاعت نہ کرنا تو پھر مختلف مذاہب کے پیروکار آپس میں کیوں دست درگیاں ہیں؟

انصر : اس مذہبی جنگ و جدال کی ایک ہی وجہ ہے۔ حوام دین اور شریعت کے الفاظ کے معنی سے لاعلم ہیں۔

دین کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً حکومت۔ عزت۔ اطاعت۔ غلامی۔ انصاف

کرنا اور اعمال کے مطابق سزا و جزا دینا۔ قرآن میں یہ لفظ ان تمام معانی کی ترجمانی کرتا ہے جو مختصر طور پر اس کا یہ مطلب نکلتا ہے کہ تمام تشائش اور حکومت صرف خدا ہی کے لئے ہے۔ انسان کی زندگی خدا کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق بسر ہو۔ انسان سوائے خدا کے اور کسی سے خوف نہ کھائے اور خدا کو اپنے اعمال کا منصف جانے نہ اگر آپ لفظ دین کو اس روشنی میں دیکھیں تو یہ بات بالکل سچے ہو جاتی ہے کہ تمام مذاہب کے رہنماؤں کا ایک ہی دین تھا یعنی اللہ کی اطاعت اس فیصلہ کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اطاعت کا طریقہ کیا ہے مسئلہ شریعت کے معنی ہوئے زندگی کا راستہ یا طرز عمل یہ علم انبیاء کی دست سے انسان تک پہنچتا رہا۔ دین ہمیشہ سے ایک تھا اور ایک ہی رہے گا مگر قوانین ہر نبی کے ساتھ بدلتے رہے۔ یعنی شریعت ہر رسول کی جدا گانہ ہے مختلف زمانوں میں ان قوانین میں ترمیم کا عمل جاری رہا۔ لیکن دین میں بال برابر بھی فرق نہ آیا۔ اسی لحاظ سے تمام انبیاء مثلاً حضرت ابراہیمؑ، سلیمانؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خدا کا دین ایک ہی تھا مگر شریعتوں میں معمولی سا اختلاف تھا مثلاً نماز، روزہ، نکاح، طلاق اور وراثت وغیرہ کے متعلق الہی احکام میں کچھ فرق تھا مگر اصول وہی تھے۔ اس لئے اسلامی عقیدے کے مطابق وہ تمام کے تمام مسلم تھے مسلم کے لفظی معنی یہ ہیں۔ فرمانبردار۔ جو لوگ بھی ان رسولوں کے کہنے کے مطابق ایمان لے آئے وہ مسلم یعنی اللہ کے فرمانبردار کہلائے۔ شریعت کے اختلاف کی یہ مثال ہے کسی بادشاہ کے بیٹا کو کہیں جو اپنے آقا کے احکام کی تعمیل کے لئے مستعد رہتے ہیں۔ ان کے ذمے مختلف فرائض ہیں۔ ان کی فرمانبرداری کے طریقے جدا گانہ ہیں کسی ملازم کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ صرف وہی آقا کا تابعدار ہے۔ البتہ جو اس کے آقا کو بادشاہ ہی تصور نہیں کرتا۔ اس کی اطاعت کا شکوہ ہی بے بنیاد ہے۔ اسی طرح مختلف رہنمائے دین مختلف طریقے بتاتے رہے۔ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں یہ تمام سابقہ قوانین منسوخ کر دیئے گئے اور نئے قوانین کا اجرا ہوا۔ کیونکہ خدا نے انہیں مکمل کر دیا تھا۔

ما تبیکل۔ اسلامی شریعت کی بھی تو ذرا وضاحت فرمائیے ؟

النصرہ اسلامی تعلیم کے مطابق ایک مسلم کا فرض ہے کہ وہ تمام رہنمائے دین اور دینی کتابوں

کو جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نازل ہوئی ہیں۔ ان کو برحق تسلیم کرے اور کسی بھی شریعت کے پیروکار کو برا نہ کہے۔ اللہ قرآن میں فرماتا ہے کہ کسی بھی انسان کے جھوٹے خدا کو کالی ندوہ نہ مانہ کہو کیونکہ اگر تم اس کے جھوٹے خدا کو کالی دو گے تو وہ تمہارے سچے خدا کو کالی دے گا۔ اس لئے اسلام تو رواداری سکھاتا ہے اور انسانیت کا درس دیتا ہے۔ دیوتا بننا تو آسان ہے۔ لیکن مکمل انسان بننا مشکل کام ہے۔ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایک انسان تھے۔ دیوتا یا افنا نہیں تھے۔ انسان کے لئے ایک مکمل انسانیت کی مکمل مثال قائم کی۔ اور یہی آپ کی سب سے بڑی خوبی ہے۔“

مائیکل۔ ”یہ سب کچھ سچا آپ نے فرمایا۔ مگر رواداری کا مطلب مجھے واضح طور پر سمجھائیں۔ فرض کرو ایک عیسائی یا یہودی اپنے اپنے نبی کو برحق جانتا ہے مگر دوسرے مذاہب کے انبیاء کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے متعلق اسلام کیا کہتا ہے۔“

انصر۔ ”اتنا تو ذہن نشین ہو گیا ہو گا کہ ایک مسلم کے لئے تمام انبیاء پر ایمان لانا نہایت اہم ہے۔ اپنے نبی کو سچا سمجھنا اور باقی راہنمائے دین کو جھوٹا جاننا دین کی توہین ہے۔ جو مذہب یہ کہتا ہے وہ اپنی ترویج و پوشش کرتا ہے۔ اس کی مثال میں پہلے بھی دے چکا ہوں۔ ایک نوکر اپنے آقا کے حضور میں دست بستہ کھڑا ہوتا ہے۔ دوسرا نوکر اسی آقا کا قصیدہ کہتا ہے۔ تیسرا لگا کر آقا کی تعریف کرتا ہے۔ طریق بدل جانے سے آقا تو نہیں بدل جاتا۔ آقا کا حکم ہے شادی کرو۔ میں زنا کی اجازت نہیں دے سکتا۔ ہر ایک نوکر مختلف طریقوں سے شادی کی رسم ادا کرتا ہے۔ اس سے آقا کے حکم بجالانے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اگر ایک نوکر دوسرے کو الزام لگائے کہ اس کا طریقہ آقا کو پسند نہیں ہے تو یہ اس کی زیادتی ہے۔ آقا خود ہی اس کا فیصلہ کرے گا۔ جس سے وہ خوش ہو گا اسے زیادہ انعام عطا کرے گا۔ یہ ایک سیدھی سی بات ہے مگر تعصب نے آنکھوں پر ٹیپی باندھ رکھی ہے۔ کاش اس بچی کو اتار کر پھینک دیا جائے۔ مذہب کے ٹھیکیدار تو یہ درس دیتے ہیں کہ اگر کوئی ان کا بتایا ہوا راستہ اختیار نہ کرے گا تو وہ جہنم رسید کر دیا جائے گا۔ بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ تنہا را خدا سے کیا رشتہ ہے۔ ایسے بھی چند ایک مذہب ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ جنت کے حصول کیلئے

چند عقائد کا تسلیم کرنا نہایت ضروری ہے جس کے بغیر وہ جنت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ مثال کے طور پر آپ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ حضرت عیسیٰ اس لئے دار پر کھینچے گئے تاکہ اسکی بھیڑوں یعنی پیروکاروں سے کوئی گناہ کی باز پرس نہ ہو۔ یعنی ایسے تمام گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا گیا ہے اور اس لئے وہ نجات پا گئے ہیں۔ ایک حقیق یا سائنسدان یا کوئی بھی۔

صحیح الذراغ انسان اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ حضرت عیسیٰ نے کبھی نہیں فرمایا ہو گا مگر اس کے پیروکاروں نے مذہبی تبلیغ کی خاطر یہ حربہ اختیار کر لیا کہ اگر ہمارے مذہب میں داخل ہو کر اس عقیدہ کو تسلیم کر لو تو اس ہمیشہ کے لئے نجات تمہاری ہے جتنے چاہو گناہ کر لو۔ اس پادری کے روبرو اقبال کر لینے سے پھر وہی بھڑے معصوم بھڑے جاؤ گے۔ اس کا مطلب یہ ہوا۔ مائیکل۔ یا شام لال یا آپے جتنی بھی نیکیاں کریں۔ وہ سب اکارت کہیں۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ آپ لوگوں میں ان مذہبی دیوانوں سے کہیں زیادہ انسانیت ہے۔ پس اسی بات پر جنت کے دروازے ہم لوگوں پر بند ہو گئے۔

مائیکل۔ انصر صاحب ہمیں کوئی شک نہیں جنت میں آخر رکھا گیا ہے۔ ہزاروں برس کی بڑھی ہوئی ہوں گے۔ جہاں یہ کثرت اور متعصب پادری، پنڈت یا مولوی ہوں گے۔ اس کے برعکس بہنم میں دنیا کی تمام حسین خورتیں مثلاً ڈو پٹہ۔ پیڈی بیا۔ دنیا کے تمام ادا و شہزادے مثلاً چچا غائب (کیونکہ شراب بہت پیتے تھے) سائنسدان، مصور اور انجینئر بھی وہاں ہوں گے۔ خوب چٹل بریگی "ہمدیا راں دوزخ ہمدیا راں جنت" اور ہاں انصر صاحب آپ کا جنت کے متعلق کیا خیال ہے؟ انصر۔ آپ کو یاد ہو گا۔ میں نے اپنے بائیں ہاتھ چلنے کی مثال میں ذکر کیا تھا گناہ کے ارتکاب کی روک تھام کے لئے دوزخ اختیار کئے جاتے ہیں۔ انعام اور سزا۔ یہ تو بے ظاہری صورت۔ مگر نیکی اصل وہی ہے جو نیکی سے محبت کا نتیجہ ہو۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے

اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

اس لئے ایک سچا مسلم تو عشق خدا اور عشق رسول میں اپنے محبوب کی خوشنودی کے سوا اور کسی چیز

کا طالب نہیں۔ باقی رہا جنت کے تخیل کے متعلق تو میری رائے میں جنت سے مراد ایک ایسی دنیا ہے جہاں دنیا کے سب سامان عیش و راحت ہتیا ہوں گے مگر وہاں دنیاوی تمنیاں نہ ہوں گی۔ مثلاً شراب ہوگی مگر دنیاوی شراب کے برے اثرات سے بالکل مبرا ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ ہر چیز مکمل اور بے عیب ہوگی۔ قرآن فرماتا ہے کہ ”جنتی آپس میں دماں کی چیزوں کو دیکھ کر یہ کہیں گے کہ یہ تو بالکل ایسی ہی ہیں جیسی کہ ہم دنیا میں دیکھا کرتے تھے اور وہاں وہ تمام مستحق بیسیر کی جائیں گی جن کی ایک جنتی خواہش کرے گا“ ان اشاروں سے مطلب واضح ہے کہ جنت ایک مکمل منہام مسرت ہوگا۔ دوسریوں کا وہ صحیح معنوں میں اگر تمام انسان انسان بن جائیں۔ خدا کی برائے نام اطاعت کا دھوکے کرنے والے سچے مسلم یعنی خدا کی فرمانبرداری کریں تو دنیا ابھی جنت میں تبدیل ہو جائے۔ جنت و جہنم میں اسی انسانیت کا فرق ہے اور یہی وہ پہل صراط ہے جو بال سے بھی زیادہ باریک ہے جس پر سے گذر نہ کے بعد جنت قدموں میں ہوگی۔ اگر پھسلے تو جہنم کی گہرائیوں میں جا گریں گے۔ عقلمند کو اشارہ کافی ہے۔ ذرا غور کیجئے اگر اس وقت کے لوگوں کو یہ کہا جاتا کہ جنت ایک ایسی جگہ ہے جہاں سینما یا ریڈیو ہوں گے۔ اور ہوائی جہاز اور موٹریں ہوں گی تو کوئی بھی نہ سمجھتا۔ حالانکہ ان چیزوں کے بغیر جنت مکمل نہیں ہو سکتی چلنے کی نہیں ہوں گی۔ کیونکہ میں تو وہ دھم نہیں کر سکتا۔ شہد کی نہر بھی کوئی خاص چیز نہیں۔ شراب البتہ کچھ کام کی چیز ہے اور حوروں کا کیا ہی کہنا۔ اس لئے عربوں کو وہی چیزیں پیش کی گئی۔ جو ان کے لئے دلائل ثابت ہو سکتی تھیں۔

مائیکل : مجھے آپ سے پورا اتفاق ہے۔ اب آئیے اصلی موضوع پر۔ مذہبی رواداری کے متعلق کچھ فرمائیے۔

انصر : زیادہ تو کیا کہوں۔ قرآن تو صاف اعلان کرتا ہے۔ ”بلاشبہ وہ لوگ جو ایمان لائے یعنی مسلم یا یہودی یا عیسائی جو خدا کے واحد ہونے پر ایمان رکھتے ہیں اور روز قیامت پر یقین رکھتے ہیں۔ نیک اعمال کے مرتکب ہوتے ہیں۔ بیشک ان کو اپنے رب کی طرف سے بہت انعام ملے گا۔ ان کے لئے کوئی تکلیف، کوئی خطرہ یا کوئی خوف نہ ہوگا۔“

مائیکل : ایسی تعلیم سے تعصب رکھنا تو میرے خیال میں بے انصافی ہے مگر میرے خیال میں

قصہ خود مسلمانوں کا ہے جو غلط مثال پیش کرتے ہیں۔

انتہا رونا تو یہی ہے۔ ورنہ ایک وہ وقت تھا کہ لوگ مسلمانوں کے اخلاق کو دیکھ کر خوشی سے مسلمان ہو جاتے تھے۔ مذہب کا مقصد بھی یہی ہے۔ لاکھوں اور کروڑوں برائے نام مسلمانوں سے چند سچے مسلمان بہتر ہیں۔ ہندوستان کے چالیس کروڑ انسانوں پر دو چار کروڑ انگریز حکمرانی کرتے ہیں۔ ایک مخلص انسان اگر چاہے تو دنیا کی تاریخ بدل سکتا ہے۔ ہندو اور مسلمانین کی مثال ہی لیجئے۔ دس کی حالت ہندوستان سے بھی بدتر تھی۔ لیکن آج وہ امریکہ سے بھی سبقت لے جانے کی سعی کر رہا ہے۔

اتنے میں سینما کا وقت ہوا۔ محفل کل پراٹھا دی گئی :

ساتواں باب

اسلامی ریاست، حکومت الہیہ اور

خلافت

ہمارے شہر میں بھی مسلمانوں نے ہڑتال کر رکھی تھی۔ سو اُنے دیکھ کر تمام مسلمانوں کی دعا کاٹیں۔ بندھنیں میں رستوران کے بند دروازے کی طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی قیدی جیل سے رہا ہو کہ اس کے دروازے پر کھڑا سوچ رہا ہو کہ اس کے بعد وہ کہاں جائے۔ کیا بیرونی دنیا اسے اپنی آغوش میں سمائے گی یا پھر اسے جیل کی چار دیواری میں واپس سکون قلب کے لئے جانا ہوگا۔ اتنے میں مائیکل اور انصر بھی آگئے۔ ہم تینوں کوئی پروگرام وضع کرنے کی فکر میں تھے کہ رستوران کے مالک نے باور چھانے سے سر نکال کر ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا اور ہم چور دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ رستوران کا مالک بھی ہماری گفتگو سے دلچسپی رکھتا ہے۔ چو کو میز کانفرنس شروع ہو گئی۔

”بھئی آج کی ہڑتال کس سلسلہ میں کی گئی ہے؟“ مائیکل نے کہا

”رستوران کا مالک میکانکس ایسوسی ایشن اور اکیلی پارٹی نے مل کر وزارتینالی ہے

اس لئے مسلم لیگ نے بطور احتجاج ہڑتال کر دینی ہے۔“

انصر نے تو اس کے معنی ہوئے کہ مسلم اکثریت والے پنجاب کے صدر بی بی جی کانگریس کا راج ہوگا۔ اس بات سے تو مسلم لیگ کے قول کو اللہ بھی تقویت ملے گی کہ جب پنجاب میں یہ حال ہے تو

مرکزی اسمبلی میں تو ان کا خدا حافظ ہے۔ اس لئے پاکستان ہی اس کا واحد حل ہے۔
مائیکل۔ انصر صاحب۔ چلو بھئی آج اسی پر خیال آرائی ہو۔ مسلمانوں کی حکومت سے
 کیا مراد ہے۔

انصر۔ مسلمانوں کی حکومت اور اسلامی حکومت میں بہت فرق ہے۔ مسلمانوں کی حکومت
 تو ہندوستان میں بھی سبکدڑوں پر بس رہی اور اسلامی نمائندگی میں اب بھی قائم ہے مگر وہ اسلامی حکومتیں
 قرار نہیں دی جاسکتیں۔ اس چیز کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے اسلامی اصولوں کو جاننا ضروری ہے
 جن پر اسلامی ریاست یا حکومت کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ میں نے کل کی گفتگو میں اس امر کی وضاحت
 کر دی تھی کہ دین تمام مذاہب کا ایک ہے مگر شریعت عباداً ہے اسلام کے لفظی معنی ہیں امن
 یعنی وہ طریقہ یا راستہ جس سے انسان دنیا میں امن برقرار رکھ سکتا ہے یا امن میں رہ سکتا ہے
 اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب تمام انسان ایک ہی اللہ کی اطاعت و عبادت اختیار
 کر لیں۔ اس لئے اسلام میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ایک ہی مقصد ہے یعنی قوانینِ الہی پر
 عمل پیرا ہو کر اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا۔ دنیا کی ہر طرح کی حکومت کا یہ بقا عہد ہے کہ وہ حکومت کے
 عہدہ داروں سے ایک حلف لیتی ہے مثلاً ہندوستان کی اسمبلی کو نسل یا فوج یا میسپٹی کا عہدہ
 سنبھالنے سے پہلے یہ اقرار کیا جاتا ہے کہ میں اپنے ملک معظم کا وفادار رہوں گا اور اپنے
 قول و فعل سے حکومت کو ضرر نہیں پہنچاؤں گا۔ اسی طرح ہر پارٹی کا ایک پروگرام ہوتا ہے اور اسکی
 نہایت حاصل کرنے سے پہلے پارٹی سے وفاداری کا اقرار کرنا ضروری ہے۔ حلف اٹھانے سے
 پہلے پارٹی کے اغراض و مقاصد سے واقفیت ہونا ایک لازمی امر ہے۔ فرض کرو۔ آپ سکیورٹسٹ
 پارٹی کے ممبر بن جاتے ہیں۔ بعد ازاں اجلاس میں آپ یہ رائے پیش کرتے ہیں کہ میں صنعت و حرفت
 کے شعبہ کو حکومت کے حوالے کرنے سے اختلاف رکھتا ہوں تو صاف ظاہر ہے کہ لوگ آپ کا مذاق
 اڑائیں گے۔ اور آپ پارٹی سے خارج کر دیئے جائیں گے۔

مائیکل۔ یہ تو بالکل سیدھی بات ہے۔ یہ تو بڑی حماقت ہوگی کہ خیر سمجھ کر پارٹی کی نہایت اہمیت رکھنے والے جس کے
 اغراض و مقاصد معلوم ہوں پروگرام **انصر** فرض کرو میں آپ سے کہوں کہ آپ سلمان ہو جائیے یعنی اللہ کی ایک خاص جماعت میں
 شامل ہو جائیے تو آپ کیا جواب دیں گے۔

مائیکل: یہی کہ پہلے مجھے تمام اغراض و مقاصد پارٹی کے قوانین خداوند پر لکھ کر آگاہ کیجئے میں دوسری باتوں سے مراد نہ کہنے کے بعد کسی فیصلہ کا اعلان کر دوں گا۔

انصر: بیشک ہر فرد و انسان کا یہی جواب ہونا چاہیے اس روشنی میں اب اسلام کے بنیادی اصول کلمہ پر نظر ڈالیں لاکھ یعنی کوئی اللہ نہیں اس کا مطلب میں پہلے واضح کر چکا ہوں مالا اللہ یعنی سوائے اللہ کے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کوئی شخص جس پارٹی میں شامل ہو جائے گا وہ خدا کی جگہ پر پہلے اطاعت و عبادت کرتا رہا ہے مثلاً اپنا نفس کو قوی دیتا۔ کوئی قبر یا مزار کوئی انسان یا بادشاہ وغیرہ ان سے انکار کر دے اور ایک ہی اللہ کی اطاعت کا حلف اٹھائے۔ اس بات کا اقرار کرے کہ وہ اس کے قوانین پر عمل پیرا ہوگا۔ کون سے قوانین اس کا جواب ہیں۔ محمد رسول اللہ قانون جو محمد کے ورثے کو گوں تک پہنچایا گیا۔ یعنی قرآن اور رسول کی مثال۔

مائیکل: تو اس بات سے صاف ظاہر ہے کہ اتنا ذمہ دارانہ غلط اٹھانے سے پہلے اسلام کے قوانین کا مطالعہ ضروری ہے۔

انصر: اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ صرف ہندو کے گھر پیدا ہونے سے ہندو کہلانا۔ مسلم خاندان میں پیدا ہونے سے مسلم کہلانا وغیرہ صحیح معنوں میں درست نہیں ہے۔ شخص کو تمام شریعتیں کے اصولوں سے واقفیت ہونا لازمی ہے تاکہ کھوٹے کھرے کی فیز کر سکے اور اپنے لئے بہترین راستہ جو ذکر کر سکے۔

مائیکل: انصر صاحب! یہ علمی تحقیق بڑی دلچسپ رہے گی اور ہمارا مشغلہ بھی جاری رہے گا۔

انصر: مجھے منظور ہے۔ آپ کی سائنس کی کسوٹی ہوگی اور اس پر اسلام کو مجھے پرکھنے دیجئے اچھا خدا سائنس کا بھروسہ ہو جائیگا۔ ہمیں فرستیں اور کام ہی کیا ہے۔

مائیکل: بہت بہتر آپ اسلامی حکومت کا ذکر کر رہے تھے۔

انصر: کلمہ سے اس بات کی تفسیق ہو گئی کہ قوانین وضع کرنے کا اختیار کسی انسان کو نہیں بلکہ صرف خدا کو ہے۔ ایک رسول بھی اللہ کے قانون کا پابند ہوتا تھا اور اس کو بھی یہ اختیار نہیں تھا کہ اس میں ذرا بھی ترمیم و اضافہ کر سکے۔ خدا کے قانون کو لوگوں تک پہنچانا۔ اس پر عمل کرنا۔ اور

دوسروں کو اس پر عمل پیرا کروانا نہیں رہی اس کا کام تھا۔ اسلامی حکومت کی بنیاد اسی اصول پر قائم کی جاتی ہے۔ اس کی خصوصیات یہ ہوتی ہیں۔ کوئی شخص تعینہ خاندان پارٹی گروہ یا تمام کی تمام رعایا بھی حکومت کی مالک نہیں بن سکتی۔ مالک صرف اللہ ہے اور تمام مسلمان اس کی رعایا۔ کوئی بادشاہ شخص یا لوگوں کے نمائندے قوانین الہی میں کسی قسم کے رد و بدل کے مجاز نہیں حکومت کا کام صرف قوانین کو عملی جامہ پہنانا ہے۔ بادشاہ ہوا امیر۔ سبکی ہوا کو نسل۔ وہ صرف خدا کے نائب کی حیثیت سے حکومت چلا سکتے ہیں۔ مالک نہیں بن سکتے۔ پہلی نظر میں یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اسلامی حکومت جمہوری نہیں کیونکہ جمہوری نظام میں قوانین لوگوں کے نمائندے وضع کرتے ہیں اور وہی اس میں تسبیح و ترمیم عمل میں لاتے ہیں حکومت الہیہ اس کو کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ مگر یہ روم کے خدا کی بادشاہت سے بالکل مختلف ہے۔ کیونکہ باپائے اعظم بھی خدا کے پردے میں اپنی حکومت چلاتا ہے۔ لیکن ایک صورت سے یہ جمہوری نظام سے ملتی جلتی ہے۔ کیونکہ ایسے امور کے فیصلوں میں جس کے متعلق قرآن اور رسول کی مثال نہ ملتی ہو۔ ہر وہ شخص جو علما و راستے رکھتا ہو۔ اپنے اظہار خیال کی آزادی رکھتا ہے۔ کسی خاص گروہ یا شخص کی پابندی نہیں ہے۔ اس روشنی میں اسلامی طرز حکومت کو جمہوری حکومت، الہیہ کہنا بالکل بجا ہو گا۔

مائیکل مگر اس صورت میں کیا انسان کی ذاتی اور روحانی آزادی خدا نے سلب نہیں کی۔ حالانکہ آپ فرما رہے تھے کہ ایک ہی اللہ کی اجاعت پر ایمان لانے سے انسان سب انسانی قیود سے آزاد ہو جاتا ہے۔ یہ تو وہی قلمی رہی۔ اپنی مرضی سے تو کوئی کام نہ ہوا۔

انصر میں پہلے بتا چکا ہوں کہ انسان کے ہاتھوں سے قانون سازی کا اختیار خدا نے انسان کی ہی بہتری کے لئے سلب کیا ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے مغربی دنیا کی کسی جمہوریت کی مثال لے لیجئے۔ وہاں کیا ہوتا ہے۔ انتخابات میں وہ لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو سب سے زیادہ انسانوں کو اپنی طاقت اور مال و زر۔ ریکاری۔ پروپیگنڈا اور چالاک سے بیوقوف بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کے مجمع نمائندے بہت کم ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ لوگ آزادانہ لوگوں پر اپنے قوانین تھوپتے ہیں۔ جن کی دلوں سے یہ منتخب ہوتے تھے۔ برطانیہ اور امریکہ کی مثال

آپ کے سامنے ہے۔ دونوں ملکوں کے سرمایہ دارین مافی حکومت کرتے ہیں اور لاکھوں انسانوں کو ان کی خواہش کے برخلاف جنگ کے ہونا ک شعلوں میں دھکیل دیتے ہیں۔ سپاہی بن کر یہ لوگ اپنی تمام ستریں قربان کر دیتے ہیں۔ فوج فائل غولی اور ڈاکو بننے پر مجبور کر دیتے جاتے ہیں۔ بیشتر انہی جان کا قیمتی سرمایہ لٹا بیٹھتے ہیں۔ اکثر پانچ ہو کر گھر کو لوٹتے ہیں اور باقی صحیح و سلامت واپس آتے ہیں۔ انہیں پھر نئے سرے سے دُنیا میں روزی کے لئے جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ ان حقائق سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ دوسرا نقص یہ ہے کہ قوانین عوام کی مرضی سے وضع نہیں کئے جاتے۔ فرض کر لیں تمام مائدے عوام کی صحیح ترجیحائی کرنے میں مگروہ بھی آخر انسان ہی ہیں۔ انسانی کمزوریوں سے بالاتر نہیں ہو سکتے۔ اس لئے قانون سازی میں اکثر غلطیاں کر جاتے ہیں مثال کے طور پر امریکہ کے عوام نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ شراب واقعی بُری چیز ہے۔ صحت اور اخلاق پر بُرا اثر ڈالتی ہے۔ اس لئے دو ٹوک سے انتشار شراب کا قانون پاس کر دیا گیا۔ مگر جب یہ قانون عوام پر وارد کیا گیا۔ عوام اس کیخلاف آواز اٹھانے لگے۔ نا جائز شراب کا کاروبار ٹوٹ گیا۔ جرائم کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہی لوگوں نے جنہوں نے یہ قانون پاس کیا تھا۔ اس کی تشح کا بھی ٹکڑا کر دیا۔ اس کی یہ وجہ نہیں تھی۔ کہ شراب کے استعمال کا کوئی جواز مل گیا تھا۔ بس سے شراب کو جائز قرار دیا جاسکتا تھا۔ اس کی صرف یہ وجہ تھی کہ لوگوں نے حکومت شیطان کے حوالے کر دی تھی۔ یعنی اپنی نفسانی خواہشات کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ انہوں نے بجائے اللہ کے حکم کے کیونکہ مذہب شراب کی اجازت نہیں دیتا۔ اپنے نفس کو خدا قید کر لیا تھا۔ یہ دیکھ کر کی شکست تھی اور بدی کی فتح کامل۔ ایسی بہت سی مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان قانون سازی کا اہل نہیں۔ انسان کی بھلائی اسی میں ہے کہ کوئی ذہن کامل یہ فرض انجام دے۔ آپ کے مشاہدہ میں یہ تو آیا ہو گا کہ مسلم سوسائٹی میں کوئی مسلمان اعلانیہ طور پر شراب نہیں پی سکتا۔ بشرطیکہ اسے اسلامی قانون کے آداب ملحوظ رکھیں جو برائے نام مسلم ہے۔ اس سے کیا شکوہ ہو سکتا ہے۔ اس طرح حکام نے معاشرتی، معاشی و مذہبی زندگی کی حدیں مقرر کر دی ہیں۔ یعنی فطری ضروریات کی تکمیل کے لئے شرائط عائد کر دی ہیں جن کا مقصد یہی ہے کہ انسان نہ اپنی ذات کو اور نہ کسی دوسرے انسان کی ذات کو نقصان پہنچائے۔

ان ضروریات کو پورا کرنے سے اسلام منع نہیں کرتا مگر حد کے اندر رہنا یعنی اقتدال پسندی اسلام کی روح رواں ہے۔ ان پر تفصیل سے بحث اس وقت کروں گا۔ جب آپ کی کسوٹی پر انہیں پرکھا جائے گا۔ فی الحال تو اتنا ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ اللہ کے اس دستور العمل میں ترمیم و تفسیح کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس قانون سے بغاوت ہو سکتی ہے جیسی کہ ترکی اور ایران میں ہوئی۔ اس لئے جو کوئی بھی اسے تسلیم کرتا ہے۔ خواہ وہ کسی فرد کسی نسل ملک اور قوم سے تعلق رکھتا ہو بحیثیت جماعتی رکن حکومت الہیہ میں برابر کا درجہ رکھتا ہے۔ عزت اور توفیق کا معیار انسان کی ذاتی قابلیت علم اور اخلاق پر منحصر ہے جو اس قانون کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ اللہ کی دوسری جماعت کا رکن ہے۔ وہ اسلامی حکومت میں رعایا کی حیثیت سے رہ سکتا ہے۔ اس کی جان و مال اور اس کی عزت کی حفاظت اسلامی ریاست ہوگی۔ مگر وہ حکومت کے نظام میں شرکت نہیں کر سکتا۔

مائیکل۔ کیا اسی لئے مسلمان اپنی علیحدہ ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں۔

انصر۔ فقط چاہنے کا سوال ہی نہیں۔ مذہبی نقطہ نگاہ سے تو انسان اس نتیجہ تک پہنچتا ہے کہ کسی ایک علاقہ یا ملک میں ایک ہی پارٹی کی حکومت ہو سکتی ہے۔ مغربی جمہوریہ میں بھی ایک عرصہ کے لئے ایک ہی پارٹی حکومت کی باگ ڈور سنبھال سکتی ہے اور مخالف پارٹی یا پارٹیاں برسرِ اقتدار پارٹی کی پالیسی وغیرہ پر تنقید کرتی ہیں بعض ایسی جمہوری حکومتیں ہیں۔ جہاں صرف ایک ہی پارٹی حکومت کر سکتی ہے۔ کوئی مخالف پارٹی وجود میں آنے ہی نہیں دی جاتی۔ مثلاً سویت یونین جہاں صرف کمیونسٹ پارٹی حکومت کرتی ہے۔ اسی طرح دینی نظریے کے مطابق ایک ہی پارٹی بیک وقت کسی جگہ حکومت کر سکتی ہے۔ شریعت کے عباد کا نہ ہونے سے انسان مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں اور ہر گروہ اپنی اپنی شریعت کو بہتر سمجھتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی ہے کہ مذہبی گروہ آپس میں اقتدار کی جنگ لڑ رہے ہیں جس ملک میں ایک ہی مذہب ہے۔ چاہے اس کے پیروکار دہائے نام ہی کیوں نہ ہوں۔ وہاں اس قدر وقت پیش نہیں آتی جیسی کہ خاص طور پر صوبہ پنجاب میں جہاں مختلف گروہ خاصی تعداد میں آباد ہیں۔ ایک ہی مذہب کے پیروکاروں میں بھی کئی کئی گروہ ہیں۔ مثلاً ہندوؤں میں آریہ سماج۔ رناتن دھرم۔ جینی وغیرہ۔ مسلمانوں میں شیعہ۔ سنی۔ مرزائی وغیرہ۔ عیسائیوں میں رومن کیتھولک اور

پروٹسٹنٹ وغیرہ مگر یہ اختلافات اس قدر اہم نہیں ہیں کہ جنگ کا باعث ہوں یہی وجہ ہے کہ یورپ
برطانیہ۔ امریکہ اور اسلامی ممالک میں مذہبی جنگ نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس ہندوستان اور فلسطین
میں آئے دن یہی قصہ دہرایا جاتا ہے حقیقت یہ ہے کہ انسانی خود غرضی یا شیطنیت جنگ کا بہانہ
ڈھونڈتی رہتی ہیں۔ اگر مذہب اور ملک ایک ہیں تو لوگ سیاسی گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ اگر
ملک ایک ہے اور مذہب جدا جدا تو لوگ مذہب کو بنائے جنگ ٹھہرا لیتے ہیں۔

مائیکل : بات تو واقعی سیدھی ہے۔ اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہر مذہب کے لئے
ایک علیحدہ ریاست ہونی چاہئے جہاں وہ اپنی من مانی کر سکے۔

انصر : مشکل یونہی آسان نہیں ہوتی۔ اگر ریاستیں بھی علیحدہ علیحدہ مقرر ہو جائیں۔ تو
آئندہ کون وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ ریاستیں آپس میں جنگ نہ کریں گی۔ جب برطانیہ اور جاپان ہزاروں
میل دور دورے ملکوں پر قبضہ کرنے کے لئے گھر سے نکل کھڑے ہوئے تھے تو کیا ہندوستان میں جب
سرحد کے ساتھ سرحد ملی ہوئی ہوگی۔ جنگ کے لئے بہانہ ایک معمولی بات ہوگی۔ دو جاٹوں میں جبکہ
کھیت کی منڈیر سانچھی ہو تو آئے دن مقدمہ بازی ہوتی رہتی ہے۔ رونا تو اسی بات کا ہے۔ اگر
سب مذاہب کے پیروکار انسانی سمجھ لیں کہ مذہب کا مقصد انسان کو انسان بنانا ہے تو لوگ انسانیت سے
اپنی اپنی شریعت کے مطابق زندگی بسر کرتے جائیں اور آپس میں کم از کم اس بات پر متفق ہو جائیں
کہ ہمارا خدا ایک ہے۔ اس لئے ہمارا خدا اس گروہ سے ہے جو خدا کی ہستی سے منکر ہے ایک
مذہب کا دوسرے مذہب سے جنگ کرنا سراسر حماقت ہے۔ اگر جنگ کرنی ہی ہے تو کافروں سے
کر۔ آپس میں کیوں کٹ کٹ کر مرتے ہو۔

مائیکل : اومیسے خیال میں جنگ تو احساس برتری کی خواہش کا لازماً شاخسانہ ہے۔
اور یہ خواہش فطری ضروریات میں ایک اہم درجہ رکھتی ہے۔ کیوں نہ اس جذبہ کی تسکین کے لئے
کوئی دوسری راہ نکالی جائے۔ تاکہ ایک گروہ دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں
مصرف نہ رہے اور جنگ سے بھی باز رہے۔

انصر : یہ سلسلہ ملاقات جاری رہا تو انشاء اللہ قلعے کوئی صورت نکال ہی لیں گے۔

آپ کو بھی یہی خط ہے تو مجھے بھی یہی عارضہ لاحق ہے۔ مجھے یہ علیحدہ علیحدہ ریاستوں کا نظریہ کچھ بھلا معلوم نہیں دیتا۔ یہ تو انسانوں کے ٹکڑے کر دینے کے مترادف ہے۔ کوئی خشاک اور ٹکڑا قسم کا مسلمان یہ باتیں سن لے تو مجھے ابھی کفر کے فتوے کی سند عطا فرما دے۔ اب چلنا ہی چاہئے۔ کوئی مولانا ادھر نہ آنکلیں۔“

مائیکل اور انصر کے جانے کے بعد میں تنہا سیر کو نکل کھڑا ہوا۔ ذہن میں آج کی گفتگو کا ایک ایک لفظ گونج رہا تھا جو مائیکل اور انصر کے درمیان ہوئی تھی۔ میں کسی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دل ہی دل میں اب تک جو کچھ زیر بحث آیا تھا۔ اسے دہراتا رہا۔

انسان کی چند بنیادی اور فطری ضروریات ہیں جن کی تکمیل کے لئے وہ غیر جذباتی طریقے اختیار کرتا ہے۔ ہر انسان کے اخلاق اور کردار کا انحصار اسی طریقے پر ہے۔ زندگی کا مقصد کیا ہے۔ فطری ضروریات کی تکمیل کا اچھا طریقہ کون سا ہے۔ کائنات کا کوئی خالق ہے کہ نہیں؟۔ زندگی لافانی ہے یا صرف موت تک محدود ہے۔ پہلے دوسروں کا جواب مائیکل نے علمی تحقیق سے ثابت کر دیا تھا کہ بحیثیت ایک جاندار انسان پر پہلا فرض یہی عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی جان کی حفاظت اور جسمانی قوتوں کی نشو و نما کرے۔ کیونکہ انسان شعوری اور محسوساتی حیوان ہے۔ اس لئے ان تمام پہلوؤں کی تکمیل بھی لازمی ہے۔ یعنی دو لفظوں میں تکمیل خودی مقصد حیات ہے۔ اور تکمیل خودی کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ ہر فرد اپنے سے اور اپنے سمجھنوں سے عشق کرنا سیکھے۔ خود بھی جسے اور دوسروں کو بھی جینے دے۔ اپنی تکمیل خودی کرے اور دوسروں کو بھی اسی مقصد کے حصول میں مدد دے۔ انسانی زندگی کا جہاں تک اس دنیا سے تعلق ہے۔ یہ جواب مکمل ہے۔ موت کی سرمد کے اس پار کا علم سائنس کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ اس لئے سائنس دوسرے دوسروں کا بھی کوئی حل نہیں پیش کر سکی۔ یہ کہنا غلط ہے کہ سائنس خدا کی ہستی اور حیات بعد الموت سے انکار کرتی ہے دینی نظریات کو سائنس بغیر کسی عملی ثبوت کے تسلیم نہیں کر سکتی۔ حقائق کو ماننے سے سائنس کبھی انکار نہیں کرتی۔ موت کے بعد جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے۔ اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیتا ہے۔ روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آتی مگر فلاسفر اور مذاہب اپنی اپنی مشعلیں لے کر خضر راہ ہونے کی

خدمات پیش کرتے ہیں۔ سائنس کچھ حد تک سہارا دیتی ہے مگر انھوں کی طرح لاطنی کا سہارا لے کر چلنے میں وہ اپنی تدلیل سمجھتی ہے۔ مفروضات کو قبول کر لینا اس کی فطرت نہیں۔ انصر صاحب نے دلائل سے یہ ثابت کر دیا کہ فلسفہ رہنمائی کی اہلیت نہیں رکھتا۔ وہم و گمان بذاتِ خود کو چشم ہیں۔ وہ کیا راستہ سمجھا سکتے ہیں جس کا خمیرہ کہتا ہے کہ نہیں اس جہان کا کوئی خالق ضرور ہونا چاہئے۔ انسان کی زندگی پوچھی نہی ختم نہیں ہو سکتی تو وہ تمام مشکوک کو دل سے نکال دے اور ایک راستہ اختیار کر لے۔ دور لہجے پر کھڑے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ رہنمایانِ دین کی تمام زندگی سامنے ہے۔ ان کا اخلاق اور چال چلن اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے اقوال پر یقین کر لیا جائے۔ ان کے اقوال اور افعال میں برباد کاری کی بوتلم نہیں ہے۔ انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ رسولِ عربیؐ تو امینؑ کہلاتے تھے۔ دشمنوں نے بھی یہ الزام کبھی نہیں لگایا کہ انہوں نے کبھی جھوٹ بولا ہو تو پھر اتنا بڑا جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ تھا۔ اس قدر مسائب اور سختیاں جھیلنے کی کیا ضرورت تھی۔ دنیا کا ہر عیش ان کے ذمہوں پر پھلور گیا مگر ٹھکرا دیا گیا۔ انبیا کیا کہتے ہیں۔ اس کی بھی وضاحت ہو گئی کہ صرف اللہ کی اطاعت کرو۔ خدا کی ہستی سے کوئی انکار شاذ و نادر کرتا ہے مگر انصر کہتا ہے کہ خدا کی ہستی کو تسلیم کرنے کے یہ معنی نہیں کہ زباں سے یا دل سے یہ اقرار کر لیا کہ خدا ایک حقیقت ہے خدا کو تسلیم کرنے کے معنی ہیں اس کی رضا پر چلنا اور دین کہتا ہے کہ خدا کی رضا کا طریقہ بھی وہی ہے جس میں انسان راسخی رہیں۔ یعنی قانونِ خدا انسان کی اپنی بھلائی کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ ایک نیک انسان نہ جنت کا خواہاں ہے نہ دوزخ سے ہراساں۔ وہ تو اللہ کی رضا کا طلبگار ہے۔ او یہی مانگتا تھا کہ نیک وہ ہے جو نیکی کو اپنے افعال کا صلہ جانتا ہے جو خوف اور لالچ سے بے نیاز ہو کہ لوگوں سے نیکی کا بڑا و کرتا ہے۔ یعنی انسانیت ہی سب سے بڑا مذہب ہے۔ مذہب کا بھی یہی مقصد ہے تو اس سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ مذہب یا دین کا راستہ یا اس کے قوانین بھی وہی ہونے چاہئیں جو انسانیت کے شایانِ شان ہوں انسان کی فطری ضروریات کی تکمیل کے لئے رہنمائی کریں۔ اگر دین بھی تکمیلِ خودی کی اعانت کرتا ہے اور کسی طرح اس مقصد کے حصول میں حائل نہیں ہوتا تو اسے باقی نظریات پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ آخر ہر انسان کو زندگی کا ایک راستہ تو اپنے لئے معین کرنا ہی

ہوگا۔ جو راستہ یا طرز عمل وہ اختیار کرتا ہے۔ وہی اس کا مذہب ہے۔ اس لئے مذہب کے بغیر تو کوئی انسان جی نہیں سکتا۔ دین کے زاویہ نگاہ سے بھی تو وہی گروہ ہونے چاہئیں۔ ایک ایمان لائے والا دوسرا کافر۔ ایمانداروں کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک جو برائے نام ہیں یعنی اپنی شریعت پر عمل نہیں کرتے اور دوسرے جو عمل کرتے ہیں۔ یعنی وہ نیک انسان ہیں۔ دوسری طرف کافروں کے بھی دو گروہ ہیں۔ خدا کی ہستی کو وہ گو تسلیم نہیں کرتے۔ مگر ایک گروہ ان میں نیکی۔ راستی۔ اچھائی اور انسانیت کو اپنا خدا مانتا ہے اور دوسرا گروہ بدی یعنی شیطنت کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ اگر اللہ سے تمام نیکیاں منسوب ہیں اور شیطان سے تمام بدیاں۔ تو پھر اصل میں دنیا کے تمام انسان دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک انسانوں کا دوسرا شیطانوں کا۔ یعنی ایک فرمانبرداروں کا اور دوسرا شیطان کے پیروکاروں کا یعنی کافروں کا۔ نیکی اور بدی میں ہمیشہ جنگ ہوتی چلی آئی ہے۔ ناولوں۔ کہانیوں اور قصوں میں بھی یہی ہوتا ہے۔ نیکی کی آخر کار فتح ہوتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ بدی بہت دلکش ہوتی ہے مگر اس مسرت کی زندگی چند روزہ ہے۔ نیکی میں عذابیت نہیں مگر اس کی چاشنی دیرپا ہے۔ اچھی اور بری چیز میں تمیز کیسے کر سکتے ہیں۔ کل مائیکل اور القہر سے یہی موضوع چھیڑوں گا۔ میں زندگی کا بہترین طریقہ دریافت کرنا چاہتا ہوں اور اسی طریقہ پر کامزن ہونے کا تہیہ کر لوں گا۔ یہ بے راہ روی کسی کام کی نہیں۔ مجھے اپنی زندگی کے لئے مناسب شاہراہ انتخاب کرنا ہے! —

دُوسرا حصہ

پہلا باب

فطری ضروریات کی تکمیل کا بہترین طریق

دفتر کے کسی کام میں بھی جی نہیں گلتا تھا۔ دماغ زندگی کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف تھا یہی انتظار تھا کہ کب چار بجیں اور سیم ٹینوں اکٹھے ہوں۔ عین چار بجے میں دفتر سے رخصت ہوا۔ اور سیدھا رستورائن پہنچا۔ وہاں مائیکل اور انصر بھی موجود تھے۔ میں نے ان دونوں کو اپنی پریشان حالی سے آگاہ کیا۔ مائیکل سے میں نے درخواست کی کہ آج زندگی کے بہترین راستہ کو گفتگو کا موضوع بنائیں۔ مائیکل نے آپ کو یاد ہوگا۔ میں نے فطری ضروریات کا نقشہ آپ کو سمجھایا تھا۔ اس سے یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ انسانی زندگی کی مسرت کا انحصار انہیں خواہشات و ضروریات کی تکمیل پر ہے۔ میں بتا دیکھ ان تمام ضروریات کی تکمیل کے مختلف طریقوں کو زیر بحث لاکر بہترین طریقہ پیش کروں گا اور انصر صاحب اس کا اسلامی طریقہ پیش کریں گے اور سعید صاحب آپ ان دونوں پر تنقید کرنے کے بعد ایک غیر جانبدارانہ فیصلہ فرمائیں گے۔“

”بہتر ہے“ میں نے کہا

مائیکل نے پہلے اس امر کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ سائنس کی کسوٹی حقیقت کے انمول پتھر سے بنائی گئی ہے۔ ساری سب طریقوں کو پرکھا جائے گا۔ یہ تو آپ کو یاد ہوگا کہ انصر لوی زندگی کا بنیادی اصول اپنی ذات سے عشق ہے۔ میں انسان کی اولیٰ ضروریات سے شروع کرتا ہوں

یعنی جسمانی ضروریات۔ اچھی صحت اور جسمانی خوبصورتی کی اہمیت جتانے کی چنداں ضرورت نہیں صحت کی خرابی انسان پر تمام مسرتوں کے دروازے بند کر دیتی ہے۔ فطری ضروریات کی تسکین کے تمام سامان اور ذرائع کی موجودگی کے باوجود خرابی صحت ان تمام مسرتوں پر پانی پھیر دیتی ہے۔ بیمار یہی کہتا ہے کہ مجھ سے سب کچھ چھین لو مگر مجھے میری صحت واپس دے دو۔ اس لئے اگر اپنی ذوات سے عشق ہے تو سب سے پہلے اپنی صحت کو بحال رکھنا اور جسم کی فشوفا کرنا سیکھو۔ اچھی صحت کے لئے اچھی غذا لازمی امر ہے۔ اس کے علاوہ کھانا اور پینا انسانی زندگی کا سب سے بڑا مشغلہ ہے۔ قدرت کی پیدا کردہ انواع و اقسام کی اشیاء سے لطف اندوز نہ ہونا کہاں کی دانائی ہے۔ کھاؤ پیو اور عیش کرو کا یہ منہم نہیں کہ جو چیز دل چاہے استعمال میں لے آئیے۔ اور نہ ہی پرہیز کا یہ مطلب ہے کہ تمہاری غذا صرف جسم اور صحت کو برقرار رکھنے کے لئے دو اکا کام دے۔ غذا میں دونوں خوبیاں موجود ہیں۔ غذا ذائقہ دار بھی ہو اور صحت کے لئے فائدہ مند بھی۔ قدرت نے تو اس معاملہ میں بڑی فیاضی سے کام لیا ہے۔ دودھ پھل اور سبزیاں، گوشت وغیرہ اسی موضوع پر پیشکش کرتا ہے اور رسالے ملتے ہیں۔ اس لئے زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں۔ صرف یہ اصول مد نظر رکھنا چاہئے۔ ہر اس چیز سے لطف اٹھاؤ جس سے تمہاری صحت کو کوئی ضرر پہنچنے کا احتمال نہ ہو۔ یہ بھی یاد رہے کہ ہر انسان ایک خودی کا مالک ہے۔ اس لئے ایک چیز جو آپ کے لئے امرت ہے دوسرے کے لئے زہرِ قاتل ثابت ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر دودھ اور لسی کے استعمال سے مجھے سخت نقصان پہنچتا ہے۔ اس لئے میرے لئے مضر ہیں۔ حالانکہ یہ بہترین غذا میں شامل ہیں۔ اس لئے میں چائے میں دودھ زیادہ استعمال کر لیتا ہوں۔ اس طرح مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی؟

آپ کی علمی تحقیق کے مطابق انسان کی معیاری غذا کیا ہونی چاہئے؟۔ میں نے استفسار کیا۔

مائیکل: سارا دن کھاتے رہنا یا ایک دو دفعہ پیٹ بھر کر کھانے سے صحت پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ غذا دن میں تین دفعہ کھانی بہتر ہے اور شام کی چائے بھی شامل ہو سکتی ہے۔ غذا کی مقدار ہر شخص کے لئے جدا گانہ ہے۔ جسمانی محنت کرنے والوں کو دماغی کام کرنے والوں کی نسبت زیادہ

غذا کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ صبح کے ناشتے میں نانڈے۔ کھن۔ روٹی اور دودھ ہونا چاہئے۔ دودھ چائے اور تسی کی صورت میں بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ دوپہر کو روٹی، دہی یا پنیر اور کھجور کی چھلکوں کے ساتھ دودھ یا تسی بہترین ہے۔ رات کے کھانے میں گوشت، ٹھیکلی۔ آلو۔ روٹی۔ والیس یا سبزیاں اور کوئی خشک میوہ یا ٹھیک چیز ہونی چاہئے۔ شام کی چائے جو اشخاص پسند کرتے ہیں۔ پی سکتے ہیں مگر اس کے ساتھ زیادہ کھانا نہیں چاہئے۔ زیادہ مرغی اور مسلے دار غذاؤں سے پرہیز رکھنا اچھا ہے۔ کوشش یہی ہونی چاہئے کہ قدرت کی تمام غذاؤں کی صورت کو مسخ نہ کر دیا جائے۔ آپ کہیں گے کہ اتنی غذا تو عام آدمی فراہم نہیں کر سکتا۔ مگر یہاں تو فراہمی کا سوال ہی نہیں۔ سوال ہے فطری ضرورت کا۔ اور یہ ضرورت سب کے اہم ہے۔ اس لئے حکومت۔ ریاست یا سماج کا اولین فرض یہ ہے کہ ہر انسان کو پوری غذا اہیا کرے۔ روز زندہ مرنے تو چلتے پھرتے کروڑوں کی تعداد میں ہندوستان اور چین میں موجود ہیں۔ اتنی پیدائش سے فائدہ کیا جب ایک سو انسانوں میں مشکل دو چار کو معیاری غذا نصیب ہو؟

انصر: آپ کا کہنا بجا ہے۔ زندگی فاقہ کشی اور افلاس کا نام نہیں۔ خدانے انسانوں کو اپنی نعمتوں سے مالا مال کیا ہے۔ دنیا میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ صرف انسانیت کا فقدان ہے اچھا تو اس کے بعد۔

مائیکل: دوسری لازمی ضرورت ہے لباس اور گھر۔ آرام کے لئے ضروری ہے کہ کوئی محفوظ اور آرام دہ جگہ میسر ہو۔ وحشی انسان بھی غاروں میں پناہ لیتا ہے اور کپڑوں کی بجائے جانوروں کی کھال پہنتا ہے۔ یہی غار جھونپڑوں میں تبدیل ہو گئے۔ ذہنی ارتقاء کے ساتھ ساتھ جھونپڑیوں کی جگہ مکانات نے لے لی اور زمانہ حال کی شاندار عمارتیں اسی ضرورت کو پورا کرتی ہیں۔ یعنی ایک ایسی جگہ جہاں ایک فرد اطمینان سے انفرادی زندگی بسر کر سکے یا ایک خاندان کی بلیا درکھ سکے اور اس کی پرورش کر سکے۔ ایسی جگہ کے لئے دیگر لوازمات بھی ضروری ہیں۔ انسانی تہذیب کے حسب ارتقاء ان میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ آج کے ایک معیاری گھر میں تمام ضروری فرنیچر۔ برتن۔ کبلی۔ ریڈیو۔ اور مپ کا ہونا لازمی ہے۔ ایسی اشیاء کا میسر آنا مسرت میں اضافہ کرتا ہے۔ مگر ان اشیاء کی کمی سے کسی شخص کو افسردہ خاطر نہ ہونا چاہئے۔ خواہشات کی حد نہیں۔ اس لئے قناعت اچھی ہے۔ مگر

تفاوت کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے حصول کی کوشش ہی نہ کی جائے۔ عیش و راحت کے سامان کے لئے جدوجہد لازمی ہے۔ ان چیزوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں کوئی بُرائی نہیں۔ اگر تمام راحتیں میسر نہ آسکیں تو کئی مضائقہ نہیں۔ سب مقدم چیز تو صحت ہے اور اس کے حصول کے لئے صرف غذا پر، پہرہ و خیمہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ باقی چیزیں مثلاً ہوا، پانی، سورج کی شعاعیں و رزق اور غسل سب کی سب قدرت کے عطیے ہیں۔ ان انمول چیزوں کی کوئی قیمت ادا نہیں کرنی پڑتی۔ اور انہی صحت کا دار و مدار ہے۔“

انصر: آپ کے خیال میں ایک معیاری گھر کی کیا خصوصیات ہونی چاہئیں؟
 مائیکل: پہلی بات یہ ہے کہ گھر کی ساخت اتنی مضبوط ہونی چاہئے۔ جو بارش، آندھی، اور طوفان کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکے۔ دوسری یہ کہ دھوپ اور ہوا کا گذار مکان میں آزاد ہو۔ اب اسی پر غور کیجئے۔ اتنی لازمی ضرورت کتنی کیا ہو کر رہ گئی ہے۔ ہندوستان کے شہروں پر نظر کرو کہ کتنی عمارتیں اسی میں گی جہاں دھوپ اور ہوا کا گذار تک نہیں۔ ضرورت تعیش میں مبتدل ہو گئی ہے۔ اسی جگہ تو بنگلے اور کونٹیاں ہی ہو سکتے ہیں۔ میرے خیال میں اندرونی شہر رہنے کے قابل نہیں۔ ایک اچھے شہر کے لئے ضروری ہے کہ سڑکیں نہایت فراخ ہوں۔ مکان اور عمارتیں معیاری ہوں۔ شہر کو گنجان کرنے کی بجائے پھیلا دینا دیا وہ بہتر ہے۔ پانی اور نالیوں کا زمین و آسمان انتظام نہایت ضروری ہے۔ یہ انسان کی ابتدائی ضروریات ہیں۔ اس لئے حکومت کا فرض یہ ہے کہ رہنے کے لئے سب کو معیاری گھر فراہم کرے!

دوسرے لوازمات مثلاً فرتیچر، کپڑے، برتن، ریڈیو، موٹر کار وغیرہ کے لئے اتنا معاوضہ دے جس سے یہ سامان سب کو میسر آ سکے۔ ایسے تاریک اور گندے مکانات میں رہنے سے تو وحشی زندگی کا غار بدرجہا بہتر تھی۔ کیا یہ تہذیب کی بے انصافی نہیں کہ اس نے انسانوں کو ایک لازمی چیز سے محروم کر دیا۔ مجھے تو حیرانی ہوتی ہے کہ گاؤں میں رہنے والے بھی اس مرض کا شکار ہیں۔ حالانکہ ان کے ذلیل گھروں سے انہیں گھر کہنا بھی حماقت ہے! باہر جہاں تک نگاہ جاتی ہے۔ ہرے بھرے کھیت لہلہاتے ہیں تنازہ اور فرحت بخش ہوا ایک نغمہ سناتی ہے۔ مگر یہ بد نصیب کسان ایک

تنگ و تاریک کوٹھری میں ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر میلے پھیلے لمافوں میں بڑا ساری مات کھانسی رہتا ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ وہ اپنے کھینٹوں میں اپنے گھر تعمیر کریں۔ آپ کہیں گے کہ اس طرح وہ ایک دوسرے سے دُور ہو جائیں گے کوئی حرج نہیں۔ چند اشخاص آپس میں اکٹھے مل کر کاشتکاری کرنا سیکھیں اور اپنے اپنے گھر ایک ہی جگہ کھینٹوں میں بنالیں اور ایسی تمام چھوٹی چھوٹی بستیوں کے درمیان ایک مارکیٹ قائم کر دیں۔ جہاں تمام کاروباری سلسلہ ہو مثلاً پولیس۔ بینک۔ پنچایت گھر وغیرہ یہ فرض بھی حکومت ہی کا ہے۔ افراد کا نہیں۔ وہی اس کو عملی جامہ پہنا سکتی ہے۔ اس لئے میں نے ریاست کی اہمیت پر کافی روشنی ڈالی تھی۔ ریاست تعلیم اور قوت کے ذریعے لوگوں کو بہتر طریقے پر چلا سکتی ہے۔ خیال کیجئے۔ ایک وحشی انسان بھی کھالیں بچھا کر سو جاتا ہے اور کھالیں پہن لیتا ہے مگر تہذیب کے اس دور میں بیشتر افراد ایسے ہیں جنہیں تن ڈھانکنے کو کپڑا اور سونے کے لئے چارپائی تک نصیب نہیں۔ ایسے بھی ہیں جن کے پاس اس قدر مال و زر ہے کہ وہ نہیں اُسے خرچ کرنے کا ڈھنگ نہیں آتا۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ اس افراط کو نادر لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ لباس کا معاملہ۔ لباس کے پس پردہ دو ضروریات کام کرتی ہیں۔ ایک تو ہے تن ڈھانکنا تاکہ سردی اور گرمی سے خود کو محفوظ رکھا جائے۔ دوسرا مقصد ہے زیبائش۔ لباس کا یہ مفہوم ہے کہ سر سے لے کر ایڑی تک زیبائش۔ تہذیب کے اس دور میں یہ دوسرا مقصد زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اپنی طرف مائل کرنے کی خواہش یا دوسروں کی نظروں میں بچنے کی خواہش اچھے اچھے پہننے کی ترغیب دیتی ہے۔ اس کے علاوہ انسان کا جمالیاتی ذوق بھی اچھے لباس کا منتظمی ہے۔ بعض لوگ فلیشن پرست اشخاص کے لباس پر بڑی تنقید کرتے ہیں۔ مگر میری رائے میں ایک فلیشن پرست شخص اس شخص سے بدرجہا بہتر ہے جو میلے کپڑے پہنتا ہے۔ یا بے سلیقہ لباس پہنتا ہے۔ جس سے جمالیاتی ذوق کو ٹھیس لگتی ہے کم از کم لباس کا شائق آنکھوں کو ایک مکروہ نظارہ سے تو دوچار نہیں ہونے دیتا۔

”لباس کس قسم کا ہونا چاہئے؟“ میں نے استفسار کیا۔

مائیکل ”لباس کس قسم کا بھی ہو مگر پہننے کا سلیقہ ضرور ناچا ہئے۔ سلیقہ سے پہنا ہوا“

سادہ سے سادہ لباس بھی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ لباسِ فاغرہ ہی زیبِ نیک کرنا چاہئے۔ سلیف سے یہ مراد ہے کہ سر سے لیکر پاؤں تک لباس ہم آہنگ ہو۔ اس میں یک رنگی اور نفاست جو مثال کے طور پر انسان کے جمالیاتی ذوق کو کس قدر ٹھس لگتی ہے۔ جب کوئی شخص کالے سوٹ کے ساتھ براؤن بوٹ پہنتا ہے۔ یا کالے جوتے کے ساتھ براؤن جراب مطلب یہ ہے کہ پگڑی یا لٹنی سوٹ یا اچکن رٹائی وغیرہ یہ چیز یک رنگ ہونی چاہئے۔ میں وحدت رنگ کا فائل ہوں۔ لباس پہننا بھی ایک آرٹ ہے۔ لباس ظاہری سے کم از کم یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ نفاست پسند ہے یا کور ذوق۔ جمالیات کا پرستار ہے یا مکروہات کا۔ اچھا لباس سماج میں ایک خاص وقت رکھتا ہے مگر بھڑکیے لباس سے اجتناب کرنا چاہئے۔ لباس سادہ ہی بہتر ہے مگر کہیں اس قدر سادگی بھی اختیار نہ کر لو کہ برہنہ ہی نظر آوے۔ جیسا کہ کوئی برہنہ سوسائٹی کا ممبر۔

”برہنگی کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟“ میں نے کہا۔

مائیکل۔ شاید تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ برہنگی کے پیرو کا اس کے جوازیں دو دلائل پیش کرتے ہیں یعنی سورج کی شعاعوں میں صحت کا راز مندر ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے مگر یہ عمل تو پوشیدہ طور پر بھی ہو سکتا ہے یا سمندر کے کنارے تیراکی کے لباس میں! مگر بالکل برہنہ ہونے میں کیا خصوصیت ہے۔ کم از کم جنسی اعضا تو مستور رہنے چاہیں مگر یہی تو وہ منہ نام ہے جس کی ستر پوشی انسانی اخلاق پر اثر ڈالتی ہے۔ اس خیال کے حامی یہ بیان دیتے ہیں۔ کہ ہم جب تمام لوگ برہنہ حالت میں ہوتے ہیں تو کسی کی نظروں سے کوئی راز پوشیدہ نہیں رہتا اور حقیقت سامنے آ جاتی ہے اور اس سے اخلاق کو تقویت ملتی ہے مگر کون نہیں جانتا کہ انسانی اعضائے تناسل قابل دید چیز نہیں ہیں۔ ایسے بد صورت اعضا کو مستور رکھنا ہی بہتر ہے تاکہ جنسی کشش باقی رہے حقیقت کڑوی ہے مگر زندگی کی حقیقتوں سے لطف اندوز ہونے کیلئے زمان کی نگاہوں سے کام لینا چاہئے۔

ہاں تو ایک بات یاد رکھئے۔ یہ بات کبھی فراموش نہ کیجئے کہ آپ ایک شخصیت کے مالک ہیں۔ اس لئے دوسروں کی جے جے تقلید مناسبت نہیں ہے۔ لباس کے معاملہ میں بھی نقل کرنا درست نہیں۔ یہ ضروری

نہیں کہ ایک لباس جو دوسرے کے جسم پر بھلا معلوم ہوتا ہے۔ وہ تمہارے جسم پر بھی دل دین نظر آئے اس لئے لباس کے معاملے میں تجربات کرو۔ سوٹ پہنو۔ اچکن بھی پہن کر دیکھو۔ شلوار قمیص بھی پہنو۔ ہر قسم کا رنگ۔ ہر کاٹ اور ہر نشین کا تجربہ کرو۔ اور پھر کوئی نتیجہ اخذ کرو کہ تمہیں لون سا لباس زیادہ زیب دیتا ہے۔ دوستوں سے صلاح و مشورہ لے سکتے ہو۔ لباس کے رنگ کی جسم کے انگ سے مطابقت ضروری ہے۔ ایک عیشتی کو سفید رنگ زیب نہیں دیتا۔ ہلکا آسمانی یا نیلا یا بھورا زیادہ موزوں ہوگا۔ لباس کی خوبصورتی اتنی اہم نہیں جتنی کہ تمہاری شخصیت۔ اس لئے ایسا لباس پہنو۔ جس سے تمہاری شخصیت کو چار چاند لگ جائیں۔ دُور سے لوگ تمہیں پہچان لیں۔ یہ نہ ہو کہ ہجوم افراد میں تم بھی گم ہو جاؤ۔ — اچھا تو اب آپ اسلامی نقطہ نگاہ سے ان امور پر روشنی ڈالیں۔

انصر! کھانے پینے کے متعلق قرآن پاک یہ احکام دیتا ہے کہ کھاؤ پیو۔ مگر عد سے تجاوز مت کرو جو چیز صاف ستھری اور صحت مند ہو۔ اسے کھاؤ۔ مگر شیطان کی پیروی مت کرو۔ کیونکہ وہ تمہارا دشمن ہے۔ — جو لوگ ایماندار ہیں۔ ان پر یہ چیزیں حرام کر دی گئی ہیں یعنی مُردہ جانور کا گوشت۔ خون۔ سُور کا گوشت۔ وہ غذا یا گوشت جو غیر اللہ کے نام پر ذبح یا قربانی میں پیش کیا گیا ہو۔ — کوئی جانور جو کھلا گھونٹنے سے مر گیا ہو۔ یا گرہ کر مر گیا ہو۔ یا سینگوں سے زخمی ہو کر مر گیا ہو۔ یا کسی درندے کا شکار ہو گیا ہو۔ حلال وہ گوشت ہے جو خدا کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔ ان کے جواز میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ کوئی تہذیب انسان یہ چیزیں کھانے کی طرف رغبت نہیں کر سکتا۔ اعراض صرف سور کے گوشت اور غیر اللہ کے نام پر ذبح کئے ہوئے جانور کا ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے طبی مائیں شاذ ہے کہ سور کا گوشت صحت کے لئے مُضر ہے۔ وہ بے جیا جانور ہے۔ اس کے کھانے سے بھائی پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ تم وہی کچھ بنتے ہو۔ جو کچھ کہ تم کھاتے ہو اور یہ ایک حقیقت ہے۔ کیونکہ سور گندگی بھی کھاتا ہے۔ اس کا گوشت بھی ناپاک ہے اور غیر اللہ کے نام پر ذبح یا قربان کئے ہوئے گوشت کو کھانا تو وحدت حق کو تسمیہ کرنے والے کی خود اپنی تزیلیل ہے۔

آپ کو مائیکل صاحب کوئی اعتراض ہو تو بتائیے۔“

مائیکل : سائنس کا رسول میں بتا چکا ہوں۔ باقی اپنی اپنی پسند ہے۔ جاپان کے لوگ چوتھے تک کھا جاتے ہیں۔ فرانسیسی مینڈک کے بہت شائق ہیں۔ کھانے والوں کا دعوے ہے کہ مینڈک کے گوشت ایسا لذیذ اور کوئی گوشت نہیں۔ بعض افراد ایسے ہیں۔ جو بکری کا گوشت پسند کرتے ہیں۔ مگر گروے اور پھیپھڑے۔ زبان دُم وغیرہ کو چھوڑتے بھی نہیں۔ اس لئے ان باتوں پر کبھی کو بھی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ جو لوگ اپنے مذہب کا احترام کرنا چاہتے ہیں۔ شوق سے کر سکتے ہیں ہاں سعید صاحب آپ نے کیا نتیجہ اخذ کیا ہے؟

سعید : جو چیز کسی کو پسند آئے کھا سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ طبی نقطہ نگاہ سے مضر صحت نہ ہو۔ اگر کوئی شخص مذہب کا احترام کرتا ہے اور کسی خاص چیز سے پرہیز کرتا ہے۔ تو اس میں مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ کھانے پینے کے معاملے میں اگر کوئی غلط روش اختیار کرتا ہے تو اسے مشورہ دینا سماج کا فرض ہے۔ محبت سے اس کی اصلاح کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ انصر صاحب آپ نے لباس کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔

انصر : اسلام اچھے لباس کی تلقین کرتا ہے۔ لباس کا پاک و نما ہونا اسلام میں نماز کے لئے ضروری ہے۔ خدا کی نعمتوں سے لطف اندوز نہ ہونا کفرانِ نعمت ہے۔ اللہ تو صرف فضول خرچی سے منع کرتا ہے تاکہ مخلص و نادار انسانوں کو بھی فائدہ پہنچا سکے۔ لباس کو مخصوص کرنے سے مختلف مذاہب کا مقصد یہ ہے۔ کہ ان کے پیروکاروں کی شناخت ہو سکے۔ مسلمانوں کو داڑھی۔ سکھوں کے بال۔ ہندوؤں کی چوٹی اور عیسائیوں کی صلیب اس اصول کی آئینہ دار ہے۔ مگر ان ظاہری صورتوں کا مذہب کے مقصد کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ یہ تقلیدِ جذبہ احترام سے منسوب ہے۔ مذہب کسی مخصوص لباس پر مبنی نہیں ہو سکتا۔ مذہب

کا تعلق دل سے ہے۔ اپنے مذہب کے بانی کا کوئی جتنا چاہے احترام کر لے۔ یہ اس کا انفرادی فعل ہے۔ کسی کو مجبور کرنے کا آسے کوئی حق نہیں۔ جو جی میں آئے۔ پہنو اور دوسروں کو اُن کی اپنی مرضی کے مطابق پہننے دو۔ اپنی اپنی پسند ہے۔ رواداری تہذیب کی روح رواں ہے۔ اگر ایک انسان دوسرے انسان کی مختلف پسند کو برداشت نہیں کر سکتا۔ تو وہ مذہب کہلانے کا حق دار نہیں۔ ایک ہی لباس کسی قوم یا جماعت کو منظم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اور بذاتِ خود کوئی مقصد نہیں۔ اس لئے کوئی مخصوص لباس یا ظاہری صورت وجہٴ منافرت نہ ہونی چاہئے۔“

دوسرا باب

عشق حبسی بھوک شہوت خوبصورتی اور عورت کا باہمی تعلق

رستوران پہنچا۔ تو شام لال کو وہاں موجود پایا۔ بنگلہ ہونے کے بعد میں نے اس سے جلدی اور اچانک آجانے کی وجہ دریافت کی۔ بڑی افسردگی سے بولا: ”آؤ علیحدہ کمرے میں بیٹھ کے بات کریں“ شام لال: ”پچھلے چند دنوں کے قیام کے دوران میں ایک دن میں منہ چا گیا تھا۔ آپ کو میری طبیعت کا حال معلوم ہے۔ جب بچی کوئی حسین صورت نظر آتی خوش ہو گیا۔ میں عشق کا تو قائل نہیں ہوں جب دل چاہا دو چار گھڑی کے لئے معشوق ہتیا کر لیتا ہوں۔ مگر میرے دوست خدا جانے اُس دن میرے دل کو کیا ہو گیا۔ بس اسے دیکھ کے محیرت ہو گیا۔ سفید ساری میں بلوس یوں نظر آتی تھی۔ جیسے سنگ مرمر کا تراشہ جو آبت حرکت میں ہے۔ اس پر تم یہ تھا کہ اُس کے شانوں پر وہ دست ناگ جھومتے ہوئے نظر آتے تھے۔ آنکھیں نہیں کھول کے پھول کیلئے ہوئے تھے۔ پیارا اور کامل جسم مل کھا رہا تھا۔ کیا بتاؤں کہ وہ کیا تھی۔ بس سمجھ لو کہ ایک پکیر نور تھی۔ ایک شعلہ ہوا لافنی۔ اس کا نام تپ وینا کماری۔ ٹٹری میں لکھ رکھا ہے۔“

مجھ سے مہنی ضبط نہ ہو سکی۔ آخر تم بھی حسن کی گرفت میں آ ہی گئے۔“

شام لال ۛ سنو تو۔۔۔ ہاں میں نے مٹنے کی بڑی کوشش کی۔ مگر ناکام رہا۔ کیونکہ مجھے دوسرے جانا تھا۔ اس لئے زیادہ دیر ٹھہر نہ سکا۔ مگر وہاں اتنے دن کس طرح کاٹے ہیں۔ یہ میں ہی جانتا ہوں۔
— آہ —

یہ خال سیہ زلفِ دو تا گیسوئے مشکیں
تجھ سی نہیں وینا میں طرہ حصارِ حسینہ
”مکرر! مکرر! مائیکل اور انصر نے بلند آواز سے کہا۔

میں نے شام لال کی داستانِ دہرائی اور مائیکل سے اُس کی نفسیات پر گفتگو کرنے کی درخواست کی۔ مائیکل نے فطری ضروریات کا نقشہ نکال کر میز پر پھیلادیا اور پھر بولا:-

مائیکل ”عشق و محبت کے احساسات کے پس پردہ دو جذبات کام کرتے ہیں۔ ایک تو شہوت یا جنسی کشش۔ دوسری خواہش تعاقب ابد لذتِ شکاہ۔ جب آپ یہ کہتے ہیں کہ مجھے فٹ بال۔ ناولوں یا فلموں سے عشق ہے۔ تو اُس کے معنی ہیں کہ ان مشاغل میں آپ کو بے حد دلچسپی ہے۔ اُن کے تعاقب سے آپ کو مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک سائنس دان یا شاعر اور فلسفی کو اپنے علم یا آرٹ سے عشق ہوتا ہے۔ آرٹ کو یا یہ تکمیل تک پہنچانے میں جدوجہد کرنا۔ یا علوم میں اضافہ کرنا سب اسی جذبہ کے ماتحت عمل میں آتے ہیں۔ وحشی انسان جذباتی طور پر شکاکا تعاقب کرتا ہے اور کسی جانور کو شکار کر کے تسکینِ قلب حاصل کرتا ہے۔ مگر تہذیب یافتہ انسان اسی جذبہ کی بے شمار طریقوں سے تسکین کرتا ہے۔ انسان خوبصورت اشیاء۔ مثلاً عورت۔ تھوڑی۔ عمارات۔ زیورات لباس وغیرہ کا شائق ہے جس میں بے پناہ کشش ہے اور کشش تعاقب کرنا کہ جس کی پیچھے حصول کے لئے سعی کرنا اور اُس چیز پر تسلط پا کر مسرت محسوس کرنا وغیرہ تمام خواہشات و جذبات اور احساسات کا پیش خیمہ ہے۔ جو چیز آپ کی نظروں میں نہیں۔ جو آپ کی کشش کا باعث نہیں بن سکتی۔ اس کے حصول کے لئے آپ کو کشش نہیں کرتے۔ اُس کو فوکار کر لے کی آپ کو فکر نہیں ہوتی۔ یعنی آپ کو اس چیز سے کوئی عشق یا محبت نہیں ہوتا۔ یہ ہے حقیقت۔ ایک حسین عورت یا کسی حسین جانور یا یہ جان چیز کے عشق کی۔ اب دوسرے پہلو کو لیجئے۔ جب آپ والدین۔ رشتہ داروں۔ دوستوں۔ عزیزوں یا بھائیوں

یا اپنے بیوی بچوں سے عشق و محبت کا تذکرہ کرتے ہیں تو اُس سے مراد اُنس - اُلفت - شفقت - ہمدردی وغیرہ ہوتی ہے۔ ان تمام تعلقات کے پس پردہ جذبہ شفقت کام کرتا ہے۔ اسی لئے ان تعلقات کو پاک محبت یا بے غرض عشق کا نام دیا جاتا ہے۔ اس عشق کی روح رواں عشقِ انیسٹا ہے۔ رفاقتی، رھمائی، ایشیا، سخاوت ان سب کا اسی جذبے میں شمار ہوتا ہے۔ ایک ماں لدا اُس کے بیٹے کی محبت، دو دوستوں کی باہمی محبت ایسی ہی بے غرض محبت کی مثالیں ہیں۔ ایک شاعر کی نظم کا میں مطلب پیش کرتا ہوں۔ اس کا محبوب بھند تھا کہ وہ اس کے ساتھ شادی نہیں کرے گی۔ جب تک وہ اپنی ماں کا دل نکال کر اُسے بطور ہدیہ پیش نہ کرے عشقِ اندھا اور دیوانہ ہوتا ہے۔ ماں کا سینہ چیر کر دل نکال لیا۔ راستے میں ٹھوکر کھائی اور گر پڑا۔ اسی وقت ماں کے دل سے ایک پیار بھری آواز آئی۔ میرے پیارے بیٹے، کہیں تیرے چوٹ تو نہیں آئی۔ ماں کی ماتنا ضربِ اشل ہے مگر پھر بھی ایسے انسان موجود ہیں۔ جو اپنے والدین کو دکھ پہنچاتے ہیں اور اُن کی بے عزتی تک کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ اس محبت کے بعد بہن، بھائی اور دوسرے رشتہ داروں اور ہمسائیوں وغیرہ کی اُلفت ہے۔ جذبہ ایک ہی ہے مگر شفقت کی شدت کے درجے کم اور زیادہ ہیں۔ مگر خون کے رشتوں سے بڑھکر دوستی کا رشتہ ہے۔ جو بے غرضی اور ایشیا کا مرکب ہے۔ دوستی میں دو جذبے کا فرما ہیں ایک شفقت اور مہربانی، دوسرا اپنے بھجنوں کی صحبت کی تشنگی۔ ایک مثل مشہور ہے کہ تمہارے دوست تمہارے اپنے انتخاب کا نتیجہ ہیں۔ مگر تمہارے رشتہ دار واقعات کی پیداوار ہیں اور یہ حقیقت ہے۔ تمہاری چچی اس لئے چچی ہے کہ وہ تمہارے باپ کے بھائی کی بیوی ہے۔ خواہ تمہیں اس سے رغبت ہو یا نہ ہو۔ اسی طرح تمام خون کے رشتے ہیں۔ اگر کسی رشتہ دار سے تمہاری دوستی ہو جاتی ہے۔ یا بھی اُنس یا پیار کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے تو پھر تمہارے محسوسات میں غلضات رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ ورنہ یہ معاملہ وضع واری کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ظاہر میں اُلفت مگر باطن میں حسد اور دشمنی۔ یہ عام اصطلاح میں محبت کے معنی ہیں۔ اب یحییٰ عشق و محبت کا مخصوص اصطلاحی مطلب۔ یعنی جنسی مواصلت کی خواہش اس زبردست خواہش کے پس پردہ میں جنسی کشش کا فرما ہے۔ جو مخالفت جنسوں کو ہمکنار کرتی ہے۔ اس کی وضاحت میں ابھی کرتا ہوں۔ مگر اس امر کا یہاں ذکر کرنا ضروری ہے کہ جنسی کشش یا شہوانی

جذبات ایک ہی جنس کے دو افراد میں بھی عام طور پر پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ دونوں مخالف جنسوں کا ایک دوسرے سے دور رہنا۔ جس سماج میں عورت اور مرد کے درمیان کوئی واسطہ نہ ہو۔ وہاں لازمی طور پر یہ فطری جنسی کشش ایک غیر فطری طریقہ اختیار کر لیتی ہے۔ عام طور پر سکول کے لڑکے اور لڑکیاں آپس میں اپنے ہم جنسوں پر عاشق ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ جذبہ تو ایک دریا ہے۔ جو اپنے لئے راستہ بنائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ البتہ آپ بہاد کا رخ بدل سکتے ہیں۔ بند لگا کر اس بہاد کو نہروں میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ مگر دنیا کی ہستی کو نہیں مٹا سکتے۔ اس لئے جب جنسی کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ اس وقت جو راستہ اس بہاد کو اپنے ماننے کھلا ہوا دستیاب ہوتا ہے۔ وہ اس پر گامزن ہو جاتا ہے۔ جس سماج میں لڑکے اور لڑکیاں اکٹھی تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ وہاں کسی لڑکے کی لڑکی سے محبت ہونا لازمی امر ہے جہاں لڑکے لڑکوں کے ساتھ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ وہاں لڑکے لڑکوں پر عاشق ہو جاتے ہیں اور لڑکیاں لڑکیوں پر۔ یہ ایک حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ سکول سے خارج ہونے کے بعد جب اپنی مخالف جنس سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے تو وہی جذبہ اپنا صحیح راستہ اختیار کر لیتا ہے جنسی کشش وہ سرزمین ہے جس سے عشق و محبت کا حسین پودا پھوٹ کر کھیل اٹھتا ہے۔ حسن بھی ایک خاص فعل سر انجام دیتا ہے یعنی مصلحت کے لئے ترغیب۔ مرد عورت کے تعلقات میں اس لئے دو قسم کی کششیں کارفرما ہیں۔ ایک تو جنسی کشش ہے جو جنسی بھوک کی تسکین چاہتی ہے۔ دوسری حسن کی کشش جو شکار اور تعاقب کے جذبات کی تکمیل چاہتی ہے۔ اس لئے مرد عورت کی محبت بہت شدت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ تو عشق کا ظاہری رخ ہے۔ اب باطنی یا محسوساتی پہلو پر غور کیجئے۔ انسان میں دو اوجہ جذبات بھی اپنی تسکین چاہتے ہیں۔ یعنی شفقت اور دوستی کی خواہش۔ مثلاً مرد یہ چاہتا ہے کہ کوئی ایسی ہستی جو اسے پیار کرے۔ اس کی خاطر ایثار کرے۔ اس کا دکھ سکھ میں ساتھ اس کی زندگی میں صحیح معنوں میں رزق کار اور رفیق حیات بن سکے۔ ان جذبات کو ہم محبت کا نام دیتے ہیں۔ اس لئے مرد عورت کے تعلقات دو اقسام میں بٹ جاتے ہیں عشقیہ اور محبانہ صرف عشقیہ جذبات کو ہم جذباتی محبت یا زکام کہہ سکتے ہیں۔ حقیقی عشق وہی ہے جو ویر پا ہو۔ جو وفا کی رسی سے مضبوطی کے ساتھ باندھ دیا گیا ہو۔ جسمانی محبت تو مرد عورت سے ممکن ہے۔ شہوت

کو تو اور طریقوں سے بھی تسکین دی جاتی ہے۔ مثلاً جلتی اور اғلام کی قبیح عادات سے۔ مثال کے طور پر ایک شخص اپنے دوست اور اُس کی محبوبہ کی صحبت میں بیٹھا ہوا ہے۔ عاشق اپنے محبوب کی قربت سے اور اُس کی ہریات سے لطف اندوز ہوگا۔ اس کے جسم میں سجلیاں دوڑ جائیں گی۔ مگر دوست کو اس عورت کے لمس سے کوئی سنسناہٹ پیدا نہیں ہوگی۔ کیونکہ شہوت نوجوانی اتصال کا تقاضا کرتی ہے۔ مگر محبت روحانی یا ذہنی طلب کا۔ لبوں کی چاشنی سے وہی لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ جس کو وہ لب محبوب ہوں۔ ورنہ لبوں کا کوئی ذائقہ نہیں حقیقت میں وہ بالکل پھیکے ہیں مگر عاشق کے لئے شہد بلکہ شہد سے بھی زیادہ شیریں۔ یہ ہے فرق شہوت اور عشق میں۔ میں نے ان تمام جذبات کی وضاحت اسلئے کی ہے تاکہ آپ شہوانی جذبات عشق اور حقیقی محبت میں امتیاز کر سکیں۔ صحیح طور پر جان سکیں کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ کھوٹے اور کھرے میں تمیز کر سکیں۔ کیونکہ ہر کوئی عاشقی کا دعویٰ کرتا ہے۔ شہوانی جذبات کی بیداری اور اشتعال کو محبت تصور کرتے ہیں۔ پھر بعد میں کچھ پتہ چلتا ہے عشق و محبت کے موضوع پر مجھے ابھی بہت کچھ کہنا ہے۔ مگر سب پہلے حسن اور عشق پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ حسن و عشق کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ حسن میں وہ باؤد ہے جو عشق کے دیوتا کو بیدار کرتا ہے۔

نہم لال۔ مائیکل صاحب! مجھے کوئی تدبیر بتاؤ۔ میری توجان پر پنی ہوئی ہے۔

انصر۔ گھبراؤ نہیں۔ یہ سب تمہارا ہی علاج ہو رہا ہے۔ قابل ستائش ہے وہ خالق جس نے دنیا حسین اشیا سے مزین کی اور انسان کو شرف بخشا کہ وہ ان سے لطف اندوز ہو سکے۔

مائیکل۔ لفظ حسن بھی کئی معانی میں مستعمل ہوتا ہے۔ ہر حسین شے باعث مسرت ہے۔ کوئی بھی انسان جو کور ذوق نہیں۔ ایسے دلائر منظر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مثلاً تو سنی سنچ۔ ساون کے بادل۔ پھول۔ سرسبز وادیاں۔ برفانی چوٹیاں۔ دریا کا تلاطم۔ منجمد بشاریں۔ یہی نہیں ایک شاعر کی نگاہ سے دیکھو تو تمہیں ہر چیز میں حسن و خوبی مارتا ہوا نظر آئے گا۔ مثلاً سعید مرمریں پلٹیں اور پیالے کیبل کا مروانہ بوسہ۔ ایک بھاری آنجن کے دل کی دھک دھک مر جھلے ہوئے پھول اور پتے۔ فولاد کی سنستی۔ چادروں کا پُر لطف لمس۔ چھیلے ہوئے آؤ۔ ایک زس کی شفقت بھری مائیکلوں کا لمس۔ کہاں تک بیان کروں حسن میں ہزاروں نیرنگیاں ہیں۔ ڈوبتے سورج اور چڑھتے چوئے

مُورج کا شعلہ گوں چہرہ۔ بارش سے نہائے ہوئے پھول اور گھاس کی تپیاں۔ جہاز کے عرشہ پر کھڑے ہوئے اجنبی ساحل کا اولین منظر، سبھی حُسن کی دولت سے مالا مال ہیں مگر ایک عورت کے حسین جسم کے سامنے سب ماند ہیں۔ بیشک اگر جاوَدُ دُنیا میں کوئی حقیقت ہے تو وہ عورت کی آنکھیں ہیں۔ اس کے ہونٹ اور اس کے بال ہیں۔ اُس کی آواز ہے۔ عورت سرتاپا حُسن ہے۔ جمالیات سے متاثر نہ ہونے والے انسان کیلئے عجائب گھر میں موزوں جگہ ہو سکتی ہے۔“

شام لال ”حُسن کا عشق کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ اس کی وضاحت فرمائیے۔ اور خدا کے لئے میرے لئے نسخہ بھی تجویز کیجئے۔“

مائیکل ”حُسن سے آنکھوں کو راحت اور رُوح کو مسرت حاصل ہوتی ہے حُسن میں ایک کشش ہے۔ ایک سحر ہے جو دل و دماغ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ دل اُس حسین چیز کا قرب پا بننے لگتا ہے۔ تعاقب اور شکار کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔ تسکینِ قلب حُسن کے حصول پر منحصر ہے جس قدر شدت سے یہ جذبہ اُبھرتا ہے۔ اُسی قدر عشق بھی شدت اختیار کرتا ہے۔ اس لئے عشق کی لذت اور مدت خواہش حصول یا آرزوئے اتصال کی شدت پر موقوف ہے اور جب تک حُسن عشق کی گرفت میں نہیں آتا عشق بہتر اور رہتا ہے۔ بس یہی حقیقت عورت اور مرد کے تعلقات پر بھی عائد ہوتی ہے جب حُسن کی کشش یا اجنبی کشش مویا عورت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ تو جذبہ عشق بیدار ہو جاتا ہے خواہش وصل اس کا لازمی نتیجہ ہے اور اس لئے عاشق مجبور کے حصول کی ہر ممکن طریقے سے کوشش کرتا ہے۔ ایک بات قابل غور یہ ہے کہ عاشق کی ہر ممکن قربانی بھی خود غرضی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ کیونکہ اپنے محبوب کی رضا میں خود اس کا نفس ایک مسرت محسوس کرتا ہے۔ اس لئے عشق یا اجنبی محبت بے غرض نہیں کہی جاسکتی عشق اور حُسن لازم و ملزوم ہیں۔ قدرت نے حُسن میں جو بے پناہ کشش رکھی ہے۔ اس کا بھی ایک مقصد ہے۔ یعنی خالف جنسوں کا وصال پودوں اور درختوں کے پھول بھی یہی فعل سرانجام دیتے ہیں۔“

نباتیات سے یہ ثابت ہو چکا ہے۔ پھول بھی نر اور مادہ قسم کے آلات جنسی رکھتے ہیں۔ چونچر پنڈ اور کیرے کوڑے کبھی اس پھول پر پیٹھتے ہیں۔ کبھی اُس پر۔ اور اس طرح پھولوں کے باہمی اتصال

کا موجب بنتے ہیں جب مادہ پھول حاملہ ہو جاتی ہے تو پھول محب کر پھل یا بیج میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح حیوان اور تمام جانور جنسی کشش کے باعث مواصلت کرتے ہیں اور وصل سے قبل ایک دوسرے سے عشق کرتے ہیں۔ تعاقب کرتے ہیں اور شکار کر کے اپنے بس میں لاتے ہیں۔ وحشی انسان اسی لئے جذبہ عشق کی فطری طور پر تکمیل کرتا ہے یعنی اپنے محبوب کو زبردستی شکار کر کے لے جاتا ہے اور پھر اس کی دلداری اور ناز برداری کرتا ہے۔“

شام لالؒ تو کیا مور اور کبوتر اپنی اپنی مادہ کے آگے پر پھیل کر اور اکڑ اکڑ کر اسی لئے مرگشت کرتے ہیں۔“

مائیکلؒ۔ بس یہی وجہ ہے کہ آج آپ بھی سر سے پرتک نفاست کا مجبوفہ نظر آ رہے ہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ عشق کا جذبہ کس قدر زبردست ہے۔ اسی قوت کے پس پردہ دو قسم کی کشش کا فرما ہیں۔ ایک جنس کی، دوسری جنس کی اس لئے عام انسان اس جذبہ پر مشکل سے قابو پا سکتا ہے۔“

انصرؒ۔ مگر جنس کا معیار کیا ہے؟ یہ کیسے معلوم ہو کہ حسین چیز کو کنسی ہے؟ مثال کے طور پر شام صاحب کی دینا کو میں نے بھی دیکھا ہے۔ مجھے تو کوئی خاص جاذبیت یا حسن نہیں نظر نہیں آیا۔ حالانکہ سننے میں آیا ہے کہ اس کے چاہنے والے ایک درجن سے کم نہیں۔

مائیکلؒ۔ معیاری حسن کے متعلق ہم عام لوگوں کی رائے سے کام لیتے ہیں مثلاً بڑی بڑی آنکھیں۔ گول چہرہ۔ نکھر ہوا رنگ۔ کالے بال۔ گداڑ جسم۔ یہی ہندوستان کا معیاری حسن ہے۔ گلابی رنگ۔ سنہری بال، بتوری آنکھیں، مناسب جسم۔ ستواں ناک وغیرہ مغربی حسن کا معیار ہے۔ اسی طرح حبشیوں اور چینوں کا اپنا اپنا معیار ہے۔ جسے دوسری قومیں قبول نہیں کر سکتیں مثلاً بے حد موٹے ہونٹ، سیاہ چمکدار رنگ، عیشیوں کو پسند ہے۔ اگر کوئی بچہ سانولے رنگ کا ہو تو اسے تیل مل کر دھوپ میں لٹا دیتے ہیں۔ تاکہ وہ بھی سیاہ اور چمکدار ہو جائے۔“

شام لالؒ۔ چینی تو اس کو حسین تصور کرتے ہیں۔ جس کے چھوٹے چھوٹے پاؤں ہوں اور آنکھوں کی جگہ دلخیریں ہوں۔ سینہ پاٹ ہوا اور جسم پر کہیں بال نہ ہوں۔“

مائیکلؔ یہ تو ہوا معیاری حسنؔ انفرادی مذاق کے مطابق ہر فرد کا اپنا اپنا معیار ہے۔ مثال کے طور پر انفر صاحب نے دینا کو اپنے معیار کے مطابق رد کر دیا۔ ان کو اس میں کوئی حُسن نظر نہ آیا مگر شام صاحب کے دل سے پوچھئے۔ یا ان کی آنکھوں میں بیٹھ کر دیکھئے۔ یہی دینا ماہِ جبین ہوگی۔ اسی لئے عشق کا جذبہ ایک بالکل انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر شخص کی زندگی میں اس کا رومان یا عشق ایک علیحدہ نوعیت رکھتا ہے۔ حالانکہ ہر عسفیۃ افسانے کا یہی پلاٹ ہے کہ کسی کے حُسن کا کوئی گردیدہ ہو گیا۔ یا کسی سے محبت ہو گئی۔ فراق و وصل کی منزلیں طے کرنے کے بعد کوئی کامراں لوٹا۔ کوئی سملج کی مداخلت کا شکار ہو گیا۔ شادی کی اجازت نہ ملی۔ کوئی سسکتا ہے۔ کسی نے زندگی کو ختم کر لیا۔ افسانے کے جزئیات یہی ہوں گے۔ الفاظ البتہ ضرور مختلف ہوں گے۔ اور واقعات میں بھی نیرنگی ہوگی مگر جذبات وہی ہوں گے۔ اس لئے ہر عاشق کے لئے۔ اس کا ذاتی تجربہ ایک الگ اہمیت رکھتا ہے جس شخص نے کبھی عشق نہ کیا ہو۔ وہ اُس کی حقیقی لطافتوںؔ مسرتوںؔ اور اندوہناکیوں سے واقف نہیں ہو سکتا ہر انسان ایک علیحدہ شخصیت کا مالک ہے۔ اس لئے ہر زمانے کا انسان یہی قصہ دہراتا آ رہا ہے۔ افسانہ فرمودہ ہی سہی مگر اس کی چاشنی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ شام صاحبؔ میں بھی عشق و محبت کے دور سے گزر چکا ہوں۔ ناکامیوںؔ اور نامرادیوں کا مُنہ دیکھ چکا ہوں۔ اس لئے مجھے آپ سے ہمدردی ہے آپ کی دینا آپ کے معیار پر پوری اُتری کشش پیدا ہوئی۔ عشق نے مجھ کو بالہ سا بنا دیا۔ جس سے آپ کی نظروں میں اور کوئی چیز نہیں۔ اگر ایک لڑکی کا محبوب دراز قامت ہے تو وہ یوں کہتی ہے۔ کہ مرا ز قد مرد اسے بہت پسند ہیں۔ پست قامت مرد سے کیا عشق ہو سکتا ہے۔ اگر اس کا محبوب شام صاحب کی طرح ہے تو وہ یہی کہتی ہے۔ کہ مرا ز قد مرد بھی کوئی عشق کے قابل ہے۔ وہ تو مجھے نوٹ دکھائی دیتا ہے۔ ایسے مرد کے ساتھ چلنا ایک مصیبت ہے۔ بات کرنی ہر نوگردن اُوپر پہنچو۔ مطلب یہ ہے کہ اگر عشق ہے تو محبوب کی خامیاں بھی خوبیاں ہیں۔ اگر عشق نہیں ہے تو خوبیاں بھی کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ مگر مائیکل صاحب! آپ کی رائے میں کیا عورت ہی حُسن ہے۔ عورت کیا ہے۔ ایک چھوٹی چھوٹی ٹانگوں والی بھدی سی مخلوق۔ بچے پیدا ہوئے اور بس حُسن و جمال رخصت۔ کیا مرد کا حُسن عورت سے زیادہ پائدار نہیں ہے؟ اُس کی طویل قامتؔ افزائِ سیزہؔ ورنہ نشی جسم۔ ایک بے پناہ

سُن رکھتا ہے۔“ میں نے کہا۔

مائیکلؑ بلاشبہ مروجی حسین ہے اور اپنی نظیر آپ ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ عورت عنائی نزاکت اور لطافت کا مجسمہ ہے۔ مرد توانائی اور قوت کا آئینہ وار ہے۔ مرد کا طاقتور جسم اس بات کا متقی ہے کہ عورت کے حسین اور گداز باز دُاسے اپنی آغوش میں لے لیں اور عورت کا نرم و نازک جسم یہ اقتضا کرتا ہے کہ مرد کے طاقتور بازو دُاس کی حفاظت کریں۔ مرد اور عورت ایک دوسرے کے بغیر تشنہ ہیں۔ اس کے متعلق قدیم یونانیوں کا نظریہ دھپسی سے خالی نہیں۔ ان کے خیال میں ابتدائی انسان بالکل گول تھا۔ اس کے چار بازو اور چار ٹانگیں تھیں۔ سر ایک تھا مگر چہرے دو تھے۔ وہ بڑی تیزی سے چاروں اطراف پاؤں کی حرکت میں لے آتا تھا۔ اس کی قوت بے پناہ تھی۔ وہ دیوتاؤں پر بھی حملہ کرنے سے باز نہیں رہتا تھا۔ دیوتاؤں نے سوچا کہ اس مخلوق پر برقی گرا کر اسے ہلاک کر دیا جائے مگر سانہ ہی ندمو نیاز اور پرستش کا خاتمہ بھی گوارا نہیں تھا۔ آخر بڑی سوچ بچار کے بعد سورج دیوتا کو ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے یہ مشورہ کیا کہ انسان کو دو حصوں میں منقسم کر دیا جائے۔ اس طرح اس کا نور اور قوت آدھی رہ جائیگی۔ مخالفت اور قربانیوں کی تعداد دو گنی ہو جائیگی۔ وہ دو ٹانگوں پر کھڑا ہو کر چلے گا۔ اگر پھر بھی وہ ماز نہ آیا تو پھر میں اسے مزید دو حصوں میں کاٹ دوں گا اور پھر وہ ایک ٹانگ پر پھپکتا پھرے گا۔ یہ کہہ کر اُس نے ابتدائی انسان کو دو حصوں میں منقسم کر دیا اور اُس دن سے لیکر آج تک دونوں نصف جیتے باہمی اتصال کیلئے بیقرار رہتے ہیں اور جب کبھی ایک نصف اپنے دوسرے حقیقی نصف سے آفتاب سے تو دونوں باہمی اتصال کی لذت و مسرت میں کھو جاتے ہیں ان کی ذات کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ خیال بٹا اچھوتا ہے مگر حقیقت یہی ہے کہ مرد و عورت جب تک اُسے بیچاریق حیات نہیں مٹا۔ زندگی تشنہ تکمیل رہتی ہے۔“

انصرؑ نوگو یا شام کو اُن کا نصف حصہ باوجود کشش معلوم ہوتا ہے۔“

مائیکلؑ یہی امر لائق تحقیق ہے۔ عشق و محبت کے سارے ڈرامے کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا عشق و محبت کے جذبات کی بیداری۔ دوسرا محبوب کو اپنانا۔ تیسرا وصال محبوب عشق و محبت کے جذبات ہر انسان کے فحشیر میں داخل ہیں کسی میں یہ جذبات بیدار

ہونے نہیں پاتے۔ یا کبھی کبھی صرف ان جذبات کی آنکھ کھل جاتی ہے مگر جلد ہی پھر سو جاتے ہیں جیب کبھی پوری طرح پیدا ہوتے ہیں تو یہ آگ کی ننھی چمکاری شعلہ بن جاتی ہے کبھی یہ آگ آہستہ آہستہ سلگتی ہے اور کبھی ایک دم بھڑک اٹھتی ہے۔ پہلی قسم کو ہم تدریجی عشق یا محبت کہتے ہیں اور دوسری قسم کو پہلی نظر کا عشق یا جذباتی عشق کہتے ہیں۔ پہلی ہی نظر میں عشق کے جذبہ کا بیدار ہونا ایک حقیقت ہے۔ کوئی مفروضہ نہیں۔ جو لوگ انکار کرتے ہیں۔ وہ فطرتِ آدم سے لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں۔ اس فوری عشق کی فضیلت پر غور کرنے سے حقیقت آشکار ہوئی ہے کہ ہر مرد و عورت کے لاشعور میں اپنے پسندیدہ محبوب کی خیالی تصویر ہوتی ہے۔ یہ تصویر اس کے اپنے ہی خیالات یا آدرش کا عکس ہوتی ہے۔ مثلاً اگر وہ میں آدرش کا حصول بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدرش سے بھی زیادہ حسین و جمیل صفات کے مالک سے سامنا ہو جاتا ہے یا کوئی آدرش کے لگ بھگ پہنچتا ہے۔ اکثر اوقات دو انہی مرد و عورت ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں اور پہلی نگاہ ہی تاثر دیتی ہے کہ آدرش سامنے ہے۔ ہر نوجوان مرد و عورت اپنے دل میں یہ الفاظ مختلف صورتوں میں دہرا کر لے کر دنیا میں کہیں نہ کہیں ایسی ہی مٹی ضرور ہے جو میرے آدرش پر پوری اُترتی ہے جسے میں جان و دل سے پیار کر سکتا ہوں۔ ایک غرومند انسان ایسی ہستی سے دوچار ہوتے ہی۔ اپنے آدرش کے حصول کے لئے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کرتا۔ لیکن جوانی میں عشق کا جذبہ بڑی کچی نیند سوتا ہے۔ ذرا سی آہٹ پر بیدار ہو جاتا ہے۔ بہترین راغبیر پر قربان ہونا چاہتا ہے۔ اپنے آدرش کے حصول کا بھی انتہاء دُور بھر معلوم ہوتا ہے۔ ذہن کچھ دن تاثر رہتا ہے۔ پھر عکس دُعا لاپڑ جاتا ہے۔ یعنی عشق پھر سو جاتا ہے۔ ہر انسان کی طبیعت مختلف وافع ہوتی ہے۔ ایسے اشخاص بھی ہوتے ہیں جو ایک دفعہ کسی پر فریفتہ ہو کر اپنے ذہن سے محبوب کا عکس مشکل سے مٹا سکتے ہیں چمکاری ایک دم ایسی سلگتی ہے کہ حق من کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ ان کے نزدیک دنیا میں ایک ہی عورت سے عشق ممکن ہے۔ وصال نصیب ہونہ ہو۔ وہ دوسری عورت سے محبت گناہ سمجھتے ہیں۔ ایسے مجنون۔ شیریں فریاد اور سیر رانجھا کے عشق کی ہی حقیقت ہے۔

افسر۔ شام صاحب کا عشق کس قسم کا ہے؟

ماتیکل ۔ یہ امر تو واضح ہو گیا ہوگا کہ عشق و محبت کے جذبات کی دو صورتیں ہیں۔ ایک فوری اور دوسری تدریجی یا جذباتی یا محسوساتی عشق۔ منع دو دنوں کا جنسی کشش ہے۔ فرق صرف شدت اور مدت کا ہے۔ اکثر انسان اپنے آدرش سے ملاقات کا انتظار نہیں کر سکتے۔ ان کے نزدیک آدمی رُٹلی نہ ہونے سے بہتر ہے۔ بعض اس اصول پر کاربند رہتے ہیں کہ ملے تو ساری زندگی بچھ نہیں۔ ایسے صابر انسانوں کے لئے آدرش کا حصول کوئی غیر ممکن چیز نہیں۔ وہ اپنے نصف کے اتصال کا انتظار کرتے ہیں اور جب اتفاق سے اُن کی کہیں ملاقات ہو جاتی ہے۔ تو وہ ایک دوسرے کی طرف اس طرح کھینچے چلے جاتے ہیں جیسے لویا اور مفتاحِ طیس عشق ہر حالت میں عشق ہے کسی شامراہ پر ایک خانہ بدوش اور اس کی محبوبہ کی آنکھیں جب ایک شہزادہ سے اور اُس کی محبوبہ سے دوچار ہوتی ہیں تو ایک ہی قسم کی مسکراہٹ ان چاروں آنکھوں میں چمک اُٹھتی ہے۔ انسان سماجی حیوان ہے۔ وہ اکیلا زندگی بسر کرنا نہیں پسند کرتا اکثر افراد کی زندگی میں عشق کے جذبہ کی بیداری اُن کو مسرت سے ہمکنار کرتی ہے یا یارِ پیوں کے اتھاہ سمندر میں غرق کر دیتی ہے۔ ایسے بد نصیب انسان کے ذہن کے پردہ پر ایک ایسے چہرے کا پر توڑتا ہے۔ جو اسے تمام دنیا کے چہروں سے عزیز ترین ہوتا ہے۔ خوش نصیب ہے وہ شخص جس کی ذہنی تصویر حقیقت میں تبدیل ہو جائے۔ جوانی کے دن بیت جانے پر بھی جوانی کی جھلک جلوہ گرد رہتی ہے جب ایک خیریں آواز یہ کہتی ہوئی سنائی دیتی ہے کہ میرے محبوب مجھے اب بھی تم سے محبت ہے۔

شامِ لال ۔ میرا بھی شمار انہیں بد نصیب لوگوں میں ہوتا ہے جن کی قسمت میں محبوب سے ہمکنار ہونا نہیں لکھا گیا۔ وہ کم سے کم مجھ سے بات ہی کر لیا کرے۔

میں نے بے ساختہ یہ شعر پڑھا ہے

ہزار مجمعِ خوبانِ ماہِ رد ہوگا
نگاہ جس پہ پھٹ جانیگی وہ تو ہوگا

انصرؔ جذباتی عشق میرے بس کا رنگ نہیں۔ ہمدرد ستانی سماج میں عشق و محبت گاہ ہے تدریجی عشق کی ذرا وضاحت فرمائیے۔

ماتیکل ۔ تدریجی عشق اس قدر جذباتی نہیں ہوتا۔ دو انسان سرسری طوع پر ملتے ہیں۔ ایک

دوسرے کی جسمانی-ذہنی اور اخلاقی صفات کو پسند کرنے ہیں۔ یہ پسند رفتہ رفتہ عشق میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ اُلیست اور دوستی اس درجہ ترقی کر جاتی ہے کہ ایک دوسرے کے بغیر وہ طویل رہتے ہیں انہیں احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر زندگی خوشگوار طور پر بسر نہیں کر سکتے۔ یہ محبت مرد و عورت اور مجسموں میں دوستی کا سنگ بنیاد رکھتی ہے۔ ایسی محبت عشق کی طرح اندھی اور جذباتی نہیں ہوتی عشق کے جذبہ میں ظاہری حسن یا جنسی کشش کام کرتی ہیں۔ اس لئے خواہش وصال بہت شدت اختیار کر لیتی ہے اور عام طور پر وصال سے یہ جذبہ سرد پڑ جاتا ہے۔ قدرت کا اصول ہے کہ جو محبت دیر میں حاصل ہو وہ کم بھی بندریج ہوتی ہے جو عشق ایک دم شدت اختیار کر لے۔ وہ عارضی طوفان جذبات ہوتا ہے اور خود بخود فرو ہو جاتا ہے عشق میں شور کو بہت کم دخل ہوتا ہے۔ لیکن محبت شور کے سہارے پروان چڑھتی ہے۔ محبت انجام پر خور کرتی ہے عشق اندھا ہوتا ہے۔ وہ فوری تسکین جذبات کا خواہشمند ہوتا ہے عقل کی رہنمائی سے عشق کو نفرت ہے محبت کی بنیاد اس کے برعکس شفقت اور دوستی کے جذبات پر قائم کی جاتی ہے عشق اسی وقت تک استوار ہے جب تک حاصل کا حصول نہ ہو۔

شام لال۔ میری محبت نہ ہوئی عشق ہوا۔ مگر اس کا حشر کیا ہوتا ہے؟

مائیکل۔ اس سے قطع نظر کہ عشق جذبہ شکار یا جنسی کشش کی پیداوار ہے یا تدریجی محبت کا نتیجہ ہے۔ خواہش ہر صحتوں میں ایک ہی پیدا ہوتی ہے۔ یعنی وصال محبوب کی تمنا۔ عاشق کی تمام ہتھیاری بے خوابی، بچینی اور آہ و زاری کی بنیاد یہی خواہش ہے۔ عاشق کیا چاہتا ہے؟ وہ محبوب کا قرب چاہتا ہے۔ اس سے ملاقات اور گفتگو کرنے کا خواہاں رہتا ہے۔ اس کی نظروں سے اوجھل ہونا نہیں چاہتا۔ اس کے جسم پر تسلط چاہتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ایک اور خواہش بھی کروٹ لیتی رہتی ہے۔ یعنی اس کا محبوب بھی اس کے لئے بے قرار ہو۔ جسمانی تسلط تو زبردستی بھی قائم کیا جاسکتا ہے مگر یہ وحشیانہ فعل ہوگا۔ انسان تسکین قلب تو اسی صورت میں حاصل کر سکتا ہے جب محبوب خود اپنی رضا سے عاشق کو اپنا آپ سونپ دے۔ محبت کا جواب پیار سے دے۔ عاشق کے جذبات کا احترام کرے یعنی محبوب بھی خود محبت میں تبدیل ہو جائے۔ یہ عاشق کی حقیقی فتح ہوگی۔ شکار خود شکاری کے جال میں آجائے کسی بے جان چیز پر بھی تسلط قائم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے مالک

کی رضا حاصل کی جائے۔ خواہ دام دے کر یا کسی اور طرح مگر چوری یا زبردستی قابو میں لانا ناجائز ہے۔ زبردستی عشق و محبت کے معاملے میں کام نہیں آتی۔ محبوب کی رضا حاصل کرنے میں ایک زینہ کا کام ضرور دے سکتی ہے مثال کے طور پر ایک جوشی اپنی محبوبہ کو زبردستی اٹھا کر لے جاتا ہے۔ ایک چالاک شخص اپنی ہکاری سے محبوبہ کو اغوا کرتا ہے۔ یا سماج ایک مرد عورت کو جو ایک دوسرے سے قطعاً ناواقف ہیں شادی کے بندھن میں جکڑ دیتا ہے۔ یا ایک آزاد سماج کے افراد محبت کا باہمی رشتہ قائم کرتے ہیں۔ ان تمام صورتوں میں وصل کے دو ہی ممکن طریقے ہیں۔ رضا مندی سے یا مجبوری سے۔ زبردستی یا مجبور کرنا انسانیت سے گرا ہوا فعل ہے۔ جوشی انسان بھی اپنی محبوبہ کو اپنے بس میں لا کر وصال سے قبل اس کی رضا حاصل کرتا ہے۔ محبت اور ایشارے اس کے دل پر فتح پاتا ہے۔ اس لئے ایسی شادی جس میں طرفین کو مجبور کر کے یکجا کر دیا گیا ہو جیوانیت سے بذریعہ فعل ہے۔ کیونکہ جوشی انسان یا حیوان بھی اپنے قوت بازو سے مجبور کو حاصل کرتا ہے۔ اس کی محبوبہ اس کی اس جبراً کو پسند کرتی ہے۔ مگر اپنے جیسے ذلیل انسانوں کی اعانت سے اپنے محبوب کو شادی کے ذریعے بس میں لانا انسانیت کی توہین ہے۔ شادی سے قبل مرد عورت کا قطعاً ایک دوسرے سے ناواقف ہونے کی صورت میں رسم شادی کو ایک تعارف کی صورت تصور کر سکتے ہیں۔ اس تعارف یا پہلی ملاقات کا نتیجہ عشق بھی ممکن ہے اور تدریجی عشق بھی مگر وثوق سے کہنا محال ہے۔ کیونکہ

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب

کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

اس لئے یہ شادی شدہ جوڑا بھی کر سکتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو اپنانے کی کوشش کرے اور مل کر کشتی نجات کو کنارے لگائے یا غرق کر دے۔ دوسری طرف عاشق کے لئے بھی دو ہی راستے کھلے ہیں یعنی محبوب بھی محبت کا جواب دے یا انکار کر دے۔ اس لئے عشق و محبت کی دو صورتیں ہیں۔ ایک طرفہ محبت اور دوطرفہ محبت۔ اس مقام پر اگر دو راستے ہو جاتے ہیں۔ ایک راستہ فی وثوق صحرا کو جانا ہے اور دوسرا سرسبز وادی میں۔ ایک طرفہ عشق ناکام محبت کہلاتا ہے اس کی دو صورتیں ہیں۔ بعض لوگ قدرتی طور پر شرمیلے واقع ہوتے ہیں۔ اگرچہ وہ انتہائی شدت سے کسی کو

چاہتے ہیں مگر زبان سے اس کا اظہار نہیں کر سکتے۔ اس طرح اپنے محبوب کو دل میں بٹھا کر اس کی پرستش کرتے رہتے ہیں غرض کہ یہی بیت جاتی ہے۔ ایسی محبت کو خاموش محبت کہتے ہیں۔ سچی اور گہری محبت اکثر اوقات خاموش ہو جاتی ہے۔ کیونکہ الفاظ ہی محبت کا ثبوت نہیں ہیں بلکہ محبت بھرے الفاظ سننے کی خواہش ہر دل میں موجزن ہوتی ہے محبوب کی زبان سے ادا کیا ہوا ایک لفظ بھی جام کوثر سے کم نہیں ہوتا۔ ویسے بھی پیام محبت کو محبوب تک پہنچانا ایک لازمی امر ہے۔ یہ عشق کا دوسرا زینہ ہے۔

شام لال۔ ”بھئی میرے مطلب کی بات اب کہی۔ پیام پہنچانے کی صورت مجھے جلد ہی بتا دیجئے“
 مائیکل۔ ”محبوب تک پیام دوہی طریقوں سے رسائی پاسکتا ہے۔ بالواسطہ یا بلاواسطہ۔ یعنی اپنی زبان یا پیامبر کی وساطت سے خط بھی پیامبری کا فرض سر انجام دیتا ہے۔ اس سلسلے میں تعلیم کی کوئی ضرورت نہیں عشق و محبت سب کچھ سکھا دیتے ہیں۔ عشق اپنا راستہ خود ہی تجویز کرتا ہے۔ جذبات موجود ہوں تو الفاظ خود بخود لبوں سے دھاسے کی طرح بہنے لگتے ہیں۔ ایک ٹہنزدادہ ہویا کنگال۔ اظہار محبت کا لمحہ بڑا کٹھن ہوتا ہے۔ اس وقت طویل گفتگو کی تاب کہاں ہوتی ہے۔ یہ صرف افسانوں اور کہانیوں کی باتیں ہیں کہ ایک ان پڑھ شخص بھی محبت کے موضوع پر تقریر کرنی شروع کر دیتا ہے حقیقت یہی ہے کہ جذبات کی فراوانی الفاظ کو بہلے جاتی ہے اور عاشق بمشکل یہ الفاظ ادا کر سکتا ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ یہ ہیں وہ لافانی الفاظ جو رہتی دنیا تک ادا ہوتے نہیں گئے۔ کس قدر خوش نصیب ہے وہ شخص جس کا محبوب یہ جواب دیتا ہے کہ مجھے بھی تم سے محبت ہے اور اس اقرار نے پرہیزوں کے بوسے کی ہر ثبت ہو جاتی ہے۔ یہ ہے عشق کی کامرانی۔ میں اس کو کامیاب عشق تصور کرتا ہوں۔ وصال اور شادی میسر اور آخری زینہ ہے۔ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ کہ یہ کامرانی دوسرے زینہ پر قدم رکھنے کے بغیر بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ یعنی جس کو آپ چاہتے ہیں اس سے اس کی مرضی کے خلاف شادی کرنے میں کامیاب ہو جائیں اور وصال کے حق دار بن جائیں۔ میرے خیال میں تو اپنی بیوی سے بھی اس کی مرضی کے خلاف وصال ہونا زنا بالجبر سے کم نہیں۔“

مائیکل بھئی! مجھے اجازت دیجئے۔ دوسرے زینہ پر قدم رکھنے میں میری اعانت کیجئے۔“ شام

بیباکی سے بولا۔

انصرؔ۔ مائیکل بھیا! مجھے ایک ترکیب سوجھی ہے۔ آپ کی مس آنکھوں سے تھوڑی بہتر راہ دہن ہے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ وہ اوروینا دونوں ایک ہی کمرے میں رہتی ہیں۔ اس لئے اس کے نام ایک رقعہ لکھ دو کہ ہمارے عزیزِ عشق کا وینا سے تعارف کروا دے۔ آگے شام جانے اور اُس کا عشق! رقعہ لکھا گیا اور شام کوئے یار کی جانب بھاگا۔ اس کے جانے کے بعد انصرؔ کو گویا ہوا۔

انصرؔ شام صاحب پر جو گز رہے گی۔ اس کا قصہ تو کل پڑھ چھوڑیے۔ اب یہ بتائیے کہ ایسا شخص جو شرمیلا ہو۔ جو اپنے محبوب کی پریش کرتا ہو مگر اظہارِ عشق کی جرأت نہ دیکھتا ہو۔ وہ کیا کرے؟ مائیکلؔ۔ ایسے شخص کی نفسیات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے محبوب کی زبان سے وہ انکار سننا نہیں چاہتا۔ جس کی اس کو توقع ہو سکتی ہے۔ قومیت، مذہب اور دولت کی بلند دیواریں اکثر اوقات راستے میں حائل ہوتی ہیں۔ اصلِ محبوب کے تمام راستے مسدود ہوتے ہیں۔ ان حالات میں عاشق اپنے عشق کی تذلیل کو ارا نہیں کرنا چاہتا۔ اگر محبوب اظہارِ ہمدردی ہی کر دے تو عاشق کے زخموں کے لئے بہترین مرہم کا کام دے سکتا ہے۔ مگر محبت ٹھکرا دی گئی تو عاشق کے دل کو دھیس لگے گی جس کا مدافعا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے عشق کی رسوائی پر ضبط کو ترجیح دی جاتی ہے عشق کسی کے بس کا روگ نہیں۔ دل ہی تو تھا۔ اگر کسی پر آگیا تو آگیا۔ مگر عشق کی تذلیل خودی کی ہتک ہے اور یہ اپنے اختیار میں ہے۔ ایسا عشق کبھی فخراموش نہیں ہوتا۔ یہ ناکامی ہمیشہ پس منظر میں رہتی ہے۔ چاہے وہی شخص کسی بعد کے معاشرے میں کامیاب بھی ہو جائے۔ یہ قدرتی امر ہے کہ وقت اور فاصلہ عشق کے نقش کو دھندلا کر دیتا ہے مگر سراسر مٹا نہیں سکتا؟

انصرؔ۔ ایسے عاشق کس لئے آپ کی مشورہ دیں گے؟

مائیکلؔ۔ میری نصیحت تو یہی ہے کہ عاشقِ محبوب کو بھولنے کی کوشش نہ کرے۔ اگر اُس کو یہ اُمید ہے کہ کسی دن وہ محبوب تک پہنچ سکے گا۔ تو اس اُمید کو قائم رکھے اور اس آدرش کے حصول کے لئے جدوجہد کرے۔ اپنی زندگی کو کامیاب بنائے۔ تاکہ وہ محبوب کی نظروں میں اہمیت حاصل کر سکے۔ اس جدوجہد کے درمیان اگر اتفاق سے کوئی عورت اس کو محبت کی پیشکش کرے تو اُسے

قبول کر لے۔ اپنے عشق کی تشنگی اس کی محبت سے بجھائے۔ یہ محبت بہترین مہم کا کام دے گی۔ اگر ایسا کرنا بھی ممکن نہ ہو تو مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ یہ مفروضہ ذہن سے نکال دینا چاہئے کہ وہ اور کسی عورت سے عشق نہیں کر سکتا۔ یہ قدرتی امر ہے کہ عشق کی تشنگی بدستور قائم رہے گی۔ وہ کامرانی کے بغیر تسکین نہیں پاسکتی۔ اس لئے عشق دوبارہ۔ سہ بارہ بھی شدت سے عود کرتا ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ پہلی ہی شدت اختیار کرے۔ اس شدت کا انحصار تشنگی پر ہے اور تشنگی کا انحصار کشش پر ہے۔ اگر آپ کو آدرش سے بھی زیادہ حسین کوئی محبوب مل جائے تو لازمی طور پر محبت کی شدت میں اضافہ ہوگا۔ اگر آدرش سے اس کا حسن کمتر ہے تو تشنگی قائم رہے گی۔ اس حقیقت کو ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ عشق کا انحصار حسن اور جنسی کشش پر ہے۔ یہ دونوں قسم کی کشش اپنا کام جاری رکھتی ہے۔ کوئی اپنے آپ کو اس کشش کے ٹھہر کر دیتا ہے۔ کوئی اس کشش سے مڑے مڑے لٹتا ہے۔ وصال سے تشنگی بھڑکتی ہے۔ اس لئے عشق کی شدت میں کمی آجانا قدرتی فعل ہے۔ اثار، قربانی، خدمت اور محبت سے عشق کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ وقت محبت کے بندھن کو مستحکم کرتا چلا جاتا ہے۔ اس لئے مرد عورت جوں جوں بڑھے جاتے ہیں۔ جذباتی عشق کم ہوتا جاتا ہے۔ مگر محسوساتی عشق بڑھتا جاتا ہے۔ موت بھی اس رشتہ کو توڑ نہیں سکتی۔

انصر۔ ان ناکام عاشقوں کو تو اپنے حال پر چھوڑیے۔ اب یہ بتائیے کہ جس کا محبوب بھی محبت کا اقرار کرے۔ اس کا حشر کیا ہوتا ہے؟

مائیکل۔ وصل کی خواہش عشق کی روح رواں ہے۔ عشق کی مدت کیا ہے۔ یہ امر عشق کی شدت پر موقوف ہے۔ اکثر عشقیہ جذبات وصل تک محدود ہوتے ہیں۔ وصل کی بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک شادی کے بغیر اور دوسری جو بے شادی کرنے کے بعد حقیقی عشق و محبت کا جائز اور لازمی نتیجہ شادی ہے۔ میں نے پہلے مثال دی تھی کہ عشق کا ایک راستہ صحران کو جاتا ہے اور دوسرا سرسبز وادی میں۔ اس سرسبز وادی میں ایک ہی پہاڑی ہے۔ جہاں مسرت کے سامان جیتا ہیں مگر شرط یہ ہے کہ اکیلے عاشق کے لئے یہ مقام ممنوع ہے۔ محبوب ساتھ ہو تو مسرت کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ ورنہ سملج یا حالاتِ زمانہ عاشق اور محبوب کو الگ الگ رکھتے ہیں۔ وہ عشق میں کامراں ہو کر کبھی اس سرسبز وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں مگر ایک دوسرے سے ہمکنار نہیں ہو سکتے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دونوں کی یا کسی ایک کی شادی

کسی دوسری جگہ ہو جاتی ہے۔ وصل کی راہ مسدود ہو جاتی ہے مگر عشق اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے۔ اس لئے حقیقی عشق کی صفت یہی ہے کہ وہ وفا شعار ہو۔ عاشق و محبوب خواہ شادی کے رشتہ میں منسلک ہو جائیں۔ یا ویسے باہم رہیں یا ملتے رہیں یا بالکل جدا ہو جائیں۔ وفا کا تقاضا یہی ہے کہ ایک دوسرے کے سوا کسی اور سے عشق نہ کریں۔“

دوسرے دن رینوران میں شام صاحب کا بیتی سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ شام صاحب کیا آئے۔ ایک حزن و ملال کا قافلہ ساتھ لے آئے۔ سر کے بال بکھرے ہوئے تھے قمیص کا کالر باہر اٹک رہا تھا۔ نہ ٹمائی تھی۔ نہ شبیو بنائی ہوئی تھی۔ سوٹ گول ہو رہا تھا۔ یاروں نے حال دریافت کیا تو یوں گویا ہوا۔

شام لال۔ کیا سناؤں۔ میری قسمت ہی ایسی ہے۔ مس آبنوس نے ہمارا تعارف کروا دیا۔ اس کے بعد ہم بیٹھے چائے پیتے رہے۔ مس آبنوس یہاں نہ کر کے باہر تشریف لے گئیں۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور ب حال کہہ سنا یا۔ اُس نے بڑی سنجیدگی سے سنا اور جواب دیا۔ میں آپ کی عزت افزائی کی ممنون ہوں مگر مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی خدمت نہیں کر سکتی جبکہ میں ملٹری میں بھرتی ہوئی ہوں۔ میرے چاہنے والوں نے ایک ایک کر کے مجھ سے اظہارِ عشق کیا۔ اپنی محبت کا یقین دلایا اور میں ان کی باتوں میں آگئی۔ مگر مطلب نکل جانے کے بعد کسی نے میری بات تک نہ پوچھی۔ ہر دفعہ میں سنبھلنے کی کوشش کرتی ہوں مگر پھر بھی فریب میں آ جاتی ہوں۔ مجھ میں بہ بڑی کمزوری ہے۔ میں بہت سیدھی سادھی واقع ہوئی ہوں۔ اب آپ ہی بتائیے۔ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ کیا آپ مجھ سے سچی محبت کرتے ہیں۔ کیا آپ مجھ سے شادی کرنے پر آمادہ ہیں۔“

”مگر میں تو شادی شدہ ہوں اور میرے بال بچے بھی ہیں۔“ میں نے کہا۔

”تو پھر آپ کیا چاہتے ہیں۔“ وینل نے کہا۔

میں نے سچ کہا کہ جواب دیا کہ میں بہت ہی بد نصیب واقع ہوا ہوں۔ میں محبت کا طلبگار ہوں آپ کی نگاہِ لطف و کرم کا منتنی ہوں۔ آپ صرف کبھی کبھی مجھے شرفِ ملاقات بخش دیا کریں۔ اگر آپ

نیک رستے پر گامزن رہنا چاہتی ہیں تو میں اس میں آپ کی ہر ممکن اعانت کروں گا۔ میں آپ سے نہایت محبت کرتا ہوں۔ محبت کرنا گناہ نہیں ہے۔ مگر میں آپ کو گناہ کی ترغیب نہیں دوں گا۔ اگر آپ بھی دُور کی لڑکیوں کی طرح مسرت کی زندگی بسر کرنا چاہتی ہیں تو پھر اتنی درخواست ہے کہ خاکسار کو بھی یاد فرمایا کیجئے۔ بندہ ہر طرح سے خدمت کے لئے تیار ہے۔“

”تو اُس نے اُس کا کیا جواب دیا؟“ ہم سب بیک آواز گویا ہوئے۔

شام لال: ”یہی کہ میں آپ کا ضرور خیال رکھوں گی۔ جب آپ کی ضرورت پیش آئے گی۔ آپ کو اطلاع دے دوں گی۔“

مائیکل: ”تو پھر بہت ہارنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پھر کوشش کرنا بفرضِ محال کوئی کامیابی کی صورت نظر نہ آئی۔ تو سوائے صبر کے اور کوئی چارہ نہیں۔ اس میں کسی کا قصور نہیں۔ نہ تمہارا، نہ اس کا۔ آپ محبت میں مبتلا ہوئے۔ اس میں آپ کا کوئی گناہ نہیں۔ وہ آپ کی محبت قبول نہیں کر سکتی۔ اس کیلئے وہ مورہ الزام نہیں ٹھہرائی جاسکتی۔ یہ اس کے اختیار میں نہیں ہے۔ آپ مجبور نہیں کر سکتے۔ آپ سمجھ لیں کہ وہ آپ کے لئے پیدا نہیں ہوئی۔ اپنا وقت اور اپنی قوت اس کے لئے ضائع نہ کرو۔ ممکن ہے۔ وہ ایسے شخص سے محبت بڑھانے کی خواہشمند ہو۔ جس سے وہ شادی کر سکے۔ انسان کی زندگی میں محبت صرف وصل تک ہی محدود نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ حیوانوں کے سلسلے میں ہے کہ جنسی اتصال کے بعد اپنی اپنی راہ لی۔ اس پر مزید بحث پھر کریں گے اور ہاں یہ لیجئے، اصغر عمر صاحب کی شادی کے دعوت نامے۔ کل شام سہرا بندری کی رسم ہے۔ کل کا اجلاس اصغر کی کوٹھی پر ہے۔“

عمر صاحب کی کوٹھی بھی آج دُہلن کی طرح آراستہ تھی۔ مائیکل نے اصغر اور انصر کا تعارف کروایا۔ ہم ایک طرف ہو کر گفتگو میں مشغول ہو گئے۔ اصغر مائیکل کے رازدار و دوستوں میں سے تھا۔ بے تکلف گفتگو کا آغاز ہو چکا تھا۔ انصر بولا: ”کیوں مائیکل، شادی کی رسم کے متعلق سناں کا کیا نظریہ ہے؟“

مائیکل: ”شادی انسان کی کئی ضروریات کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ مثلاً (۱) جنسی بھوک کی تسکین

کا جائز طریقہ (۲) محبوبہ کو ہمیشہ کے لئے اپنانے کا رشتہ (۳) افزائش نسل (۴) دوطرفہ پر خلوص محبت۔ چاہنا اور چاہا جانا (۵) زندگی میں دکھ اور سکھ کا ساتھی متبیا کرنا جو بہترین دوست سمندر و ادرخیہ خواہ ثابت ہو سکے۔ جنسی بھوک اور حسن کی تشنگی کے لئے دنیا میں دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ ایک رضامندی اور دوسرے زنا بالجبر یعنی بھوک۔ جان کا خوف یا روزی کی خاطر جسم عا لے کرنا۔ مجبوری کی شادی بھی اسی زمرہ میں شامل ہیں۔ رضامندی خواہ جنسی بھوک یا عشق و محبت کا نتیجہ ہو۔ مگر باہمی اتصال کے لئے نہایت لازمی امر ہے۔ زبردستی انسان کے شایان شان نہیں۔ فطری طریق تو یہی ہے کہ وصل سے پہلے محبوب کو اپنایا جائے۔ شادی کے بعد بھی زبردستی کا حق شوہر کے نہیں۔ وصل باہمی رضا و رغبت سے ہی جائز ہے۔ شادی بھی مرد و عورت کا باہمی پیمانہ وفا ہے۔ جب تک وہ رضا و رغبت سے ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔ شادی کا مفہوم ادا ہوتا ہے۔ اگر وہ ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں تو شادی کا صحیح معنوں میں پیمانہ ٹوٹ جاتا ہے۔ خواہ اسے دنیاوی طور پر نہ توڑا جائے۔

سوال پیدا ہوتا ہے۔ کیا مرد و عورت کے باہمی سماجی یا جنسی تعلقات کے لئے شادی کی رسم ضروری ہے۔ کیا بغیر شادی کے مرد و عورت آزادانہ زندگی بسر نہیں کر سکتے؟ ایک انتہا پسند گروہ و تہذیب زندگی کو ترجیح دیتا ہے۔ یہ امر انسانی فطرت کے سراسر منافی ہے۔ قدرتی جذبات کو روکنا علم طب کی دوسری صحت کے لئے بیک وقت مضر و مسموم ہے۔ اخلاق بھی اس کی تائید نہیں کر سکتا۔ اس لئے اس نظریے کی کوئی وقعت نہیں ہو سکتی۔ دوسرا انتہا پسند گروہ جو محسوساتی نظریے کا گرویدہ ہے۔ وہ مرد و عورت کے تعلقات پر کوئی پابندی عائد نہیں کرنا چاہتا۔ وہ فطری طریق پر فطری جذبات کی تسکین کا حامی ہے۔ نفس بلا شبہ بہ ترغیب دیتا ہے کہ جنسی بھوک کی تسکین کے لئے کوئی روک تھام نہیں ہونی چاہئے۔ کیونکہ حیوان اور جانور کی رسم کے پابند نہیں ہیں مگر حیوان اور انسان کی ضروریات میں بڑا فرق ہے۔ اکثر حیوان یا جانور تو صرف جنسی جذبات کی تسکین چاہتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی قدرت کا منشا بھی پورا ہو جاتا ہے۔ یعنی اس طرح افزائش نسل جاری رہتی ہے۔ مادہ کو کوئی تردد نہیں کرنا پڑتا۔ بچہ پہلے ماں کے دودھ پر پلتا ہے۔ پھر اپنی قدرتی غذا کھانی شروع کر دیتا ہے۔ بچہ کا تعلق کچھ عرصہ تک ماں سے رہتا ہے۔ اس کے بعد وہ بھی اپنی انفرادی زندگی بسر کر لیتی ہے۔

شروع کر دیتا ہے۔ بعض حیوان اور جانور ایسے بھی ہیں جو خاندانی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگر سوال صرف جنسی بھوک کا ہوتا تو مرد و عورت آزادانہ زندگی بسر کر سکتے تھے۔ مگر انسان شہوت کی تسکین کے علاوہ یہ بھی چاہتا ہے کہ وصل عشق و محبت کا نتیجہ ہو۔ جہاں تک شہوانی جذبات کا تعلق ہے۔ اس کی تسکین تو او ذرائع سے بھی ممکن ہے مگر یہ طریقے محبوب سے وصل کی لذت کا ہم پد نہیں ہو سکتے۔ عشق و محبت کے جذبات کا یہ تقاضا ہے کہ عاشق و محبوب بیان وفا کو مضبوط رکھیں۔ جب عشق و محبت مفقود ہوں تو وفا اور یوفائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بغرض محال اتنی آزادی دے دی جائے کہ اپنی رضامندی سے ہر کوئی مرد عورت سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔ اس سے تسکین جذبات تو ہو جائے گی مگر افزائش نسل کے فعل کو بند نہیں کیا جاسکتا۔ بچوں کی پرورش کا بوجھ لازمی طور پر ماؤں پر چلے گا۔ باپ بننے کے لئے کوئی مرد تیار نہیں ہوگا کیونکہ عورت کے جنسی تعلقات بشیامردوں کے ساتھ ہوں گے۔ اس لئے لازمی بات ہے کہ عورت ایک ہی مرد کے ساتھ جنسی تعلقات رکھے تاکہ مرد بچوں کا باپ گردانا جائے اور ان کی پرورش کا ذمہ دار ٹھہرے۔ عورت کے لئے یہی صورت فائدہ مند ہے۔ ورنہ وہ اپنی اور بچوں کی پرورش کیسے کر سکتی ہے۔ اس لئے شادی کا بندھن عورت ہی کی بھلائی کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ جب ایک مرد عورت رضامندی سے اکٹھے رہتے ہیں اور ایک دوسرے سے عہد و پیمان کر لیتے ہیں تو شادی کا مفہوم ادا ہو جاتا ہے۔ مگر رسمی طور پر سماج کی موجودگی میں باہمی زندگی بسر کرنے کا عہد و پیمان کرنا زیادہ مناسب کیونکہ اس طرح بندھن آسانی سے توڑا نہیں جاسکتا۔ ورنہ فوراً وہی بات پر مرد و عورت علیحدہ ہو جائیں گے جیسا آج کل مغربی ممالک میں ہو رہا ہے۔ جہاں محبت ہے وہاں رنجش کا ہونا بھی لازمی ہے۔ بچوں کی پرورش اور خاندانی زندگی بسر کرنے کے لئے شادی ضروری ادارہ ہے۔ اس کے بغیر مرد و عورت صبح معنوں میں رفیق حیات اور دوست نہیں بن سکتے۔ آزادانہ جنسی ملاپ کے حامی وہی لوگ ہیں جو جذبات کی رو میں بہ جانا پسند کرتے ہیں۔ جن کا ذکر نظریہ محسوساتی کی وضاحت کے تحت آیا تھا۔ ایک فرانسیسی عورت اپنے عاشقوں کے لئے مشہور وہ چٹکی ہے۔ اس کے احوال سننے کے قابل ہیں جن سے ایسے جذباتی انسانوں کی آئینہ داری ہوتی ہے۔ اس عورت کا دھولے تھا کہ وہ سوسے زیادہ دفعہ عشق کر چکی تھی۔ اس کا قہل ہے کہ عاشقوں

کی فہرست میں ایک ڈاکٹر اور ایک دندان ساز ضرور شامل ہونے چاہئیں۔ تاکہ ان بھاری اخراجات سے نجات مل سکے۔

شام لالؔ شاید دینا بھی اسی کے نقشِ قدم پر چلنا چاہتی ہے۔ کل ایک دندان ساز کو لئے پھر رہی تھی۔ میں دیکھ کر جل ہی گیا۔ میں تو برداشت نہیں کر سکتا۔ آخر مجھ میں کیا بُرائی ہے میں جسکے زیادہ اُس کو قیمت دے سکتا ہوں۔

انصرؔ بڑی دلچسپ عورت ہوگی۔ کچھ اور اقوال یاد ہوں تو سنائیے۔

مائیکلؔ اس کا قول ہے کہ میرے ابتدائی چاہنے والوں میں سے ایک کفن ساز بھی تھا میں جانتی ہوں کہ مجھ ایسی عورت جو ایک پائی تنک بچا کر نہیں رکھتی۔ خدا جانے موت کب آجائے اور مجھے کفن تک نصیب نہ ہو۔ اس لئے میں نے اس سے ایک کفن بھی نہوار کر کھچوڑا ہے۔

انصرؔ بڑی دانا عورت تھی جو مستقبل کا اتنا خیال رکھتی تھی۔

مائیکلؔ اُس نے قسم کھائی تھی کہ اگر اُسے کبھی شادی کرنا ہی پڑی تو اس لئے کرے گی تاکہ مردوں کی نگاہ میں اور جاذبِ نظر بن سکے۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ مرد دوسرے کی بیوی کو زیادہ چاہتے ہیں۔

شام لالؔ بات تو سچ ہے۔ کیونکہ نام تو خاوند کا رہتا ہے اور عورت اپنے گلے نہیں پڑ سکتی۔

مائیکلؔ وہ بھی یہی کہتی تھی کہ مرد محبت یا دوستی کو ترجیح دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کو شادی کے پھندے کا خوف نہیں رہتا۔ یہ ایک ایسی دعوت کے مشابہ ہے جس میں کھانا، شراب اور موسیقی سبھی مفت ہوں۔ اس کا قول ہے کہ اس زندگی میں جہانی محبت ہی ایک حقیقت اور قابلِ توجہ چیز ہے۔ موت کے بعد روحانی محبت کرنے کے لئے وقت اور فرصت کی کوئی انتہا نہ ہوگی۔

انصرؔ خیال خوب ہے اور سنائیے۔

مائیکلؔ اس کا قول ہے کہ خاوند بھی ایک زیبائش ہے۔ جس سے ایک موسم کے لئے گھر کو آراستہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک بدنام عورت جو اپنی ساکھ کھو بیٹھے۔ اس کے لئے ایک امیر خاوند

کا نام بڑا کام دے سکتا ہے۔ اس کے نام پر خوب اودھار لیا جاسکتا ہے۔ جب تک خاوند کا نام فائدہ مند ثابت ہو۔ اس سے بیاہ کرنا چاہیے۔ اس طرح کچھ عرصہ بڑے عبث و راحت میں بسر ہو سکتا ہے۔ ایک اور قول اس کا مجھے بہت ہی پسند ہے۔ ایک عورت جو صرف مال و زر کی خاطر شادی کرتی ہے۔ اس کے متعلق میں ایک بیسویں بھی فرشتہ دکھائی دیتی ہے۔ کیونکہ ایک بازاری عورت بھی اپنے فعل بد کے لئے خدا کو گواہ نہیں بناتی۔ وہ کم از کم کسی کو فریب نہیں دیتی۔“

انصر: کیا حقیقت بیان کی ہے۔ ہندوستان کی اکثر عورتیں اسی لئے شادی کرتی ہیں۔
 مائیکل: اس کا قول ہے کہ لوگ مجھ سے اکثر دریافت کرتے ہیں کہ آیا میں جنت و جہنم پر ایمان
 رکھتی ہوں۔ بلاشبہ میرے تو تجربے میں آیا ہے کہ مجھے مردوں کی آغوش نے جنت سے ہم کنار کر دیا ہے
 اور بیشمار مردوں کو میں خود جہنم واصل کر چکی ہوں۔ اس لئے میرے لئے تو دونوں موجود ہیں ٹیکٹ
 شبہ کی گنجائش ہی نہیں۔

شام لالہ میں بھی تو اسی جہنم میں جل رہا ہوں رکاش ایک دن کے لئے دیتا مجھے جنت کا سامرہ دے سکے۔“

ما تبیکل ۛ اور سنو۔ طلاق بڑے لطف کی چیز ہے۔ میں سیکنڈوں دفعہ اس دور سے گذر چکی ہوں۔ مگر یہ طلاق میں خود دیتی ہوں۔ ایک منصف کو اپنے ذاتی معاملات میں دخل انداز کرنا فضول رسم ہے۔ خود ہی شادی کرتی ہوں۔ خود ہی طلاق دیتی ہوں۔ سماج کو گواہ بنانے کی تکلیف دینا تو میری سمجھ میں نہیں آیا۔“

انصر کی کیا بات ہے۔ آزادی ہو تو ایسی ہو۔
 مائیکل۔ اپنی لڑکی کو اُس نے نصیحت کی تھی کہ اپنا نام جس کو چاہو دے دو مگر اپنا
 دل کسی کو مرد سے بہت تک مل نہ لڑے۔ دل کا وجود ثابت نہیں ہوتا۔ اسی طرح جب تک
 چند قانون نہ توڑے جائیں۔ آزادی کا ثبوت بہم نہیں پہنچ سکتا۔

انصر: ”کچھ بھی ہو باتیں بڑی پر لطف کہی ہیں۔“
 مائیکل: ”ایک اور بات یاد آئی۔ سنہری حروف میں لکھنے کے قابل ہے۔ یار سا

عورتیں اتنی جاذبیت نہیں رکھتیں کہ ان سے عشق کیا جائے اور بدکار عورتوں سے سچی محبت کرنا بہت مشکل ہے میرے نزدیک تو نیک اور بدکار عورت میں یہی فرق ہے۔ کیونکہ حسن اور قابلیت کی دونوں خوبیاں یکجا نہیں ہو سکتیں۔ قابلیت کے حصول کے لئے حسن کی قربانی دینا لازمی ہے عورت کی کامیابی کا راز حسن میں مضمر ہے۔ اس لئے عورت کے لئے دو ہی راستے کھلے ہیں۔ کامیاب بیوقوف بننے یا بد صورت عاقل۔“

شام لال :- واقعی حقیقت ہے۔ اگر کسی مغنیہ کے پاس آواز ہے تو حسن نہیں اور اگر حسن ہے تو کھلا نہیں۔“

مائیکل :- نفسیات کی رو سے بھی یہی ثابت ہو سکتا ہے کہ جو عورت حسین ہوتی ہے۔ وہ کسی اور خوبی کو حاصل کرنے کی فکر نہیں کرتی۔ مرد کے لئے حسن بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ جو عورت حسن کی دولت نہیں رکھتی۔ وہ کوئی ذہنی یا اخلاقی حسن پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ تاکہ وہ بھی امتیازی درجہ حاصل کر سکے۔ عزت و شہرت کی تشنگی انسانی فطرت کا زبردست اقتضا ہے۔ اچھا اب آخری قول سن لیجئے۔ اب رسم سہرا بندی ہونے والی ہے۔ بہترین دل دہی ہے جو ایک برقی لمپ کی خوبیوں کا حاصل ہو۔ جہاں بجلی موجود ہو۔ سوچ لگا دو۔ پھر اس روشنی میں خوب کھیلو کو دو۔ کھاؤ۔ پیو۔ جو جی چاہے کرو۔ جب طبیعت اُکٹا جائے بجلی سے قطع تعلق کر لو۔ اپنا لمپ سنبھالو۔ بوریابستر سمیٹو اور کسی دوسری جگہ پل دو۔ قیام میں زندگی کا لطف نہیں۔ محبت میں یہی نقص ہے کہ ایک جگہ گھر کر لیتی ہے۔ تنہا رہے جہاں کے گرد ہزاروں چھوٹی چھوٹی کشتیاں پہو دینے پر مامور ہو جاتی ہیں تاکہ تم بندر گاہ چھوڑ کر نہ جا سکو۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ چلتے جاؤ جہاں بجلی موجود پاؤ۔ سوچ لگا دو۔ لمپ کے روشنی حاصل کرتے جاؤ۔“

شام لال :- یہ تو میرا ہی فلسفہ ہے۔“

مائیکل :- مگر آپ نے دینا ہی کو اپنے دل کا آشیانہ کیوں بنا لیا۔ اگر تمہیں بجلی نہیں ملی تو اپنے لمپ کا پلگ نکال لیجئے اور چلتے جائیے۔ دُنیا میں ایک دینا ہی بجلی گھر تو نہیں ہے۔ تم جس کو چاہو دینا تصور کر سکتے ہو۔“

نہم لال۔ اچھا تو یہی سہی۔ یہ دینا اپنے عاشقوں کو مبارک ہو۔

رسم سہرا بندی کے بعد قحامی شعرا نے سہرے پڑھے اور پھر ہمانِ خصمت ہونا شروع ہوئے ان کے جانے کے بعد ہم سب اصغر کے ڈرائنگ روم میں اکٹھے ہو گئے اور سلسلہ گفتگو شروع ہوا۔ انصر صاحب اتنے تکلفی معاف کیا میں آپ سے ایک بات دریافت کر سکتا ہوں؟

اصغر۔ بڑے شوق سے آپ میرے تین تکلف دوستوں کے دوست ہیں۔

انصر۔ جس لڑکی سے آپ کی شادی قرار پائی ہے۔ کیا آپ خود بھی اس سے متعلق ہیں؟

یعنی وہ آپ کے عزیزوں یا رشتہ داروں میں سے ہے یا آپ بھی وہی جاہلانہ رسم و رواج کے شکار ہیں کہ بن دیکھے دلہن پر ایمان لے آئے؟ جو کچھ رشتہ داروں نے مناسب سمجھا۔ آپ کے لئے انتظام کر دیا۔ اگر ایسا ہی ہے تو آپ زندگی کا بہت بڑا سچا فیصلہ لے رہے ہیں۔

اصغر۔ میں بہت بد نصیب واقع ہوا ہوں۔ گو آپ لوگ مجھے بڑا خوش قسمت تصور کرتے ہو گئے جہاں میں چاہتا تھا۔ وہاں میری شادی کی سماج نے اجازت نہیں دی۔ اتنی بڑی کوٹھی میں تنہائی کاٹنے کو دوڑتی ہے۔ اس لئے شادی جلد کر رہا ہوں۔ مگر سچ یہ ہے کہ میں نے ہونے والی بیوی کو کبھی نہیں کیا

انصر۔ یہی تو رونا ہے کہ زندگی میں اس قدر اہم قدم بے سوچے سمجھے آگے بڑھا دیا جاتا ہے۔

ماتیکل۔ مگر انصر صاحب۔ پردہ کے ہوتے ہوئے یہ ہونیوالی بیوی کو کیسے دیکھ سکتے تھے؟

انصر۔ اسلام تو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ شادی سے قبل مرد و عورت ایک دوسرے

سے واقف ہوں۔ ایک دوسرے سے منسوب ہونے سے پہلے ایک دوسرے کو دیکھ چکے ہوں۔ آپس میں ملاقات کر چکے ہوں اور شادی بغیر طرہین کی رضا مندی کے ہرگز عمل میں نہ لائی جاسے۔ مگر ہندوستانی رسم و رواج نے اسلام کی اصلی صورت پر پردہ ڈال دیا ہے۔

ماتیکل۔ مغرب میں رواج ہندوستان کے بالکل عکس ہے۔ یہاں تو شادی پہلے ہوتی ہے

عجبت و صل کے بعد شروع ہوتی ہے مگر آزاد قومیں پہلے عشق کرتی ہیں۔ اس کے بعد کو رٹ شپ

ہوتی ہے اور پھر شادی۔ یہ بالکل فطری طریق ہے یعنی عشق و محبت کے جذبات کی بیداری۔ محبوب کو اپنانے کی سعی۔ کو رٹ شپ اور وصل یعنی شادی۔ سب سے اہم کو رٹ شپ ہے۔ پرانے وقتوں

میں کو رٹ ایک ایسی جگہ تھی۔ جہاں بادشاہ اور نیک حاکم کی درخواستوں پر خور کیا کہتے تھے۔ درخواست کرنے والوں کو سوٹر کہتے تھے۔ اس طرح یہ لفظ عاشق کیلئے مستعمل ہونے لگا۔ کیونکہ عاشق اپنے دل کی ملکہ کے پاس درخواست لے کر جاتا ہے کہ اس کی محبت قبول کر لے۔ وحشی انسان تو اپنے قیدیوں سے جنگ کرتا تھا۔ اپنی محبوبہ کو زبردستی اٹھا کر لے جاتا تھا۔ بعض وحشی قیدیوں میں اب بھی ایسی رسمیں پائی جاتی ہیں۔ مغربی ممالک میں عام طور پر عاشق اپنی محبوبہ سے گفتگو کی اجازت اُس کے والدین یا سرپرستوں سے حاصل کرتا ہے۔ اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے نتیجہ سے پھر والدین کو آگاہ کر دیا جاتا ہے۔ امریکی میں تو اب اجازت حاصل کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی جب مرد عورت تہیہ کر لیتے ہیں۔ تو والدین کو شادی کی اطلاع دے دی جاتی ہے اور بعض اوقات تو دُلہن بنفس نفیس شادی کے بعد گھر پہنچ کر والدین کو حقیقت سے آگاہ کرتی ہے۔ وہاں لوگ اب ان باتوں کی پروا نہیں کرتے۔ کورٹ شپ کا مقصد تو نیک ہے۔ یعنی شادی سے پہلے ایک دوسرے کے اخلاق طبعیت۔ اور عادات وغیرہ سے واقفیت حاصل کرنا۔ کیونکہ شادی کا اصلی مدعا تو زندگی کی رفاقت ہے۔ شادی کے بعد جس جھوک کی تسکین تو ایک فرض بن کر رہ جاتی ہے۔ جب طرفین کی تسلی ہو جاتی ہے۔ تو منگنی کی رسم مرد عورت کو انگشتی پہنا کر ادا کرتا ہے۔

انصر طریقہ پیشک اچھا ہے مگر عملی طور پر اس کا ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ کنواری جہینوں اور برسوں کنواریوں کی صحبت سے لطف اندوز ہوتے ہیں جب وہ باہم ہتے ہیں تو ظاہری اخلاق کا لیک غل اپنے اہلی کردار پر چڑھ جاتے ہیں۔ عاشق اپنے محبوب کی ناز برداری کرتا ہے۔ تیسریں مواعید سے اُس کا دل بہلانا ہے اور اکثر بغیر شادی کے تمام ازدواجی زندگی کی مسرتوں سے بہکن رہتا ہے۔ ان واقعات کے خطرناک نتائج سے مونا آگاہ ہے۔ مغرب کی پچھلے اور حرامی بچوں کی کثرت اس کا ثبوت ہیں۔

مائیکل ر۔ حرامی بچے کہنا نامناسب ہے۔ یہ کہہ کر امرکالوں کے بچے بڑھ رہے ہیں۔ بچوں کا کوئی قصور نہیں اور نہ اُس طریقہ کا قصد ہے۔ یہ خود فوجوں کا قصور ہے کہ وہ بزرگوں کی رائے سے مستفید نہیں ہوتے۔ کورٹ شپ کا زمانہ زندگی میں پھر نصیب نہیں ہوتا۔ انگلیں جوان ہوتی ہیں عیش و محبت

کے جذبات میں شدت ہوتی ہے۔ عاشق محبت کے سامنے سترت کے گھونٹ پیتا ہے۔ مگر اس میں وہ تلخی نہیں ہوتی جو اندوہی زندگی اپنے ساتھ لاتی ہے۔ چھوڑوں کے ساتھ کانٹے نہیں ہوتے۔ یہ لمحات زندگی کا بہترین سرمایہ ہیں جب مرد عورت بٹھھے ہو جاتے ہیں تو اسی کدٹ شپ کے زمانے کی یاد اس اندھیارے میں مومس کی طرح ان کی اندوہی زندگی کے آفت پر چمکتی رہتی ہے۔ اب میرے خیال میں چلنا چاہئے۔ کل کے لئے پروگرام مرتب کرو۔ برات کل دوپہر کی گاڑی سے لاہور روانہ ہوگی اور ہاں ایک بات اور یاد آتی۔ کل ہمارے مقامی گرجا میں اسی شادی کے مضمون پر س روبی ہارٹ کا ایک لیکچر ہوگا۔ جو ٹری ہی بھرتی شدہ لڑکیوں کی اصلاح کے سلسلے میں پادری صاحب نے خاص طور پر جس کا اہتمام کیا ہے۔ ان لڑکیوں کی چیلنج تو زبان زد عام ہو چکی ہے میں نے ہی مشورہ دیا تھا۔ ورنہ آپ لوگ تو جانتے ہی ہیں کہ میں اور گرجا کیا منی۔ کل آپ لوگ بھی تشریف لائیں تو لطف رہیگا۔ لیکچر کے بعد سیدھے اسٹیشن پہنچ جائیں گے۔ کیوں کیا علاج ہے؟

میں، انصر اور شام صبح کے وعدے کے مطابق گرجا میں موجود تھے۔ نماز کے بعد پادری نے مس موصوف سے دعا است کی کہ وہ اپنے خیالات سے حاضرین کو مستفید فرمائیں۔ تقریباً تمام بھرتی شدہ لڑکیاں موجود تھیں۔ جیسے ہی ان لڑکیوں میں اکثریت عیسائیوں کی ہوتی ہے۔ مس صاحبہ پادری کی جگہ آگئیں اور معمولی ہنسد کے بعد یوں گویا نہیں۔ میرا دے سنن لڑکیوں کی طرف زیادہ ہوگا۔ کیونکہ عیسائی اور ازادواجی معاملات ہیں مگر اسی کا خمیازہ ان کو زیادہ بگھلنا پڑتا ہے۔ عشق و محبت اور رومان کے دلفریب لمحات تو مرد کے لئے یکساں جاویدیت رکھتے ہیں مگر عورت مرد کی ان معاملات میں تسلیم نہیں کر سکتی۔ پہلا فیصلہ فریق یہی ہے کہ عصمت عورت کا بے بہا زیور ہے۔ مرد ہزار دفعہ گناہ کا ارتکاب کرنے پر بھی نقصان نہیں اٹھاتا۔ مگر عورت کی ایک لغزش اس کا ایک گناہ۔ اس کی ساری زندگی پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ اس کا غلط اقدام گناہ کی صورت میں دنیا پر روشن ہو سکتا ہے۔ یہ امر اس کی زندگی تباہ کر دیتا ہے۔ اس کو مردوں کی نظروں میں ذلیل کر دیتا ہے۔ وہ عصمت ماب ہو نیکا کچھ بھی دعوے نہیں کر سکتی۔ مرد کو ایسے دور سے کبھی دوچار ہونا نہیں پڑتا۔ اس کی عصمت پر کوئی دماغ نہیں پڑتا۔ مگر عورت کی

عصمت پر لگا ہوا ایک وجہ قیامت تک دھل نہیں سکتا۔ اس لئے میری عزیز بہنو، اگر تمہارے دوست احباب یا رشتہ دار یا والدین اس بات کا ثبوت بہم پہنچا دیں کہ تمہارا محبوب مرد تمہاری فحش کے قابل نہیں ہے تو جند نہ کرو۔ اگر کسی میں اخلاق نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ صبر کرو۔ اس کا خیال چھوڑ دو۔ تمہیں چند روز یا چند مہینے ضرور کرب و اضطراب میں مبتلا رہنا ہو گا۔ مگر اس کا انجام بہت اچھا ہو گا۔ فحش کے زخم خود بخود مندمل ہو جاتے ہیں۔ کسی مرد کو شادی کے ذریعے اصلاح کرنے کا نام لے کر لڑکھائی نہ کیجئے۔ بیچینی کے چند مہینے یا سال اس سے بدرجہا بہتر ہیں کہ ساری عمر رو رو کر بسر کرو۔ چہرہ تک موت نہیں جلا نہ کرے۔ ایک بیحد شکل عہد و پیمان ہے۔ اس کا نباہنا آسان کام نہیں۔ اس لئے خوب سوچ سمجھ کر اس عہد نامہ پر دستخط کرو۔ یہ باروں دہائیوں کے ساتھ وعدہ نہیں کہ اگر وعدہ خلافی ہو بھی گئی تو معاف کر دیتے جاؤ گے۔ اس بندھن سے چھکارا پھیر مشکل ہوتا ہے۔ یاد رکھو۔ روپیہ ہی سب کچھ نہیں۔ مال و زر سے نہ صحت خریدی جاسکتی ہے۔ نہ کسی کا دل اور نہ مسرت کا حصول جدوجہد کے بغیر ممکن ہے۔ روپیہ صرف اعانت کر سکتا ہے مگر محنت لازمی ہے اس کے علاوہ دولت کبھی کسی کا ساتھ نہیں دیتی۔ علم اور اخلاق ایسے بے بہا خزانے ہیں کہ ان کو نہ کوئی چراہ سکتا ہے نہ لوٹ سکتا ہے۔ اس لئے ان خوبیوں کی تدکر کرو۔ مرد کو علم، صحت اور اخلاق کے معیار پر پرکھو۔ اس سے اس لئے اجتناب نہ کرو کہ وہ غریب ہے۔ دنیا کی تاریخ کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ تمام بڑے بڑے بادشاہ۔ تاجران اور کرڈپٹی کسی وقت بیحد مغس تھے۔ مگر محنت سے وہ کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔ اس لئے اگر تمہیں اس بات کا یقین ہے کہ وہ تم سے سچی محبت کرتا ہے تو پھر یہ نہ سوچو کہ تمہارے بھرائے۔ والدین۔ رشتہ دار یا سماج کیا کہیں گے۔ زندگی تم نے بسر کرنی ہے۔ انہوں نے نہیں۔ سچا عاشق دنیا کی بیش بہا دولت ہے۔ گراں بہا نعمت ہے۔ اس کو ہاتھ سے جانے نہ دو۔ میرے کہنے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ اس ہیرے کو پہلے پرکھو۔ کہیں مہدوی نہ ہو ادا کی پہچان کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ یہ چند باتیں اگر ذہن نشین کر لو تو کبھی دھوکا نہیں کھاؤ گی۔

(۱) حب تمہاری درخواست پر مرد اپنے اخلاق کو سدھار لے مثلاً شراب نوشی جو۔ زنا یا جھوٹ بونا وغیرہ ترک کر دے۔ شراب نوشی یا تمباکو نوشی کے معاملے زیادہ سختی سے کام لینے کی ضرورت نہیں

اگر وہ ان کا عادی نہیں ہے۔ صرف تفریحاً استعمال کرتا ہے جس سے اس کی اپنی اور دوسرے کی ذات کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تو زیادہ ضد کرنے کی ضرورت نہیں (۲) بے تکلف ہونے پر بھی جب ایک مرد اخلاق سے گری ہوئی بات نہیں کہتا۔ گالی نہیں دیتا اور سماج میں تمہارا رسمی احترام ملحوظ رکھتا ہے (۳) جو محبت کا زبانی افرا یا خطوط سے یا اطہار محبت کم کرتا ہے مگر عملی طور پر محبت کے ثبوت زیادہ بہم پہنچاتا رہتا ہے۔ مرد کے اقوال کا اعتبار کا کم کر دو مگر اس کے افعال کا یقین ضرور کرو (۴) جب وہ تمہارے لباس یا آرائش کی ہر تبدیلی کو جانچتا ہے اور نقائص کو دود کرنے کی خواہش کرتا ہے۔ (۵) جب تم غلطی پر ہو اور وہ حق بجانب ہو مگر پھر بھی تمہاری دلکشی نہ کرے اور مسکرا کر منہ ایک طرف پھیر لے (۶) جب مرد تمہیں اپنی رفاقت میں رکھنا چاہے۔ جہاں بھی وہ جائے مثلاً سینما۔ سیر یا دعوت کے موقعوں پر (۷) جب وہ احسان نہ جتائے۔ جو کچھ وہ تمہاری محبت میں کر گزرا ہے۔ اسے بار بار نہ دہرائے (۸) جب وہ تمہاری باتوں اور مذاق و مزاح سے لطف اندوز ہو (۹) جب وہ کام میں مشغولیت کے باوجود سلسلہ ملاقات جاری رکھے۔ (۱۰) جب وہ تمہارے انفرادی مذاق یا عقائد پر اعتراض نہ کرے رواداری کا عملی ثبوت دے۔ یا بھی زندگی میں مرد و عورت کو کچھ نہ کچھ ایثار کرنا لازمی ہے۔ جو مرد یہ چاہتا ہے کہ صرف اس کی مرضی حکمران ہو۔ وہ ازدواجی زندگی کا اہل نہیں ہے (۱۱) جب وہ سب سے پہلے تمہارے پاس کوئی خوشخبری لے کر آئے (۱۲) جب وہ کسی شغل یا تفریح سے تمہاری عدم موجودگی میں حفاظہ اٹھائے (۱۳) جب وہ کوئی حسین لباس کسی عورت کے جسم پر دیکھے تو تمہیں بھی اسی لباس میں آراستہ دیکھنے کی خواہش کرے (۱۴) جب وہ تمہاری لغزش کو معاف کر دے اور تمہارے اخلاق کی اصلاح کی ہر ممکن کوشش کرے (۱۵) جب دونوں کی خواہشات یا پسند میں ہم آہنگی ہو تو رفاقت کا صحیح معنوں میں حق ادا ہو سکتا ہے۔ (۱۶) جب مرد تمہاری خاطر کسی سے لڑ پڑے یا حسد کرے ان باتوں کو کوئی تصور کیجئے اور پھر اپنے دوستوں کو اس پر پرکھئے۔ میرے خیال میں سوس میں سے ایک بھی مشکل سے ایسا نکلے گا جو اس امتحان میں کامیاب ہو سکے۔ میرے سامعین مرد بھائی مجھے اُمید ہے کہ برا نہیں منائیں گے۔ اگر میں حقیقت بے نقاب کر دوں کہ اکثر مرد ہتھ بٹکاریوں کے جھیس میں سڑکوں کا طواف کرتے رہتے ہیں تاکہ حسین تنیوں کا شکار کریں۔ لفظ محبت ان کے

نزدیک صفت ایک اصطلاح ہے۔ ایک مچھلی کے شکار کرنے والی ہنسی ہے۔ جس سے وہ اپنے شکار کو بآسانی قابو میں کر سکتے ہیں۔ ان کے فیئر میں الفاظ گھس کو گرفتار کرنے کے لئے ہوتے ہیں جس کی تعریف کرنے کے معنی ہیں کہ وہ حسن سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ لطف اندوزی کا یہی مطلب ہے کہ مطلب برادری کے بعد کنارہ کشی کر لی جائے ؟ ان کا معیار حسن نہیں بلکہ شکار کی تعداد ہے۔ ایسے سنگدل انسان ہتھیں جبرگہ ملیں گے۔ مگر شہروں میں ان کی کثرت ہے۔ نفیس لباس زیب تن کئے۔ اخلاق کا مجسمہ بنے ہوئے دکھائی دیں گے۔ فیئر الفاظ سے آپ کا خیر مقدم کریں گے۔ آپ کی خدمت کے لئے دست بستہ حاضر رہیں گے۔ مگر جب وہ نہیں حاصل کر لیں گے تو عشق کے ساتھ وہ بھی غائب ہو جائیں گے۔ میں مردوں کو اس لئے زیادہ مورد الزام ٹھہراتی ہوں کیونکہ عورت کو زیادہ گمراہ کرنے والا مرد ہوتا ہے۔ اپنی جنسی بھوک کی تسکین کے لئے وہ عورت کو شکار کرتا ہے۔ مرد بھی اپنی فطرت سے مجبور ہے۔ عورت مرد کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ حسن میں بے پناہ کشش ہے۔ مرد میں جنسی بھوک یا عشق کا مادہ غالب ہے۔ عورت میں محبت کا عنصر غالب ہے۔ مرد جرسین عورت کو دیکھ کر اس کا قرب چاہتا ہے۔ اس کے جنسی جذبات بھڑک اُٹھتے ہیں۔ مگر عورت ایک وقت میں ایک ہی مرد پر فریفتہ ہوتی ہے۔ مرد کی جنسی خواہش سطحی ہے۔ وہ عورت کو صرف دیکھنے ہی سے براگینختہ ہو سکتی ہے مگر عورت کے جنسی جذبات کو بیدار کرنے کے لئے مرد کا انتہائی قرب لازمی ہے۔ ایک سمجھدار عورت آسانی سے مرد کی محبت پر کم ہو سکتی ہے۔ جنسی ہیجان اور جنسی جذبہ شکار محبت سے مختلف ہیں۔ ازدواجی زندگی میں محبت اور رفاقت کو زیادہ دخل ہے۔ اس لئے ایک سچا عاشق اپنی محبوبہ کو کبھی ایک سستی شراب کا جام پیش نہیں کرے گا۔ جو مرد آپ کو اپنی بیوی بنانا چاہتا ہے وہ تمہیں شراب نوشی یا زنا کی ترغیب نہیں دے گا۔ وہ تمہیں متعلق دے کر تمہارے جسم کا کبھی طالب نہیں ہو گا۔ عشق و محبت جنسی کشش کی پیداوار ہیں۔ مگر یہ جذبات بیدار ہونے کے بعد ایک مقدس صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس لئے ایسے اشخاص سے ہرگز راہ درسم نہ بڑھنا جو مرد تمہیں اپنی بیوی بنانے کے لئے تیار نہیں۔ اس سے عشق و محبت کا تعلق رکھنا میسر ہے۔ چند باتیں میں ان لڑکیوں کے گوش گزار کر دینا چاہتی ہوں جو عشق و محبت کو ایک رومان تصور کرتی ہیں۔

ان کے نزدیک عشق کرنا ایک شغل ہے۔ ایک کھیل جیسے زندگی میں اور کھیل ہیں۔ بیڈمنٹن کھیلنا یا رومنا کرنا ایک برابر ہے۔ ایسی لڑکیاں زندگی کا لطف اٹھانا چاہتی ہیں۔ اس لئے آئندہ دن مان کے مرد و ست بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اگر آپ ایسی زندگی بسر کرنا چاہتی ہیں یعنی کسی ایک مرد کی جو کرہنا گوارا نہیں ہے۔ بچے پیدا کرنے سے نفرت ہے۔ ساری عمر بوائے نام مس کہلوانا چاہتی ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آپ کی اپنی پسند ہے۔ اپنی زندگی کا راستہ اختیار کرنے کا متہیں حق ہے۔ میرا کہنے کا مدعا صرف اتنا ہے کہ دورنگی چھوڑ کر ایک رنگ ہو جاؤ۔ ایک راستہ اختیار کر لو اور اس میں کامیابی و مسرت حاصل کرو۔ لیکن اگر آپ کی یہ عواہش ہے کہ آپ ایک خاندان کی بنیاد رکھیں تو پھر مجھے آپ سے اتنا کہنا ہے کہ مرد و عورت کی تنگی کی آزادی تو فطرتاً چاہتا ہے مگر جب بیوی پسند کرنے کا سوال پیش ہوتا ہے تو صرف اتنا چاہتا ہے کہ اس کی بیوی سوسائے اس کے کسی کی محبوبہ نہ ہے وہ عورت کو چینی کی پیالی تصور کرتا ہے۔ اگر اس میں ذرا سا بھی بال آجائے تو حشمتا ہو جاتا ہے۔ چینی کے برتن کی تعداد و سرت اسی وقت تک ہے۔ جب تک وہ بے داغ ہے۔ جب تک اس میں کوئی خراش نہ آئے۔ مرد اپنے گریبان میں منہ کبھی نہیں ڈالتا۔ اس کے معاشقات اس کی کتاب زندگی کے مختلف اجواب ہیں مگر محبت و خدمت کا مکمل افسانہ زندگی ہوتا ہے۔ اس لئے تمہارے بے معنی مردان یا معاشقے بھی اس کی نظروں میں کھٹکتے ہیں۔ وہ کبھی پسند نہیں کرتا کہ شادی کے بعد تم کسی سابقہ معاشقہ کا ذکر کرو۔ یا کسی اور کی یاد کو دل میں تازہ رکھو۔ بعض مرد اتنی شدت سے پیار کرتے ہیں کہ وہ ایک طرف محبت پر ہی مباحثت کر لیتے ہیں۔ دُعا تا ہی غنیمت جانتے ہیں کہ جو بکے جسم پران کا تسلط ہے مگر یہ تمام ناتی مجبوری کے ہیں۔ مرد طوعاً کرہاً اسے برداشت کرتا ہے۔ یہ الزام بے بنیاد ہے کہ عورت مرد سے زیادہ حاسد ہے۔ مرد بھی اتنا ہی حاسد ہے جتنی کہ عورت۔ عورت ہو یا مرد مجبوری اور چیز ہے۔ چاہے محبت کی مجبوری ہو۔ مگر اپنی مرضی سے مرد عورت اپنی محبت میں شرکت قبول نہیں کرتا چاہتے۔ اس لئے اس حقیقت کو پیش نظر رکھو کہ مرد سوسائٹی میں کھلاڑی لڑکیوں کی تعریف تو کرتا ہے۔ ان کی مردانہ خوبیوں کو سراہتا ہے۔ مگر شادی کے لئے تیار نہیں ہوتا مرد تو یہ چاہتا ہے کہ اس کی زندگی نہ لطف اللہ حسین عورتوں سے ملزیم ہو۔ کہیں موسیقی اور رقص

کی ولادہ عورتیں اُس کا دل بہلائیں۔ اس کے ساتھ ٹینس یا کوئی اور کھیل کھیلیں۔ دریا میں غوطہ زنی کریں کھیل تماشوں میں اس کے ہمراہ رہیں۔ مگر اس کی بیوی جو بنے۔ وہ جیسا کہ زیور سے آراستہ ہو۔ وہ باعصمت اور وفا شعار ہو۔ یہ ایک حقیقت ہے جو آپ کو کسی مرد و دست سے دریافت کر سکتی ہیں۔“

اس کے بعد پادری صاحب نے حاضرین کی طرف سے مس صاحبہ کا شکریہ ادا کیا۔ مائیکل بولا۔ آپ لوگ ریتوران میں چل کر میرا انتظار کریں۔ میں پادری صاحب سے مل کر ابھی آتا ہوں۔“
انصر۔ کہیں مس صاحبہ سے تعارف کی خواہش تو بیدار نہیں ہوتی۔ بڑی حسین عورت ہے۔“

مائیکل۔ موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دینا ہی کامیابی کا راز ہے میرا آدرش میرے سامنے حقیقی صورت میں موجود ہے۔ مجھے تم ہو کر میری نگاہوں سے متصادم ہے۔“

مائیکل کے آنے کے بعد ہم لوگ اسٹیشن کی طرف چل دیے۔ ہماری پارٹی باتوں سے علیحدہ ایک سیکنڈ کلاس کے ڈبہ میں آدھمکی۔ شادی کے موضوع پر کچھ دیر کے بعد گفتگو شروع ہو گئی۔

مائیکل۔ شام صاحب آپ لوگوں میں شادی کا کیا طریقہ رائج ہے؟
شام لال۔ قدیم زمانے کے ہندوؤں میں سوئمیر کی رسم رائج تھی۔ لڑکی کے والدین اپنی ہی نسل، ذات اور رتبہ کے نوجوانوں کو دعوت دے کر ان کو ایک حلقہ میں بٹھا دیتے تھے۔ باری باری تمام حاضر نوجوانوں کے کمالات۔ قابلیتوں اور کمزوریوں وغیرہ کا بلند آواز سے ذکر کیا جاتا تھا تا کہ لڑکی تمام حاضرین سے متعارف ہو جائے۔ اس کے بعد لڑکی ہاتھ میں ایک ہار لئے تمام نوجوانوں کا سر سے پیر تک جائزہ لیتی ہوئی ایک چکر کاٹتی تھی۔ دوسرے یا تیسرے چکر میں وہ جس کو انتخاب کرتی۔ اس کے گلے میں ہار ڈال دیتی تھی۔ بعض اوقات لڑکیاں کوئی شرط قائم کر دیتی تھیں حاضرین امیدواروں میں سے جو اس شرط کو پورا کر دیتا۔ وہ لڑکی کا شوہر تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس

رسم میں کچھ خوبیاں ضرور تھیں مگر اب اس کا ہندوؤں میں کہیں ذکر تک نہیں آتا۔ برہمنوں نے ذاتی مفاد کے پیش نظر اس مفید رسم کی جگہ اپنے طریقے رائج کر دیئے اور کچھ صدیاں بیت جانے پر پنڈتوں نے مکمل طور پر اپنا تسلط جما لیا۔ اب شادی کے ایجنٹ یہی لوگ ہیں جو جی میں آتا ہے کرتے ہیں۔ عجم ان کے معادن کہلاتے ہیں۔ یہ عجم رشتوں کی تلاش میں لگے رہتے ہیں اور اپنا پیشہ بھی جاری رکھتے ہیں انہیں ایجنٹوں کی بدولت ایک ساٹھ سالہ بوڑھے کی شادی ایک سولہ سالہ ڈوئیزہ کے ساتھ ممکن ہے ایک تعلیم یافتہ مرد کی شادی کسی جاہل عورت سے قرار پاتی ہے۔

مائیکل : کیا اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے ؟ یہ تو جہالت کے زمانہ کی باتیں ہوں گی ؟
شام لال : یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے اور اس طریق میں کوئی رد و بدل نہیں ہوا۔ بعض اوقات اتنا ہی فرق پڑتا ہے کہ عجموں کا فرض والدین یا رشتہ دار یا شادی کے ادارے سرانجام دیتے ہیں مثلاً اصغر صاحب کی شادی

مائیکل : اس قسم کی شادی کی ذرا تفصیل بیان کیجئے۔ بڑی دلچسپ بات ہے اور مجھے حیرت بھی ہے۔

شام لال : جب ایجنٹوں کی وساطت سے نسبت قرار پا چکتی ہے تو شادی کی رسم ادا کرنے کے لئے ایک دن مقرر ہو جاتا ہے۔ اس کو بیاہ کہتے ہیں۔ یہ اسی طریق پر ہوتا ہے جس طرح یہ اصغر کی شادی ہو رہی ہے۔ یعنی دولہا ایک برات کے ہمراہ دولہن کے گھر کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ دولہن کے گھر پہنچ کر برہمن چند رسوم کی ادائیگی کے بعد دولہا دولہن کو شوہر اور بیوی قرار دے دیتا ہے۔ بیاہ کی گرہ دینے کے بعد شوہر اور بیوی ایک بانس کے گروسات جکڑ لگاتے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ شوہر اس کے بعد بیاہ کی گرہ کو کھول نہیں سکتا۔ خواہ اس کی بیوی اس کی زندگی بیاہ کرے۔ اس پر حینا حرام کر دے۔ مگر یہ بیاہ کا بندھن موت کے بغیر نہیں ٹوٹ سکتا۔

”میرے خیال میں تو یہ طریق نوجوان مرد و عورت کو شان و شوکت کے ساتھ سنہری بیڑیاں پہنانے کے مترادف ہے۔“ میں نے کہا۔

شام لال : دوسری قسم کی شادی کو گندھرو بواہ کہتے ہیں۔ جو لوگ عالمی شادی کے رشتہ

کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ انہیں عارضی شادی کرنے کی اجازت تھی۔
 انصر یعنی یہ جائز زنا کاری تھی۔ عارضی تعلقات کبھی پُر خلوص نہیں ہو سکتے۔ اس طریقے سے
 ہر مرد یہی خواہش کرتا ہے کہ ہر شے یا ہر چیز بیوی تبدیل کر لی جائے۔ اس طرح عورت کو نہ پُر خلوص
 رفیق حیات دستیاب ہو سکتا ہے اور نہ بچوں کا کوئی سرپرست۔“

شام لال: لطف کی بات تو یہی ہے کہ قدیم زمانے کے ہندو اس عارضی شادی سے بھی
 تسکین نہ پاسکے۔ اس لئے ایک اور قسم کی شادی اختراع کی گئی۔ یعنی زبردست کمزور انسان کی بیوی
 کو قبضہ میں لاسکتا تھا اور بیوی کو واپس حاصل کرنے کے لئے خاوند کو اپنی ہی قوت بازو اور چالاک
 سے کام لینا پڑتا تھا تا فزون اس کی کوئی اعانت نہیں کر سکتا تھا۔ راون، سری رام چندر اور سینا
 کا دراصل یہی قصہ ہے۔ راون نے اچھارن قسم کی شادی کی کوشش کی تھی مگر ہنومان کی مدد سے
 سری رام چندر کو ان کی سینا واپس مل گئی۔ اس کے علاوہ اور کئی قسم کی شرمناک شادیاں راج پتیس
 مثلاً ہرجا، راجپتا، ارشاد، اسورا وغیرہ جن کی وضاحت پنڈت لوگ ہی بہتر کر سکتے ہیں۔

مائیکل: اچھا تو اب انصر صاحب شادی کے متعلق اسلام کا نظریہ بیان کیجئے۔

انصر: ہندوؤں کی طرح مسلمانوں میں کئی قسم کی شادیاں نہیں۔ ایک مسلم کے لئے یہی مینا
 ہے کہ وہ ایک نیک کردار اور با عظمت عورت سے شادی کرے۔ اسلام شادی کی پُر زور دعوت
 کرتا ہے۔ رسول مری کا قول ہے کہ دنیا میں بیٹھا راتیاں ہیں مگر ایک پاکباز عورت دنیا کی بہترین شے
 ہے اور جب تک ایک مسلم شادی نہیں کرتا۔ اس کا ایمان نیم پختہ ہوتا ہے۔

مائیکل: مگر اسلام تو بے شمار شادیوں کی اجازت دیتا ہے مگر اس میں کہاں تک
 صداقت ہے؟ کیا یہ عورتوں کے ساتھ بے انصافی نہیں کہ ان کے جذبات کو ٹھیس لگائی جائے؟
 انصر: اس سے پہلے کہ میں اسلامی نظریے کی وضاحت کروں۔ انسانی فطرت کی تاریخ
 کا مطالعہ مفید ہوگا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مرد میں جذبہ محبت کے علاوہ جنسی
 جھوک بھی ایک غالب عنصر ہے جنس سے لطف اندوز ہونا اس کا فطری اقتضا ہے۔ وہ ایک ہی
 عورت کے حسین جسم پر قتلہ پاکر تسکین کامل نہیں پاتا۔ ایسے مردوں کا یہاں ذکر نہیں جو سرے

سے ہی عورت کے وجود سے نفرت کرتے ہیں۔ استثنائے یہ بات مجھلائی نہیں جاسکتی۔ اس مذہب پر قابو رکھنا اور بات ہے۔ اس لئے جو مرد استطاعت رکھتے ہیں۔ وہ زمانہ قدیم سے لے کر آج تک اسی مذہب کی تسکین کہتے آئے ہیں۔ مصر اور شام کی قدیم تاریخ کی ورق گردانی کرو۔ بادشاہوں اور امراء کی زندگی بے شمار عورتوں سے طوط پاؤں گئے۔ ہندوستان کے نواب اور راجے زندہ منائے ہیں۔ جن کے عملات بیگمات اور حسین عورتوں سے معمور ہیں۔ حضرت موسیٰ کے زمانے میں ایک یہودی لائق اور بیویاں رکھتا تھا۔ توریت کا بیان ہے کہ حضرت داؤد کی سات سو بیویاں اور بن سو کنیزیں تھیں۔ آتش پرست بھی متنبہ چاہے بیویاں رکھ سکتا ہے۔ کیونکہ ان کی مقدس کتاب میں اس کے متعلق صریح احکام مفقود ہیں۔ رسول عربی کے زمانے میں بھی لوگ بیٹیاں رکھتے تھے۔ اس کثرت کو یککھت ایک بیوی تک محدود کر دینا دانشمندی سے بعید تھا اور لوگ اس کے لئے تیار نہیں تھے۔ اس لئے تعدد کو گھٹا کر چار کر دی گئی۔ پولی گمی (Polygamy) یعنی کثرت ازدواج کا الزام مخالفین اسلام کی اختراع ہے۔ کیونکہ پولی کے لفظی معنی ہیں لائق اور یعنی کثرت۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اسلام صرف چار بیویوں کی اجازت دیتا ہے مگر اس کے ساتھ شرائط بڑی کڑی رکھی گئی ہیں جن کو لوگ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ سری کرشن بیگوان بھی سیکنڈوں کو النوں کا رستیا مانا جاتا ہے۔ بیشتر مغل شہنشاہوں کے عملات میں بیٹیاں اور کنیزیں تھیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ ان کا انفرادی فعل اسلامی فعل ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ عیسائیوں میں دوسری بیوی کی قطعاً اجازت نہیں ہے مگر بادشاہ ہنری ہشتم نے آٹھ عورتوں سے شادی کر کے پوپ اور انجیل کے حکم کی خلاف ورزی کی تھی۔ اس کا یہ انفرادی فعل انگریزی فعل کی مثال نہیں بن سکتا۔ وہ اس کی ذاتی قانون شکنی تھی۔ عیسائیت کا قانون اس کا ذمہ دار نہیں تھا۔

ماٹیکل۔ بالکل بجا فرمایا۔ ہمیں تو قانون پیش نظر رکھ کر اس کے محاسن اور عیب پر نگاہ

ڈالنی چاہیئے۔ اچھا تو اب آپ چار بیویوں کی اجازت کی وضاحت فرمائیے۔

الفصل۔ قرآن میں اللہ یوں فرماتا ہے۔ جو عورتیں تمہیں پسند آئیں۔ ان کو نکاح میں لے آؤ

ایک اور دو تین یا چار۔ پس یہ حد ہے۔ لیکن اگر تمہیں یہ نظر ہے کہ تم ان سے مساوی سلوک

معاذ رکھ سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی پر قناعت کرو۔ اب آپ اس شرط پر خود فرمائیں مساوی سلوک کا یہ مطلب ہوا کہ تمام بیویوں کی ضروریات کا یکساں دھیان رکھا جائے۔ اپنی آمدنی کو برابر حصّوں میں تقسیم کرو عیش و محبت کے معاملے میں کسی سے کمی بیشی نہ ہونے پائے۔ یعنی کسی ایک کے ساتھ رہنا دکرے۔“

شام لال : یہ کوئی بڑی بات نہیں میرے لئے تو یہ اجازت ہونی چاہئے کہ دینا کے ساتھ بھی شادی کر سکوں۔“

انصر : سرسری نگاہ میں تو یہ شرط آسان نظر آتی ہے مگر عملی جامہ پہناتے وقت بڑی وقت کا سامنا پیش آتا ہے۔ جن عرووں کے پاس دو بیویاں ہیں۔ ذرا ان سے دُجو روؤں کا مزہ دریافت کیجئے۔ نور کیجئے۔ دوسری عورت سے شادی پر آپ اسی حالت میں آمادہ ہوں گے۔ جب پہلی بیوی میں کوئی نقص ہوگا۔ اس نقص کی جو دگی میں یہ لازمی بات ہوگی کہ وہ دوسری بیوی کی طرف زیادہ مائل ہوگا جو اس نقص سے پاک ہوگی۔ خوبی اپنی طرف کشش ضرور کریگی۔ اس لئے مساوی سلوک کسے ممکن ہوگا اس لئے ایک عام انسان کے لئے یہ سب مشکل کام ہے کہ نقص اور خوبی کو ایک ہی نگاہ سے دیکھے انسانی فطرت کا اقتضا ہے کہ وہ جس یا محاسن سے اثر پذیر ہو اور تعصب بالکل پاک ہونا امر محال ہے اور اسی تعصب کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے اسلام کے قانون کی جو خلاف ورزی کر لے۔ وہ خود اس کا ذمہ دار ہے۔“

مائیکل : جب چار شادیاں اس مساوی سلوک کی روشنی میں امر محال ہیں تو پھر ایسا قانون پیش کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ حیسانیت کی طرح قطعاً نمانت کر دی جاتی۔“

انصر : قابل غور اعتراض ہے جب کوئی قانون ساز انسانوں کے لئے ایسا قانون وضع کرتا ہے جو ان کی تمام ضروریات کو پورا نہ کر سکے تو وہ قانون ساز اور اُس کا قانون ناقص سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس ایسا قانون جو ہر امکانی صورتوں کے بواز کا حامل ہو۔ قانون ساز کی حقیقت کی دلیل ہوتا ہے۔ اس لئے چار بیویوں کی گنجائش ایسے ہی امکانی حالات اور ضروریات کو مد نظر رکھ کر شامل قانون کر لی گئی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ چار شادیاں ضرور کرو۔ اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ شادی ناگزیر ہو۔ تو

تو اس قانون سے استفادہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک عورت ایک شادی شدہ مرد پر عاشق ہو جاتی ہے۔ وہ اس کے بغیر جینا نہیں چاہتی۔ اسے یقین ہے کہ وہ کسی دوسرے مرد سے سچی محبت نہ کر سکے گی۔ وہ ہر اشیاء کیلئے تیار ہے۔ وہ موت کی موجودگی کی پرواہ نہیں کرتی۔ اسے وہ بھی عزیز ہے تو ایسی صورت میں پہلی بیوی کو چھوڑنا ایک بے گناہ کے ساتھ زیادتی ہوگی تو پھر کیا یہ بہتر نہیں کہ دوسری عورت سے بھی شادی کر لی جائے۔ انسان میں رواداری کی خوبی نہ ہو تو انسان اہلانا بیکا رہے۔“

شام لالؔ بالکل ٹھیک ہے۔ حالانکہ میں دینا سے عشق کرتا ہوں مگر اپنی پہلی بیوی کو جو میرے بچوں کی ماں ہے۔ میری برسوں کی ساتھی ہے۔ اس کو میں کسی قیمت پر چھوڑنے کو تیار نہیں ہوں گا۔ اس لئے میرے خیال میں ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت ہونی چاہئے۔ یہ تو مرد کی اپنی محبت ہے کہ دونوں کو خوش رکھ سکے۔“

مانیکلؔ مگر پہلی عورت کیسے اپنی محبت میں شرکت کو ادا کرے گی؟ حسد بھی تو فطری امر ہے کیا آپ یہ گوارا کریں گے کہ آپ کی بیوی آپ کو بھی خوش رکھ سکے اور کسی دوسرے مرد کا بھی خیال رکھے؟ شام لالؔ میں تو ایسی بیوی اور اس کے عاشق دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ مانیکلؔ اسی طرح عورت کا بس چلے تو وہ بھی یہی کر گزرتی ہے۔ مجبوری اور چیز ہے۔“

شام لالؔ اس بات سے مجھے بھی اتفاق ہے کہ مجبور محبت ہو کہ انسان محبوب کو کوئی ایذا پہنچانا نہیں چاہتا۔ دینا کی بھی یہی مثال ہے کہ ایک عورت کے کسی غاوند ہیں۔ وہ سب کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ اگر مجھے بھی میرا حصہ مل جائے تو مجھے اسی پر قناعت ہو سکتی ہے۔“

انصرؔ دینا میں دو ہی عورتیں ممکن ہے۔ جنسی جذبات کی تسکین کے لئے یا تو مرد ایک سے زیادہ عورتیں رکھے یا عورت ایک سے زیادہ مرد۔ اور یہ دونوں قسم کے مرد عورت دینا میں ہر جگہ موجود ہیں۔ اس وقت دینا میں عورتوں کی تعداد مردوں سے کئی گنا زیادہ ہے پچھلی جنگ عظیم میں یورپ کی عورتوں کی تعداد مردوں سے چار گنا تھی۔ آپ لوگ اس حقیقت پر غور کریں کہ مرد اگر جائز تعلقات ان زائد عورتوں سے رکھنا نہیں چاہتا۔ یعنی شادی نہیں کرنا چاہتا تو پھر دوسرا طریقہ یہی ممکن ہے۔ کہ وہ

ناجائز طور پر ان عورتوں سے جنسی تعلقات رکھے۔ یہ مشکل ہے کہ باقی عورتیں کنواری رہیں۔ اگر اب بھی ایک آدمی ایک ہی عورت پر اتنا فائدہ کرنے کی جہد قائم رکھے تو اس کا مطلب صاف عیاں ہے کہ مرد عورتوں کی کوئی اعانت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس کے علاوہ مشرق میں تو بیشتر عورتوں کے لئے کسب معاش کا ایک ہی ذریعہ ہے یعنی شادی اگر کوئی مرد ان سے شادی نہیں کرتا تو لازمی طور پر وہ اپنا جسم مردوں کو فروخت کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ خواہ وہ ایک مرد کی داشتہ بنے یا زیادہ کی۔ بات تو ایک ہی ہے۔ جنسی شش ہی عورت کا قدرتی کاروبار ہے۔ اگر آپ جائز طور پر خرچ نہیں کرتے تو ناجائز طور پر ان کی پرورش کرتے ہو۔ بیسیواؤں، طوائفوں اور رنڈیوں کی کثرت اس بات کا زندہ ثبوت ہے۔ مانا کہ حکومت ان کے لئے روزی کا انتظام کر سکتی ہے یا عورتیں مردوں کی طرح کوئی پیشہ اختیار کر سکتی ہیں جیسا کہ یورپ یا مغرب میں کیا جا رہا ہے مگر جنسی جذبات کی تسکین کا کیا سامان ہوگا۔ مرد کی مزدورت تو پھر بھی پیش آئے گی۔ مغرب میں ایک حسین مرد کے گرد جھگڑا لگ جاتا ہے۔ مردوں کی اتنی قلت ہے کہ ایک مرد کے پیچھے کئی کئی عورتیں رقابت کی جنگ لڑتی ہیں۔ اگر ایسی ہی دو چار جنگیں اور ہولنیں تو پھر میری بات یاد رکھنا کہ مردوں کو قانوناً کئی کئی عورتوں سے شادی کرنا ہوگی۔ یہ ایک سیدھی سی بات ہے۔ فرض کرو۔ دنیا میں عورتیں بالکل کیاب ہو جاتی ہیں تو جس طرح آج مال و زر کے حصول کے لئے دوسرے ممالک پر تسلط جانے کی مزدورت پیش آتی ہے۔ اسی طرح عورتوں کے حصول کے لئے جنگیں ہوں گی۔ انسان وحشی مردوں کی طرح عورت کے لئے قتل و خون کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ اگر تہذیب کا کام لے گی تو یہی ممکن ہے کہ ایک عورت کے لئے کئی کئی جائز خاوند ہوں۔“

نظام لال۔ میرے خیال میں تو یہ سوچ عورت کے لئے بڑی مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ ایک تو یہ فائدہ ہوگا کہ وہ کبھی بیوہ نہ ہوگی۔ دوسرے ہر طرح کا عیش و آرام اسے ہوتا آئے گا۔ جنگائی کے ایسے دنوں میں ایک بیوی کی آرائش و زیبائش کا خرچ برداشت کر سکتا ہے تو دوسرا اس کا اور بچوں کی خوراک کا کفیل ہو سکتا ہے اور میسر بچوں کی تعلیم کا انتظام کر سکتا ہے اور باری باری عورت خاوندوں کے پاس رہ سکتی ہے عورت کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ مرد کے لئے البتہ محال ہے۔ اس کیلئے قوت چاہئے اور اخراجات کے لئے کافی دولت۔“

انصرت مگر شام صاحب تنہا سے لئے یہ پروگرام مفید ثابت نہیں ہوگا۔ کیونکہ عورت کو توئی مردوں کا طعنت حاصل ہو جائیگا مگر مرد کے لئے تو وہی ایک ہی عورت رہے گی۔ اگر شادی کی رسم توڑ دو تو آزادی میں انسان کی باقی ضروریات تشفہ تکمیل رہ جاتی ہیں جس کی وضاحت مائیکل نے کی تھی۔ بات چکر کا مگر پھر اپنے مرکز کہ طرف آجاتی ہے۔ دونوں طریقے یعنی جنسی آزادی اور شادی بیک وقت ایک ہی سماج میں رواج نہیں پاسکتے۔ دونوں راستوں میں بہتر راستہ شادی کا ہے۔ ایک طرف جنسی تسکین کا بے شمار نوا دیتے مگر محبت، رفاقت اور خاندانی زندگی مفقود ہے۔ دوسری طرف جنسی بھوک سیراب نہیں ہوتی مگر باقی تمام مسترتیں اور راحتیں میسر آسکتی ہیں۔ اس لئے جنسی تشنگی بجھانے کا جائز طریقہ یہی ممکن ہے کہ سماج ایسے مرد کو ایک سے زیادہ عورتوں کی اجازت دے مگر ناجائز تعلقات رکھنے کی سخت سزا دے۔ اس کے علاوہ ایسے حالات بھی پیش آتے ہیں۔ جس وقت دوسری شادی ایک لازمی امر بن جاتی ہے۔ فرض کرو کسی کی بیوی پاگل ہو جاتی ہے۔ تب حق کی مرصعہ ہو جاتی ہے یا باہجہ۔ ان حالات میں مرد کو جنسی بھوک کی تسکین، رفاقت کی تشنگی یا اولاد کی خواہش مجبور کر دیتی ہے کہ وہ دوسری شادی کر لے مگر پہلی بیوی کو بھی پاس رکھے۔ پہلی بیوی کو لازمی طور پر عداوت کا ثبوت دینا چاہئے۔ انسان کی خود غرضی مسترتوں پر پانی پھیر دیتی ہے۔ دل تنگ نہ ہو تو ہر چیز کی گنجائش ہے جس کا پیدا ہونا فطری امر ہے مگر جس کے جذبات پتلا ہو کھٹا انسانیت کی فتح ہے۔ یہ تو مائیکل صاحب آپ کا ہی اصول ہے۔

مائیکل: آپ نے تو قائل کر دیا۔ بیشک قانون شادی میں اس بات کی گنجائش ہونا لازمی ہے کہ مخصوص حالات میں ایک سے زیادہ شادیاں جائز ہیں۔

لاہور سٹیشن سے برات دُہن کے گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ دُہن کے گھر والوں نے ہمارا استقبال کیا۔ ہر پہنائے گئے۔ سنگریٹ اور پان سے تواضع کی گئی یہی ہندوستانی تعیش کے لوازمات ہیں۔ ایسے موقعوں پر وقت کی پابندی تو گناہ ہے۔ جوں توں کر کے نکاح کی رسم ادا ہوئی جس میں صرف چند منٹ صرف ہوئے۔ ہماری پارٹی تو اسی انتظار میں تھی کہ کب اس سے نجات ملے

تاکہ تفریح کے لئے کہیں جایا جاسکے۔ شادی کا حسب معمول کھانا۔ پلاؤ۔ زردہ اور تورمہ کھانے کے بعد ہم نے صغر سے اجازت لی اور مال روڈ کی طرف چل دیئے رات کے آٹھ بجے تھے۔ انصرینا دیکھنے کے حق میں تھا۔ شام لال اور مائیکل کسی ہوٹل میں وقت گزارنا چاہتے تھے۔ جہاں موسیقی ہو۔ قص ہو، فضا میں نقری، بقیہ بلند ہوں۔ انکھیں جبین اجسام سے دوچار ہوں۔ آخر قرعہ سینڈ روڈ ہوٹل پر پڑا۔ ہم چاروں ایک میز کے گرد بیٹھ گئے اور چائے کا دوسرا شروع ہوا۔ مال میں کافی رونق تھی۔ آج شام ناچ کا پروگرام بھی تھا۔ اس لئے عورتیں کافی تعداد میں آ رہی تھیں۔

مائیکل، عورت کا وجود دنیا میں کیا معنی رکھتا ہے۔ قدرت نے عورت کو کس لئے پیدا کیا ہے؟ میں نے پوچھا۔

مائیکل: مرد اور عورت انسانیت کے ترازو کے دو پلڑے ہیں۔ مرد قوت، بہمت، شجاعت اور بہادری کا ترجمان ہے۔ عورت حسن، محبت اور لطافت کا مجسمہ ہے۔ مرد اگر انسانیت کی نشر ہے تو عورت نظم۔ مرد عورت زندگی میں برابر کے شریک ہیں مگر فرائض جدا گانہ ہیں۔ مرد اسند مال سے کام لیتا ہے۔ عورت استیسی کرتی ہے۔ مرد کی خصوصیات دانائی، ثابت قدمی، ارادہ، سختی اور سنجیدگی پر مشتمل ہیں۔ عورت مسرت، لطافت، رنگینی اور شیریں صفات کی حامل ہے۔ مرد کی قوتیں خوبصورت سے بیداری حاصل کرتی ہیں۔ عورت محبت کے زیراثر کام کرتی ہے۔ مرد اصولاً مدد کرتا ہے۔ عورت جذبہ بھردری سے متاثر ہوتی ہے۔ مرد انصاف کرتا ہے۔ عورت رحم کرتی ہے۔ مرد قوت کا بادشاہ ہے۔ عورت رفاہی کی ملکہ ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے بغیر تشنہ تکمیل رہتے ہیں۔ قدرت کا مقصد یہی ہے کہ دونوں مل کر سوچیں۔ زندگی کا لطف اٹھائیں اور کام کریں۔

انصرین: بیشک مرد عورت ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ ایک دوسرے کے بغیر وہ زندگی کی گاڑی کو رواں نہیں رکھ سکتے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ عورت کی نازک اندامی محنت و مشقت کی حامل نہیں۔ عورت کے لئے قدرت کی طرف سے ایک فریضہ مقرر کر دیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ عورت مرد کی شریک حیات بنے۔ اپنی محبت سے مرد کی قوت عمل کو زندگی بخشنے۔ اس کے بچوں کی پرورش کرے۔ اس کے گھر کی منتظم بنے۔ اس کی مسرتوں کا سرچشمہ بنے۔ عورت کو مردانہ

پیشہ اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کے لئے اپنے قدرتی فریضہ کی تعلیم حاصل کرنا ہی کافی ہے۔ امورِ خانہ داری مثلاً کھانا پکانا۔ سینا پر دنا۔ بچوں کی پرورش اور تعلیم اور تیمارداری وغیرہ اعلیٰ تعلیم اور مردانہ پیشہ اس کی حقیقی زندگی یعنی ازدواجی زندگی میں کسی کام نہیں آتے۔ ایک عورت جو مردانہ پیشہ اختیار کرتی ہے۔ اس کا بھی یہی شہر ہوتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی دن مرد کی محبت قبول کرتی ہے اور شادی کرنے کے بعد اپنے قدرتی فریضہ کی طرٹ خود بخود رجوع ہونا پڑتا ہے۔ امورِ خانہ داری میں یہ فرصت کہاں کہ وہ مردانہ پیشہ بھی اختیار کئے رکھے۔ فطرت سے جنگ بیکار ہے۔ آزادی کے غلط مفہوم نے مغربی عورتوں کو مردوں کے پیچھے سے آزاد ہونے کی ترغیب دی مگر تجربہ سے ثابت ہو گیا کہ عورتیں مردوں کے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ یہ خیال کہ عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی بالکل بے بنیاد ہے۔ اس کی تائید میں کوئی عملی ثبوت نہیں ملتا۔ کیا حضرت عیسیٰ یا حضرت موسیٰ کی مائیں کسی یونیورسٹی کی گریجویٹ تھیں؟ کیا کرشن جہاراج یا سرمی رام چندر کی ماؤں نے بنارس یونیورسٹی کی کوئی تعلیمی عری حاصل کی تھی؟ کسی بھی مشہور اور کامیاب انسان کی زندگی کی مثال لے لیجئے۔ اس سوال کا جواب آپکو نفی میں ملے گا۔ اس کا سبب اعلیٰ تعلیم نہیں تھی۔ بلکہ ان کا اعلیٰ کردار تھا۔ کسی قوم کے تنزل یا ترقی کا باعث اس کی تہذیب ہے۔ تعلیم بھی تمدن یا کلچر کو بلند کرنے کے لئے ایک ذریعہ ہے۔ ایسی ہزاروں مثالیں تاریخ میں موجود ہیں کہ ان پر ہر انسان بادشاہ۔ فاتح یا مصلح قوم بنے۔ ان کی ہمت اور خلوص دلی نے وہ کام کر دکھایا جو کوئی ادب یا کوئی وکٹری نہ کر سکی۔ اس لئے اعلیٰ تعلیم جو مردوں کیلئے ضروری ہے۔ وہ عورت کے لئے غیر ضروری ہے۔ عورتوں کے لئے وہی تعلیم مفید ہے جو ان کو بہتر مائیں اور بیویاں بنانے میں مدد دے۔ اس لئے میری رائے میں ہر عورت کو اس سلسلے میں تعلیم و تربیت دینا لازمی ہے۔“

ماترِ بکشل مجھے آپ سے اتفاق ہے۔ مگر ایسی عورتیں جو محسب یا جراحات کا پیشہ اختیار کرنا چاہیں کسی کو کسی علم سے لگاؤ ہو مثلاً علمِ دوا۔ اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

انصر۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں اور مذہب کو بھی نہیں ہونا چاہئے۔ یہ پیشہ بڑا معزز ہے اور عورتوں کے لئے عورت ڈاکٹر کا ہونا ایک لازمی امر ہے۔ عورتیں ادیبہ اور شاعرہ بھی ہونی چاہئیں کیونکہ

عورت کے صحیح جذبات تو ایک عورت ہی بیان کر سکتی ہے۔ اس کے تخیلات اور محسوسات کی صحیح ترجمانی کر سکتی ہے۔ مرد تو سنی سنائی ہی بیان کرتا ہے۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں کیسے اتر سکتا ہے؟

شام لال: موسیقی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ موسیقی اور عورت کا کیا گٹھ جوڑ ہے؟
 انصر: شک مذہبی لوگ تو موسیقی کے خلاف ہیں مگر میں اسے انسانی ضرورت سمجھتا ہوں
 مرد عورت دونوں کیلئے موسیقی کی تعلیم کیسا مفید ہیں۔
 ”اچھا تو عورت کا سماع میں کیا درجہ ہونا چاہئے؟“ میں نے پوچھا۔

انصر: اس سوال کے جواب کے لئے کوئی منطق یا استدلال کی ضرورت نہیں۔ اس کا قدرتی جواب یہ ہے کہ جب مرد عورت زندگی کے ترازو کے دو پڑے ہیں تو دونوں کا مساوی ہونا ضروری ہے عورت کے بچی وہی حقوق ہونے چاہئیں جو مرد کے ہیں۔ اب آپ مغرب کی آزادی پر غور کریں اور دیکھیں کہ وہاں عورت کو کس قدر آزادی حاصل ہے۔ عیسائیت نے تو عالمی زندگی کے متعلق کوئی اظہار رائے نہیں کیا۔ جہاں تک خداوندانِ کلیسا کا بس چلا۔ وہ عورت کے خلاف زبر اُگلتے رہے۔ عورت مرد کو جنت سے خارج کر دینے کی ذمہ دار ٹھہرائی گئی اور اس لئے وہ سرچشمہ گناہ تھی۔ مرد کی بیعرتی کا باعث تھی۔ انجیل کو چھوڑنا اس کے لئے منوع تھا۔ ان کو تعلیم و تبلیغ کی اجازت نہیں تھی۔ سجدہ گاہ کے پاس جانے کی ممانعت تھی۔ اپنی جائداد پر اسے حق نہیں تھا۔ عیسائیت نے عورت کے لئے کوئی حصہ یا حق وراثت تسلیم نہیں کیا۔ اب جو کچھ حقوق انہوں نے حاصل کئے ہیں وہ ان کی اپنی جدوجہد کا نتیجہ ہیں۔ وہ کسی مقدمہ میں بطور گواہ پیش نہیں ہو سکتی تھی۔ عورتیں انگلستان میں فروخت کی جاتی تھیں۔ جوزف تھامس نامی ایک شخص نے اپنی بیوی ایک کتے اور میں شلنگ کے عوض فروخت کر دی تھی۔ ایسی اور کئی مثالیں ہیں جو عورت کی جنگِ آزادی کا پیش خیمہ ہیں۔ اب آپ انہی مغربی اقوام کے لوگوں پر نگاہ ڈالیں جو اس ہال میں موجود ہیں۔ مرد عورت کا کس طرح پُر جوش خیر مقدم کرتے ہیں عورت کی کس قدر تعظیم کرتے ہیں۔ اس کے آنے پر اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں سڑک کا خالی نہ ہو تو اس کے لئے جگہ بنائی جاتی ہے۔ ہر ممکن طریقہ سے اس کی تعظیم گھر اور سماج میں ملحوظ

رکھی جاتی ہے مگر حقیقی آزادی مفقود ہے۔ کیا عورت کو پارلیمنٹ میں کوئی نمایاں درجہ دیا گیا ہے، کیا کسی سیاسی ادارے کی ذمہ داری ان کو سونپی گئی ہے، کسی شعبہ حکومت میں عورت کا درجہ نہیں رکھتی۔ اس پر دعوے ہے کہ عورت کو مکمل مساوات حاصل ہے، مشرقی اقوام کی آنکھیں ان کی ظاہری آزادی کو دیکھ کر چندھیا گئی ہیں، کیونکہ مرد و عورت آپس میں آزادی سے مل جل سکتے ہیں۔ نافع سکتے ہیں، شرب پی سکتے ہیں۔ اس لئے عورتیں آزاد ہیں۔ اس پر کچھ کچھ تفصیل سے بحث کریں گے۔ اب اپنے ہندو بھائیوں کی طرف نظر کرو۔ ہندوؤں کے قوانین کے مطابق عورت اپنے باپ، بھائی یا شوہر کی جائیداد کی وارث نہیں بن سکتی۔ اس کی دولت میں حصہ نہیں لے سکتی۔ اس کے برعکس ایک مسلم عورت کو مکمل مساوات حاصل ہے۔“

مانیکمل : اس کی ذرا وضاحت فرمائیے۔ ہم آزاد خیال لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ بھاری مسلم عورت قیدی بنا کر رکھی گئی ہے۔“

انصر : اس غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ تعصب دوسری قوموں کو صحیح حالات سے آگاہ ہونے نہیں دیتا۔ اسلام نے عورت کو وراثت کا حق عطا کیا ہے۔ وہ بحیثیت ایک بیٹی، بہن، بیوی، ماں وادی یا پوتی جائیداد اور دولت میں مرد سے آدھے حصہ کی حقدار ہے۔“

مانیکمل : یہ نصف کیوں؟ برابر کیوں نہیں؟

انصر : نصف اس لئے کیونکہ عورت کو اپنے خاوند کی جائیداد میں سے بھی نصف حصہ ملتا ہے۔ ایک نصف والدین کی وراثت میں اور دوسرا نصف خاوند کی ملکیت میں سے اور اس کے علاوہ خاوند کو ہر کے طور پر ایک رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔ آپ نے احمد رضا صاحب کے نکاح کے قوت یہ الفاظ سنے ہوں گے کہ بعض پانچ ہزار روپیہ بہر نصف معجل اور نصف غیر معجل کے قبول کرتا ہوں۔“

مانیکمل : ہاں یاد ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟

انصر : اس کا مطلب یہ ہے کہ ڈھائی ہزار روپیہ تو دلہن کو گھر پہنچتے ہی ادا کر دینا لازمی ہے اور باقی ڈھائی ہزار روپیہ وہ اپنی زندگی میں جب چاہے وصول کر سکتی ہے۔ اگر خاوند فوت ہو جائے تو اس کی جائیداد میں سے بقایا رقم وصول کرنے کی مجاز ہوتی ہے۔ اس حق کو نہ شوہر واپس لے سکتا ہے

اور نہ اس کی ادائیگی سے قانونی انکار ہو سکتا ہے۔“

”مگر اکثر مسلمان تو اس پر عمل نہیں کرتے۔ یہ وہ لفظ ہے کہ شرمندہ معنی نہ ہوا۔“ میں نے کہا
 انصر: تو اس میں اسلام کی تعلیم کا کیا قصور۔ جو کام کی بات ہوتی ہے۔ اس کے لئے تو علما
 تزدو نہیں کرتے۔ وہ تو اس چیز پر اعتراض کریں گے کہ میں یہاں بیٹھنا بیچ کیوں دیکھ رہا ہوں۔ اس
 کے علاوہ مہر کی رقم اتنی بھاری مقرر کی جاتی ہے جس کا دو لکھا اہل ہی نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ فریضہ
 تو رسم میں تبدیل ہو چکا ہے۔ جتنا چاہے لکھو ادیا۔ دیتا دلاتا کون ہے؟
 ”آپ کا کہنا بالکل بجا ہے۔ اچھا تو اس کے علاوہ عورت کو اور کیا حقوق حاصل ہیں؟“ میں

نے پوچھا۔

انصر: مسلمان عورتوں نے ادنیٰ کارنامہ میں بڑا حصہ لیا ہے۔ دورانِ جنگ میں وہ مرہٹہ
 یعنی زنگ کا فرض ادا کیا کرتی تھیں۔ ان حالات میں پردہ بھی معاف تھا۔ رسولِ عربی کے اقوال ہیں کہ
 عورت اور مرد پر تعلیم حاصل کرنا فرض ہے۔ جنت ماں کے قدموں میں ہے۔ مرد کا عورت کو کمتر سمجھنے کا
 کوئی حق نہیں۔ کیونکہ عورت بہبودِ نسل کے فعل میں برابر کی ذمہ دار ہے۔ عرب کی تاریخ سے آپ واقف
 ہی ہیں کہ کس طرح لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی جان سے مار دیا جاتا تھا۔ یا نو بدل سے بھی بدتر سلوک ان
 سے روا رکھا جاتا تھا۔ جائداد میں سے کوئی حصہ نہیں دیا جاتا تھا۔ اسلام نے جو کچھ عورت کے لئے کیا
 اس کے لئے ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے۔ میں صرف چند باتیں گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ زنا کی
 کسی صورت میں بھی اجازت نہیں۔ زانی اور زانیہ کی نرسو دتے مقرر ہے۔ بیوہ کی شادی پر زور دیا ہے
 تاکہ عورت شادی کی سترتوں سے بہکنا نہ رہے۔ عورتوں کو مہر اور ہیز دینے کا رواج قائم کیا ہے۔ عورت
 کو مذہبی رسوم کی ادائیگی میں آزادی بخشی ہے۔ عورت اپنے اعمال کی ذمہ دار ہے اور مرد اپنے افعال کا
 دونوں اپنی اپنی جگہ جزا و سزا پائیں گے۔ مرد کو عورت پر کوئی فوقیت نہیں۔ دونوں کے حقوق برابر
 ہیں۔ مرد کو عورت پر ظلم کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اگر وہ اس سے خوش نہیں رہ سکتا تو طلاق دے
 سکتا ہے مگر بہتر یہی ہے کہ وہ صبر کر لے۔ شاید اس میں بھی کوئی بہتری کی صورت نکل آئے۔ عورت
 عدالت میں گواہی دے سکتی ہے۔ مہر کی رقم کا نصف حصہ بیوی کو شادی کے بعد چھپنے کی صورت

میں بھی واجب الادا ہے۔ اگر عورت چاہے تو خاوند سے طلاق حاصل کر سکتی ہے۔ عورت کی رضامندی کے بغیر اس کی شادی نہیں ہو سکتی۔“

مائیکل۔ اس سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے عورت کو مساوی حقوق دے رکھے ہیں۔
انصر۔ تنگ نظر مسلمانوں نے اسلام کو بدنام کر رکھا ہے۔ عورتوں سے وہ سلوک روا نہیں رکھتے جن کی وہ حق دار ہیں۔ اگر وہ صحیح طور پر اسلام کی مثال بن کر دنیا کے سامنے پیش ہوں تو کوئی وہ نہیں کہ وہ زندگی میں کامیاب نہ ہوں اور ترقی یافتہ اقوام کے مقابل نہ بن سکیں۔

مائیکل۔ یہ بات تو سچے ہو گئی کہ عورت اور مرد زندگی میں برابر کا درجہ رکھتے ہیں۔ دونوں کو سیاسی مذہبی اور سماجی معاملات میں یکساں دخل ہے۔ دوسرے یہ کہ عورت کا قدرتی فرض یہ ہے کہ وہ بہترین ماں اور بیوی بنے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مرد عورت مساوی حقوق کے مالک ہیں۔ مرد کو اگر آزادی حاصل ہے تو عورت کو بھی وہی مجلسی آزادی ملنی چاہئے۔ مسلم میں مرد عورت کے ملاپ پر کوئی بھی پابندی نہیں ہونی چاہئے۔ جس طرح مرد مرد سے اور عورت عورت سے ملاقات کرتی ہے۔ اسی طرح مرد عورت سے ملنے یا گفتگو کرنے کا حق رکھتا ہے۔“

انصر۔ مرد عورت کے آزادانہ جنسی ملاپ کے متعلق تو آپ بھی اسی نتیجہ پر پہنچے تھے کہ سماج بغیر شادی کے وصل کو ناجائز قرار دیتا ہے اور یہی مذہب کہتا ہے۔ شادی کا ادارہ اور آزادانہ جنسی موصہلت کا رواج ایک ہی وقت میں کسی بھی سماج میں قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ راستہ تو ایک ہی جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کا مطلب صاف ہے کہ ایسا سماج جو شادی کے ادارہ کو تسلیم کرتا ہے۔ اس کے مرد عورت شادی سے پہلے اور شادی کے بعد بھی پاکیزہ رہیں۔ یعنی عورتیں اپنی عصمت کی حفاظت کریں اور صحیح معنوں میں دوشیزہ رہیں۔ شادی کے بعد سوائے اپنے شوہر کے کسی سے ناجائز تعلقات نہ رکھیں۔ اسی طرح خاوند بھی پاکیزہ رہیں۔“

مائیکل۔ آدرش تو یہی ہے عصمت عورت کا بے بہا زیور ہے اور ہر مرد اپنی بیوی کو باعصمت دیکھنا چاہتا ہے۔“

انصر۔ عورت مرد کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ عورت کا عین ایک نسا کشش کا باعث

ہے جو مرد کو وصال کی ترغیب دیتا ہے۔ ایک عام مرد کے لئے ہونا مرد نہیں ہے جنسی ہیجان پر قابو رکھنا بڑا مشکل ہے۔ ایسے مرد بہت کم ہیں جو عورت کے حسن سے اثر پذیر نہیں ہوتے۔ ایسی عورتیں بھی ہوتی ہیں جن کا حسن اور شیریں کلام بڑے سے بڑے زاہد کے ایمان کو بھی خطرہ میں ڈال دیتا ہے جس سے عشق کا پیدا ہونا لازمی فعل ہے۔ عشق سے خواہش وصال پیدا ہوتی ہے۔ مرد عورت آزادانہ ملاقات کریں۔ تو بھی محبت کا پیدا ہونا قدرتی ہے۔ مرد عورت کی مثال پٹرول اور آگ کی سی ہے۔ دونوں کو نزدیک لانے سے تباہی یقینی ہے۔ اس لئے مرد عورت کو ملنے کا موقع بہم پہنچانا بھی خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ اور خواہش وصال عصمت کو محفوظ نہیں رہنے دیتی۔ اسلام کا پردہ اسی اصول پر وضع کیا گیا ہے تاکہ مرد عورت سے علیحدہ رہے۔ نہ مرد دیکھے اور نہ ملاقات کرے۔ نہ عشق ہی پیدا ہوگا نہ خواہش وصال۔ یہ عصمت محفوظ رکھنے کا عملی طریق ہے۔“

مائیکل۔ اصول تو ٹھیک ہے مگر عملی طور پر یہ اسی صورت میں کارگر ہو سکتا ہے جب سامان سماج اس کا سختی سے پابند ہو۔ اگر سماج میں ایسے لوگ بھی ہوں جو پردہ کے پابند نہ ہوں جس طرح کہ یہاں کی صورت حال ہے تو نوجوان مرد کے لئے بڑی وقت کا سامنا ہوتا ہے۔ عورت کے بغیر کوئی محفل و کیش نہیں ہوتی۔ مرد عورت کی موجودگی کا خواہشمند ہے۔ آپ کی مجلسی زندگی میں کنوارے مرد کے لئے عشق و محبت کی کوئی گنجائش نہیں اور شادی شدہ مرد کے لئے سوائے ایک ہی عورت کا منہ دیکھنے کے اور کوئی چارہ کار نہیں۔ بغیر لگی کی خواہش انسانی فطرت کا اقتضا ہے۔ زندگی کا لطف و نیرنگی میں ہے میں تو اس اصول کی تائید کرتا ہوں کہ مرد عورت کو صحیح تعلیم سے آراستہ کرنا چاہئے۔ عصمت کی خوبی اور جنسی معاملات کو ذہن نشین کروانے کے بعد مرد عورت کو ملاقات کی اجازت ہونی چاہئے۔ سماج مناسب اقدام سنجیز کر سکتا ہے۔ آزادی پر چند پابندیاں عائد کر سکتا ہے تاکہ عصمت محفوظ رہے اور انسانی ضرورت بھی پوری ہو جائے۔ اس پر مفصل بحث کل کریں گے۔ رقص بہت اچھا ہو رہا ہے۔ کاش کوئی ہم رقص یہاں ہوتی۔“

ایک گھنٹہ بیٹھے ہم نظر رکھتے رہے۔ شام بہت بیتا ہوا تھا۔ اسے رہ کر دینا یاد آ رہی تھی۔ آغزوہ نظر رکھ کر کتاب نہ لاسکا اور ہم قیام گاہ کو واپس ہوئے۔ رات واپس جا چکی تھی۔ مگر ہم چاروں

ایک دن کے لئے اور ڈھکے گئے۔ دوپہر کو مائیکل ہم سے اجازت لے کر کہیں چلا گیا۔ پانچ بجے شام کو اسی ہوٹل میں ہم مائیکل کے پردہ گرام کے مطابق اس کا انتظار کر رہے تھے کہ مائیکل مس روجی ہارٹ کے ہمراہ ہماری میز کی جانب بڑھا۔ ہم ششدر تھے۔ مائیکل نے ہم سے کٹکھٹا کر دایا۔ مس صاحبہ نے بڑی خندہ پیشانی سے ہمارے ساتھ مصافحہ کیا اور ہم اطمینان سے بیٹھ گئے۔ چائے کا دور شروع ہوا۔ اور کچھ دیر بعد مائیکل نے پردہ پر گھٹکھٹکے لئے انصر سے درخواست کی۔ مس صاحبہ نے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا۔

انصر مرد عورت کو سماج میں علیحدہ علیحدہ رکھنے کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ پر سیز علاج سے بہتر ہے یعنی مرد عورت کی آزادی سے جو بڑے نتائج پیدا ہونے کا امکان ہے۔ وہ سراسر جاتا ہے۔ خواہ مخواہ خطرہ کو مول لینا دانائی نہیں ہے۔ مرد جب اچھی طرح جانتا ہے کہ عورت اس کی سب سے بڑی کمزوری ہے تو پھر ان نازک جذبات سے کھینٹا آگ سے کھینٹنے کے برابر ہے۔ تمام مشرق میں اسی نظریے پر عمل درآمد ہوتا چلا آیا ہے۔ اگرچہ غیر مسلم قومیں چہرہ پر نقاب نہیں ڈالتیں مگر پھر بھی مغرب کی طرح غیر مرد عورت آزادانہ نہیں ملتے۔ دیہات کی رہنے والے مسلم عورتیں بھی گو برقعہ نہیں پہنتیں مگر غیر مرد سے ملنے کی آزادی انہیں بھی نہیں ہے۔ اس کو نیم پردہ کہہ سکتے ہو مگر شہروں میں رہنے والی مسلم عورتیں عام طور پر پردہ کی پابند ہیں۔ پردہ کے معنی ہیں کہ عورت سر سے پاؤں تک اپنے چہرہ جسم اور آرائش کو گھر سے باہر قدم رکھتے وقت پوشیدہ رکھے یعنی اپنے تمام جسم کو چادر سے ڈھانپ لے اور سولائے محرم کے یعنی بالکل قریبی رشتہ داروں کے اور کسی کے سامنے نہ ہو۔ مخصوص حالات میں عورت اپنا چہرہ اور ہاتھ پاؤں ننگے کر سکتی ہے۔ مثلاً جنگ کے دوران میں پردہ کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ عورت سر سے ہی گھر سے باہر قدم نہ رکھے اور سارا دن پلنگ پر دراز رہے۔ ہوا خوری کے لئے باہر نہ نکلے۔ تعلیم حاصل کرنے کے لئے سکول نہ جائے۔ سڑک پر پیدل نہ چلے۔ اپنی قوم اور ملک کی بھلائی کے لئے کوئی قدم نہ اٹھائے۔ قرآن اور رسول نے ایسے پردہ کا حکم نہیں دیا تھا جیسا کہ ہندوستان میں رائج ہے۔ پردہ کا مقصد اخلاق کی اصلاح ہے۔ عورت کی تعظیم اور اس کی عصمت کی حفاظت ہے۔ پردہ عورت کو گھر کی مکہ بناتا ہے تاکہ وہ بچوں کی پرورش اور تعلیم میں مصروف رہے۔ پردہ ہی ایک ایسا ذریعہ ہے

جس سے مسلم عورت کو بدکردار مردوں سے واسطہ نہیں پڑتا۔ مغرب کی طرح ایک مسلم عورت کسی شرابخوار میں مردوں کو جلیغ نہیں کرتی اور ایسے شرمناک افعال کی مرتکب نہیں ہوتی جنہیں مشرق کبھی گوارا نہیں کر سکتا۔ مشرقی گھرانوں میں بدست خمرایوں کے ساتھ ان کی عورتوں کا میل جول کبھی برواشت نہیں کیا جاتا۔ کوئی پابندی نہ ہونے کے باعث بدکردار مرد آسانی سے عورت کو وام فریب میں لاسکتے ہیں۔ شراب اور خوشامد عورت کی عصمت ٹوٹنے میں بڑا کام دیتے ہیں۔ مس صاحبہ اُمید ہے آپ برا نہیں منائیں گی۔ ان حقائق سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تمام مرد عورت ایسے ہیں۔ مگر میں اکثریت کی بابت کہہ رہا ہوں کہ پردہ کی عدم موجودگی میں گناہ اس قدر پھیل رہا ہے کہ شیطان بھی یہ کارٹے نمایاں نہیں کر سکتا تھا۔ والدین کی موجودگی میں عاشق اپنی محبوبہ کو شراب پیش کرتا ہے۔ شراب گناہ کی ترغیب دیتی ہے۔ شراب بے شمار خاندان تباہ ہو رہے ہیں۔ شراب ہزاروں عورتوں کو تباہی کے غار میں دھکیل رہی ہے۔ حرام کاری سے پیدا شدہ بچوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ مگر آزادی کے علمبردار آنکھوں پر پٹی باندھے بیٹھے ہیں۔ میرے خیال میں ان کے بھی بس کی اب بات نہیں رہی۔ تیرکمان سے نکل چکا ہے۔“

مس بی۔ مگر موجودہ زمانہ میں پردہ ترقی کی راہ میں حائل ہے۔ پردہ کو خیر یا دیکھ بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ آپ نے جو کچھ بیان کیا ہے۔ اس سے مجھے انکار نہیں مگر ان خراب نتائج کی ذمہ داری حد سے بڑھی ہوئی آزادی ہے اور کثرت ہرجرجی کی مضر ہوتی ہے۔ خواہ شراب ہو یا آزادی۔ اس لئے آزادی پر بھی پابندی لازمی ہے۔“

انصر۔ اگر ہم مختلف اقوام کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں۔ تو حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ پردہ کا ترقی کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ہندوستان کی غیر مسلم اقوام کے راستے میں صدیوں سے پردہ حائل نہیں رہا۔ لیکن پھر بھی وہ مغربی اقوام سے بہت پیچھے ہیں۔ عورتیں تو ایک طرف رہیں مشرق کے مرد ابھی تک مغرب کے مردوں سے ہر لحاظ میں بہت پیچھے ہیں۔ مردوں کے راستے میں تو پردہ حائل نہیں ہے۔ اس کی وجہ ذہنی اور جسمانی کمزوری ہے۔ اعلیٰ تعلیم عورتوں کے لئے بیکار شے ہے۔ پردہ عورتوں کی راہ میں ہرگز حائل نہیں ہر۔ کیا پردہ کا یہ مفہوم ہے کہ علم۔ سائنس یا آرٹ میں ترقی نہ کی جائے۔ تعلیم حاصل

ذکی جائے۔ تہذیب و تمدن کو بلند تر نہ کیا جائے۔ قرآن یہ حکم نہیں دیتا کہ عورتوں کو تعلیم سے بے بہرہ رکھو۔ ان کو انگریزی ادب یا کوئی اور زبان نہ سکھاؤ۔ اپنے بچوں۔ قوم یا ملک کی بھلائی کے لئے کوئی قدم نہ اٹھاؤ۔ چہرہ پر نقاب ڈالنے سے عقل پر پردہ نہیں پڑنا چاہئے۔ یہ عام رواج ہو گیا ہے کہ مصلح قوم یا لیڈر مسلمانوں کی تمام کمزوریوں کا سبب پردہ کی رسم کو ٹھہراتے ہیں۔ اس کی طرف ایک ہی وجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ لیڈر اپنی مجلسی زندگی کو صنفِ نازک سے معمور دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے یہ سارا ڈھونگ رچایا جاتا ہے حقیقت کو بیان نہیں کرتے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ ان کو دلائل سے قائل کرنے کی ضرورت نہیں۔ قرآن میں پردہ کے صاف احکام ہیں۔ زیادہ سے زیادہ مخصوص حالات ہیں اتنی رعایت مل سکتی ہے کہ چہرہ۔ ہاتھ اور پاؤں نگئے رکھے جاسکیں۔

اگر اتنی اجازت بھی دے دی جائے تو اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ اس سے تو جذبات کے اور بھڑکنے کا اندیشہ ہے۔ تسکینِ قلب کا کوئی سامان ہتیا نہیں ہو گا۔ موجودہ تہذیب میں یہی بڑا نقص ہے مابیکل کام میں ہم خیال ہوں کہ یا تو پردہ مکمل طور پر رائج ہو یا بالکل نہ ہو۔ مجھے بھی اس دورنگی سے نفرت ہے یہ مردوں پر ظلم ہے کہ دور سے بن چکن کر ان کے لطیف جذبات کو ٹھیس لگائی جائے مگر پاس پھٹکنے کی اجازت نہ ہو۔ اس کے عکس مغربی تہذیب میں یہ نقص ہے کہ آزادی پر پابندی نہیں ہے۔ ورنہ مغربی آدرش بہت دلکش ہے۔ میں نے وصلِ اندازی سے کام لیا۔

الفصل اسی لئے قرآن توصاتِ پردہ کا حکم دیتا ہے۔ اس پر بھی کوئی شخص اپنے آپ کو اور خدا سے زیادہ غفلت مند سمجھتا ہے تو وہ خوشی سے تباہی کا راستہ اختیار کر سکتا ہے جو اس کی قوم، ملک اور اس کی عزیز ماں بہن۔ بیٹی کے لئے مضرت رساں ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر وہ صنفِ نازک کی تعلیم کرتا ہے۔ ان کی بھلائی کا خواہاں ہے تو وہ قرآن کے حکم کے مطابق عمل پیرا ہو سکتا ہے۔ اگر آپ آج چہرہ۔ اور ہاتھ پاؤں کو رنگارنگ رکھنے کا جواز ڈھونڈتے ہیں تو کل کو اس سے اکلا قدم اٹھانے کا بہانہ تراشیں گے۔ کچھ عرصہ بعد یہی شرمیلی مشرقی عورت سڑک چرسن کی نمائش کرتی پھرے گی اور غیر مردوں کے ساتھ بغل میں ہاتھ ڈالے ہوئے ہونٹوں کی سیر کرے گی اور کلب کے ممبروں کے ساتھ قص کرے گی۔ مغرب میں یہ سب اسی طرح ظہور پذیر ہوا۔ ایک اچھٹی ہوئی نگاہ مغرب کی آزادی کی تاریخ پر ڈالئے۔ ایک وقت تھا کہ عورت انسان

کی تباہی کا موجب گردانی جاتی تھی۔ کیونکہ حضرت آدم کو اُس نے گناہ کی ترغیب دی تھی اور جنت سے نکلوانے کا موجب بنی تھی۔ پھر ایک زمانہ آیا کہ عورت کی تعلیم کی جانے لگی۔ اُس وقت کی عورت حیا اور شرم کی کُنپی تھی۔ وہ بلوسات کے ڈھیروں میں بھیپ رہتی تھی۔ وہ غسل کا لباس پہن کر سمندر کے کنارے اٹھلا کر نہیں چل سکتی تھی۔ شادی کے معاملہ میں بھی وہ اپنے والدین کی خوشنودی کا خیال رکھتی تھی۔ وہ ایک بہترین ماں اور بیوی بننے کی سعی کرتی تھی۔ اس کا دن گھر میں گذرتا تھا۔ سینا پر دنا۔ بچوں کی تعلیم و تربیت اور خاوند کی خدمت اس کے مشاغل تھے۔ ایک عرصہ کے بعد اُس نے گھر سے قدم باہر رکھنا شروع کیا۔ نہیں۔ یہ مرد تھا جس نے اسے گھر سے باہر نکلنے کی ترغیب دی۔ کیوں؟ اس لئے کہ مرد خطرناک شخص کا دلدادہ ہے۔ وہ حسین نظاروں سے جی بھر کر لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔ وہ عورتوں کی صحبت سے حظ اٹھانا چاہتا ہے۔ اس کی شیریں زبانی اور رعنائی اسے بھاتی ہے۔ یہی مرد کی کمزوری سب فساد کی جڑ ہے۔ آزادی کے درپردہ مرد نے عورت کو گھر سے باہر نکلنے میں مدد دی۔ اسے سماج کی جان قرار دیا۔ اسے گرمی محفل ٹھہرایا۔ عورت اس عزت افزائی سے پھولی۔ زمائے اولاد و ہی حیا و شرم کی پتلی سوسائٹی گرل یا بدوشیزہ محفل کہلاتی ہے جو کلب اور ہوٹلوں میں نیم برہنہ رقص کرتی ہے۔ تنباکو نوشی اور شراب نوشی کی مرکب ہے جو اٹھیلتی ہے۔ ریس میں حصہ لیتی ہے۔ بچوں کو حسن کی تباہ کاریاں کرتی ہے۔ شادی کو مرد کی فلاحی تصور کرتی ہے جنسی آزادی کی پرتار ہے۔

مس روپی: مگر میں ان تمام افعال میں سے ایک کی بھی مرتکب نہیں ہوتی۔ البتہ موسیقی اور رقص کی دلدادہ ہوں کسی مرد کا اعتبار نہیں کرتی ہوں۔ ہر مرد کو بدکردار سمجھتی ہوں۔ جب تک وہ اپنے افعال سے ثابت نہ کرے۔ مجھے رائے تبدیل کرنے پر مجبور نہ کر دے۔ میں مرد کی کمزوری کو سمجھتی ہوں اور اس سے اتنی توقع رکھتی ہوں کہ وہ شادی کے بعد کم از کم پاکباز رہے۔ عورت کی عصمت کی میری نظر میں بہت وقعت ہے۔ میں شادی کی حامی ہوں مگر اب تک.....

انصر: میں آپ کو یقین دلانا ہوں کہ مائیکل ایسا ہی مرد ہے۔ وہ آزاد خیال ہے مگر انسانیت کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ کاش سب عورتیں آپ سی ہوں۔

مس روپی: شک ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ آپ پردہ کے شد و مد سے قائل ہیں۔

انصر بات یہ ہے کہ ہندوستان کی موجودہ فضا جنسی آزادی کی بالکل اجازت نہیں دیتی تعلیم یافتہ لوگوں کی بیداری ہے بہت زیادہ ان پڑھ کسانوں اور مزدوروں کی ہے۔ انہیں سماج کے لوازمات سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ عوام کی زندگی کا سمیوار بہت پست ہے۔ ان کو جینے کا شعور نہیں تمدن بالکل بے ڈھنگا ہے۔ ایسے لوگوں کو جنسی آزادی دینا پاگل کے ہاتھ میں بھلا ہوا پستول دینے کے مترادف ہے۔ اس لئے سب سے پہلے تعلیم و ترتیب لازمی ہے۔ آپ کے خیال میں اگر آزادی پر پابندی ہو تو مرد و عورت کے ملاپ میں کوئی خرابی نہیں پیدا ہو سکتی۔ مناسب تربیت سے بڑے نتائج دُور ہو سکتے ہیں۔ عصمت بھی محفوظ ہے اور زندگی کا لطف بھی ہاتھ سے نہ جلتے۔ کاش ایسا ہو سکتا! انسان جب صحیح معنوں میں انسان بن جائے گا۔ اس وقت پردہ کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئے گی پردہ ایک ذریعہ ہے مقصد نہیں ہے۔ اس لئے میں کوئی ہٹ دھرمی نہیں کر رہا ہوں۔ میں نے مذہب کا مقصد آپ لوگوں پر واضح کر دیا تھا مگر انسان آج تک انسان نہیں بن سکا۔ جنسی آزادی کا پھر جس قوم یا ملک نے کیا۔ وہ نقصان اٹھائے بغیر نہ رہ سکا۔ آگ سے کھیلو اور ہاتھ نہ جلے ایک امرِ محال ہے۔ امریکہ نے شراب نوشی کی ممانعت کرنی چاہی مگر ناکامیابی کا منہ دیکھنا پڑا۔ یورپ اور امریکہ نے مرد و عورت کے تمام درمیانی حجابات دُور کر دیئے ہیں۔ ایک جہان کو خاوند پر ترجیح دی جاتی ہے۔ وہ بغیر شادی کئے ازدواجی زندگی کی تمام مسرتوں سے محکوم ہو سکتا ہے۔ خاوند چوں تک نہیں کر سکتا سماج کی رسومات ہی ایسی ہیں۔“

مائیکل *۔ اس کا مطلب یہی ہوا کہ پردہ ہی بہترین طریقہ ہے۔ اس لئے انسانی فطرت کے دوسرے پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے۔ یعنی ایسے سماج میں عشق و محبت یا رومان کو کوئی دخل نہ ہو۔ شادی اسی طرح بن دیکھے اور بن چلے جا رہے۔ ایک مذہب قوم کے لئے یہ بات مستحسن نہیں آزاد قومی اس نظر نیے کو قبول نہیں کر سکتیں۔“

انصر *۔ آپ کا اعتراض بیشک وزنی ہے۔ مگر اسلام عصمت کو کسی قیمت پر ٹٹانے کے لئے تیار نہیں۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ عشق و محبت کی شادی کا مسلم سماج میں کوئی امکان نہیں ہے۔ میں نے پہلے ہی بیان کیا تھا کہ ایک مسلم عورت کو اپنے قریبی عزیزوں اور رشتہ داروں سے پردہ

کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے نوجوان مرد اور عورتیں اپنے لئے شریک زندگی کا انتخاب عمل میں لاسکتی ہیں۔ شادی سے پہلے ایک دوسرے کو پسند کرنا لازمی امر ہے۔ اسلام کا قانون بھی یہی ہے۔ یہ فطری اقتضا ہے۔ اس کے علاوہ یہ خاندانی شادیاں بڑی کامیاب ثابت ہوتی ہیں۔ کیونکہ محبت کے رشتہ کے علاوہ خون کا رشتہ بھی مرد و عورت کی ازدواجی زندگی کو اور مستحکم کر دیتا ہے۔ اگر آپس میں ان بن ہو جاتے تو نون کا رشتہ مصالحت پر آمادہ کر دیتا ہے۔ ان شادیوں کو رواج دینا چاہئے۔ اس کیلئے تنگدل مسلمانوں کو فراخ دلی سے کام لینا چاہئے۔ بزرگوں کی موجودگی میں جو امر و عورت کا ملاپ بے نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔ رومان کا راستہ بھی اس طرح کھل سکتا ہے اور یہی عشقیہ شادی کا پیش خمیہ بھی بن سکتا ہے۔ ایسی شادیاں اب بھی ہوتی ہیں مگر کم عشق و محبت یا انتخاب کا دائرہ بیشک محدود ہے مگر ناپید نہیں۔ یہ دائرہ وسیع کیا جاسکتا ہے مگر اسلام جنسی آزادی کے خطرات مول لینے کے لئے تیار نہیں۔

مائیکل ٹ۔ مجھے اس حقیقت سے انکار نہیں کہ پردہ عصمت کو محفوظ رکھنے کا عملی طریقہ ہے مگر صرف عصمت کو بچانے کے لئے کیا ان تمام سترتوں سے ہاتھ دھو لیا جائے جو پردہ مفقود ہونے سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ دنیا میں ہر چیز کی قیمت ہے۔ سترت کی قیمت بھی ادا کرنا ہوتی ہے۔ بچوں کے ساتھ کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا عصمت اس قدر عزیز ہے کہ اس کے تحفظ کیلئے ہم ممکن قربانی عمل میں لائی جائے۔ نرقی کا راز خطرہ مول لینے ہی میں مضمر ہے۔ بہت بار بیٹھنے سے کچھ نہیں ہوتا انسان ابھی تک حیوانی افعال سے باز نہیں آیا۔ جنگ کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا۔ کیا اس پر قناعت کر لی جائے کہ دنیا میں جنگ لازمی ہے۔ اس لئے عالمگیر امن کی تدابیر کرنا سب سے بیکار ہے۔ بدی انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ اس لئے بُرائی کا انسداد و قضیع اوقات ہے مگر انسان قناعت نہیں کر سکتا وہ حالات سے مطمئن نہیں رہ سکتا۔ عالمگیر امن بھی ایک آدرش ہے۔ اس کے حصول کے لئے انسان تنگ و دوکرتا رہا ہے۔ اسی طرح عورت مرد کا معصومانہ میل ملاپ بھی ایک آدرش ہے۔ جس کے حصول کیلئے انسان تجربات کرتا آیا ہے۔ پردہ بھی ذریعہ ہے مقصد نہیں ہے۔ یہ آپ کا ہی قول ہے تعلیم و تربیت سے سماج عصمت کی قدر و قیمت جان سکتا ہے سماج کے اختیار

میں سب کچھ ہے۔ سماج سے فروغیات کر کے کہاں جاسکتا ہے حکومت افراد کی آزادی پر پابندی عاید کر سکتی ہے جب پابندی سے افراد بے نیاز ہو جائیں گے۔ پابندی کی ضرورت نہیں نیکی آپ نے بیان کیا تھا کہ انسانی فطرت کی اصلاح نہیں ہو سکی۔ بدی نیکی سے زیادہ دلکش ہے۔ اس لئے بیخبرہ ناکامیاب رہا ہے۔ مگر مذہب کا مقصد بھی تو یہی اصلاح ہے۔ مذہب بھی تو صحیح معنوں میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ بہت کم لوگوں کو راہِ راست پر لگانے میں کامیاب ہوا ہے۔ اس لئے یہ مذہب کی جدوجہد بھی میسر رہی ہے۔ انسان کی فطرت سے بدی خارج نہیں ہو سکتی۔ اس لئے انسان جس راہ پر چلتے ہیں انہیں چلنے دو۔ وقتِ نوبت ہی جاتا ہے۔ انجامِ سب کا ایک ہی ہے مگر میں ایک بات کہوں گا کہ یہ تجربہ اس سماج میں ناکامیاب رہا ہے۔ جن افراد کی تو آزادی پر پابندی عائد نہیں کی گئی میں مشروط آزادی کا حامی ہوں۔ اس لئے کہ تمام انسان مکمل انسان نہیں ہو سکتے۔ نیکی اور بدی کی جنگ دنیا کے اختتام تک جاری رہے گی۔ دراصل دنیا میں دو ہی گروہ ہیں۔ ایک نیکیوں کا اور دوسرا بدوں کا۔ خواہ برائے نام وہ کسی گروہ۔ تو یہ مذہب میں شامل ہوں۔ اس لئے جو لوگ عصمتِ فروتن ہوتے ہیں یا عصمت کی خوبی کو بیکار سمجھتے ہیں۔ وہ لوگ گروہِ بد کے افراد ہیں۔“

شامِ لال۔ قطع کلامِ معاف۔ نیکی کے ساتھ بدی کا ہونا ضروری ہے۔ دنیا میں ہر چیز کا جوڑا ہے۔ خوبی کی قدر و منزلت صحیحی معلوم ہوتی ہے۔ جب اس کا دوسرا رخ بھی موجود ہو۔ فرض کرو ایک سماج کے مرد و عورت عصمت کو بیکار شے تصور کرتے ہیں۔ وہ آزادانہ جنسی ملاپ کے حامی ہیں بچے حکومت کے حوالے کر دیئے جاتے ہیں عورتیں سماج کی ملکیت سمجھی جاتی ہیں اور تمام افراد اس نظریے کے قائل ہیں تو اس صورت میں وہ کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے۔ کیونکہ افراد کی عصمتِ فردی سے یہ فعلِ سرزد ہوتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے۔“

مائیکل۔ جہاں تک اس مخصوص سماج کا تعلق ہے۔ اسے گناہ نہیں کہہ سکتے۔ مگر نسبتاً

یہ طریقہ اچھا نہیں ہے۔ اس لئے ہم اس کو برا کہتے ہیں۔ آزادانہ جنسی ملاپ سے صرف ایک ہی ضرورت پوری ہوتی ہے یعنی جنسی جذبات کی تسکین۔ شادی میں باقی تمام ضروریات بھی پوری ہوتی ہیں۔ اس لئے ہم کو بہتر راستہ منتخب کرنا پڑا۔ مثال کے طور پر عصمتِ فروشی کو لیجئے۔

جب ایک عورت اپنی مرضی سے یہ کام کرتی ہے تو مرد گناہ نہیں کرتا مگر اگر یہی مرد کسی عصمت مآب عورت کو بہکا کر آبروریزی کی کوشش کرتا ہے تو وہ مجرم اور سخت گناہگار ثابت ہوتا ہے۔ سہل کو اسے سزا دینے کا حق ہے۔ کیونکہ وہ عورت ایسے سماج سے تعلق رکھتی ہے جو عصمت کے تحفظ کا حامی ہے۔

جو شادی کے بغیر جنسی تعلقات کو حرام قرار دیتا ہے۔ اس لئے آزادی پر پابندی لازمی ہے۔ مرد عورت کو اکٹھے کھانے۔ پینے۔ کھیلنے۔ ناچنے، گانے اور گفتگو کرنے کی اجازت ہو مگر تنہائی میں اکٹھے ہونے کی ممانعت ہو۔ کیونکہ تنہائی کے بغیر جذبات کالبے قابو ہو ناممکن نہیں۔ پٹرول اگر تین میں بند ہو تو آگ لگنے کے امکان بہت کم ہو جاتے ہیں تعلیم سے مرد و عورت کو ان تمام حقائق سے واقفیت ہو سکتی ہے۔ اگر اس پر بھی وہ احتیاط سے کام نہ لیں تو یہ خود ان کا قصور ہے۔ آپ دُوبی اعتراض کریں گے کہ آگ کا کام تو جلانا ہے۔ مگر آپ کو آگ میں کودنے کو کون کہتا ہے۔ آگ کے گرد بیٹھ کر تم اس سے حرارت اور ضیا حاصل کر سکتے ہو اگر آگ کو چھو گے تو جل جاؤ گے۔ بجلی سے مزید اس کام لئے جاتے ہیں مگر اسے کارآمد بنانے کے لئے اسے قابو میں رکھنا لازمی ہے۔ بجلی کی تار، رڈ اور کپڑے کے اندر مدفون اسی لئے کی جاتی ہیں عورت پردے کے اندر مدفون بھی ایسی مقصد کے لئے لگی جاتی ہے۔ تاکہ وہ مرد کو اپنی ہڈی کیلئے لہو نہ کر سکے۔ مگر تار اگر بالکل ننگی ہو تو ہم ہاتھ پر رڈ کا دستا نہ چڑھا کر بھی بجلی کی تار کو بے خطر چھو سکتے ہیں۔ اس سے کام لے سکتے ہیں۔ اصول ایک ہی ہے۔ یعنی پرہیز مگر صورتِ جدا جدا ہے۔ اسی طرح نیش بھی ایک بجلی کی خاصیت رکھتی ہے۔ اس سے سینکڑوں مفید کام لئے جاسکتے ہیں اگر بد احتیاطی سے نقصان کا احتمال ضرور ہے۔ سماج کو مرد و عورت پر کڑی نگرانی رکھنی چاہئے تاکہ وہ تنہائی میں آگ سے نہ کھیلیں جو کھیلنا چاہتا ہے۔ وہ خوشی سے کھیل سکتا ہے۔ مگر اس کی قیمت ادا کرنا ہوگی اور وہ قیمت ہے شادی۔ اب آپ ہی سوچئے۔ ایک طرف پردہ کی دیوان زندگی ہے دوسری طرف زندگی سرتوں۔ فہم تہوں۔ عیش و محبت اور دومان و موسیقی سے لبریز ہے۔ مجھے تصویر کے دونوں رخ پیش کرنے دیجئے۔ فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔ پہلے بچپن کے زمانے کو لیجئے۔ ننھے لڑکے لڑکیاں اکٹھے سکول جاتے ہیں۔ کھیلتے ہیں اور تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان میں بیجا شرم و پُراں نہیں پڑھتی۔ اپنے سے بزرگ لڑکے لڑکیوں سے جنسی معاملات پر گفتگو کرتے ہیں۔ شرم و حیا سے

محبور ہو کر لاعلم نہیں رہتے جنس کوئی شرمناک چیز نہیں ہے۔ ایک سیدھی ساوی بات ہے۔ انسانی ضرورتوں کی طرح ایک یہ بھی ضرورت ہے۔ نوجوان اس حقیقت سے بخیر نہیں رہتے۔ ایک دوسرے کی موجودگی کا مقصد ان پر واضح ہو جاتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ آپس میں معصومانہ محبت بھی کرتے ہیں۔ دوستی بھی کرتے ہیں اور جب جوان ہوتے ہیں تو یہی معصوم محبت بچپن کی دوستی کا پودا سیراب ہو کر عشق و محبت کے شجر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بچپن کی دوستی عمر بھر کی دوستی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس ایک بچہ جو اپنے ہم جنسوں کے ساتھ تعلیم حاصل کرتا ہے۔ وہ شرمیلا رہتا ہے۔ وہ مخالف جنس کی موجودگی سے کتنا ناگوار ہے جنسی حقائق سے لاعلم رہتا ہے۔ بزرگوں سے وہ کوئی ہدایت نہیں پاتا۔ بزرگ بھی خود شرم کے شکار رہتے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کو حقیقت سے آگاہ نہیں کر سکتے۔ اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ بچے اپنے اپنے مفروضے گھڑ لیتے ہیں۔ سماج ان کی کوئی مدد نہیں کرتا۔ زندگی کا سب سے اہم مسئلہ جس کی تعلیم لازمی ہے۔ اسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ کس لئے؟ کیونکہ ان امور پر گفتگو کرنا شرمناک ہے اور اس شرم کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے بڑی عادتوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بچہ جب ذرا جوان ہوتا ہے جنسی جذبات اس کے جسم میں کرڈیں لینا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ ان کو سمجھ نہیں سکتا۔ اگر پوچھنے کی جرأت کرتا ہے تو بزرگوں کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملتا۔ البتہ ڈانٹ پلائی جاتی ہے۔ وہ وہیں دبا جاتا ہے اور پھر کبھی ان سے پوچھنے کی جرأت نہیں کرتا۔ اسے خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کوئی بہت ہی بڑا ناگوار ہے۔ لیکن جذبات بیدار نہ ہوں۔ یہ قدرت کو منظور نہیں۔ فطرت اپنی راہ پر چلتی رہتی ہے۔ رکستی نہیں۔ فطرت سماج کی پابند نہیں ہے۔ جذبات اپنی تسکین چاہتے ہیں جو راستہ سامنے آتا ہے اختیار کر لیتے ہیں۔ نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ لڑکے لڑکوں پر عاشق ہو جاتے ہیں۔ لڑکیاں لڑکیوں پر فریفتہ ہو جاتی ہیں۔ پوشیدہ طور پر جنسی جذبات کی تسکین کی جاتی ہے۔ ہم جنسوں کی یہ حرکات کسی سے مخفی نہیں ہیں مگر سماج اسے آسمانی و با سمجھ کفر و فحاشی کہتا ہے۔ اگر کوئی کوشش کی ہے تو اشتہار کی کمیوں نے جو اپنی دواؤں کی فروخت کے سلسلے میں رسائل تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ یہ رسائل نوجوانوں کو ادبھی گمراہ کر دیتے ہیں ان پر خوف و ہراس طاری کر دیا جاتا ہے۔ مایوسی ان پر سوار کر دی جاتی ہے۔ وہ ذہنی طور پر

کمزور اور نامرد بنا دیئے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ ان عادات سے کوئی بھاری نقصان نہیں پہنچتا۔ یہ فطری جذبات ہیں۔ ان کی تسکین فطرت کا اقتضا ہے۔ کیا آپ نے مغربی اقوام کے جرائد میں اس قسم کی کبھی اشتہار بازی دیکھی ہے جن سے ہندوستان کے اخبار اور رسائل مزین ہوتے ہیں۔ مجھے تو حیرت ہوتی ہے۔ مگر یہاں تو بے فیصدی جاہل بستے ہیں۔ اس لئے ان حکیموں کا خوب واقفیل رہا ہے۔ کاش صحیح حالات سے نوجوانوں کو آگاہ کیا جائے۔ پاکباز رہنے کے صحیح طریقے بتائے جائیں اور ایسے اشتہاروں کا شائع کرنا قانوناً ممنوع قرار دیا جائے جب تک ایک انسان صحت مند ہے۔ وہ کبھی نامرد نہیں ہو سکتا۔ یہ دوائیں بے معنی ہیں جو انسانِ تقدّر قیّام سے بغضِ باب نہیں ہو سکتا۔ اسے دوائیں کیا زندگی بخش سکتی ہیں۔ لڑکپن اور سچپن کو نہیں گزرنا ہے۔ جوانی آتی ہے تو اپنے ساتھ اُمنگوں اور جذبات کا طوفان لاتی ہے۔ ایک آزاد سماج کے نوجوان مرد اور عورتیں باہم مل سکتے ہیں۔ گفتگو کر سکتے ہیں۔ موسیقی۔ کھیل۔ تماشہ۔ ناچ رنگ۔ دعوت اور تفریح میں حصّہ لے سکتے ہیں۔ وہ عشق و محبت اور شادی کے مفہوم کو سمجھتے ہیں۔ ان کی نظریں شریکِ زندگی کو تلاش کرتی ہیں۔ شادی اُن کے نزدیک جنسی بھوک کی تسکین کا ذریعہ ہی نہیں۔ وہ صحیح معنوں میں شریکِ حیات چاہتے ہیں۔ مشرقی شادی تو صرف جنسی بھوک کی تسکین اور بچے پیدا کرنے کا جائز طریقہ ہے۔ حقیقی ازدواجی مسرت اور رفاقت اکثر مفقود ہوتی ہے۔ شادی عورتوں کے لئے دولت کمانے کا ایک ڈھنگ ہے۔ ایک بوا ہے۔ جس کا پانسہ حجام اور شادی کے ایجنٹ پھینکتے ہیں۔ دو اجنبی مرد اور عورت کو جو بلحاظِ طبیعت چاہے وہ مشرق و مغرب ہوں۔ ایک دوسرے کے پتے باندھ دینا انہی کا کام ہے۔ بزرگوں کی نگاہ دولت۔ جائداد اور ظاہری حسن کا جائزہ لیتی ہے۔ لڑکی بڑے اچھے گھر کی ہے۔ لڑکا تعلیم کے لئے ولایت جانا چاہتا ہے۔ لڑکی حسین ہے۔ کشیدہ کاری بھی جانتی ہے۔ مگر یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ ان کا کردار کیا ہے ان کی پسند کیا ہے۔ ان کا مذاق طبیعت کیا ہے۔ ان کی ضروریات اور خواہشات کیا ہیں۔ خاوند اگر بیوی کی محبت اور رفاقت چاہتا ہے۔ تو بیوی ایک دجمن بچے چاہتی

ہے۔ شوہر کو ادب سے عشق ہے۔ تو بیوی کو چڑھائی نہیں آتا کہہیں کی چیز کہ کہیں کاروٹا بھائی کی
نے کنبہ جوڑائیشی بالکل ایسی شادیوں پر صادق آتی ہے۔

انصر مگر ان باتوں کے باوجود مشرقی شادی کامیاب رہتی ہے۔ مغربی شادی اپنی پسند
کی جاتی ہے مگر وہاں طلاق کی کثرت ہے۔ اس لئے یہ طریقہ کامیاب تصور کئے جاتے ہیں۔

مائیکل۔ اگر اس نکتہ نگاہ سے اس مسئلہ پر غور کیا جائے تو یہ کہ مشرقی شادی کامیاب نظر آتی

کیونکہ طلاق کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ مگر اس کی وجہ شادی میں کامیابی بزرگ نہیں ہے۔ راز یہ ہے کہ ان
نے طلاق امر حلال بنا دی ہے۔ مسلم گھرانوں میں بھی طلاق کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ حالانکہ طلاق مذہب
بانہ ہے۔ سماج کے رسم و رواج ایسے سخت ہیں کہ ان کو طلاق کی ہمت کہ لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ اس لئے

خامخوار بیوی ایک دوسرے سے نفرت کے باوجود دنیا کا منہ رکھنے کیلئے کٹھن زندگی بسر کرتے چلے

جاتے ہیں اور موت ہی ان کو ایک دوسرے سے نجات دلاتی ہے۔ اس کے برعکس مغرب میں آزادی کا

نا جائز فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ بات بات پر طلاق حلال کی جاتی ہے۔ اگر طلاق کو وہاں یہ مشکل بنا دیا

جائے تو پھر ان کے ہوش ٹھکانے آسکتے ہیں۔ انتہا ہر چیز کی مختصر ہوتی ہے۔ اعتدال کا راستہ ہی انسان کیلئے

راستی کا راستہ ہے۔ آزادی کا کوئی تصور نہیں۔ آزادی کا ناجائز استعمال اس کا دمر دار ہے۔

شام لال ریچا سے مشرقی نوجوان مردوں اور عورتوں کی حالت کوئی میرے دل سے پوچھے تو

اپنے قریبی رشتہ داروں کے وہ کسی سے بات چیت نہیں کر سکتے اور وہ بھی صرف رسمی طور پر بے تکلف

گفتگو تو شرمنہ کا فعل ہے۔ جیسا کہ سید نے کہا تھا کہ پردہ بیشک کام کی چیز ہے مگر اسی صورت میں جب

سارا سماج اس کا پابند ہو جب دوسری مغربی قومیں، ایگلو انڈین یا عیسائی بھی وجود ہوں تو ان قوموں کا

آزادانہ میل ملاپ ان کے جذبات کو مشتعل کر دیتا ہے۔ لیکن آزاد سماج کے دروازے ان کے لئے بند

ہوتے ہیں۔ اپنے سماج میں ان کے لئے کوئی مراعات نہیں ہوتیں۔ یہ پچھلے کریں تو کیا کریں۔

اسے میں تقریبی قص شروع ہوا۔ مائیکل نے اس رویہ کو اپنی ہم قص ہونے کی درخواست کی اور ہم
سے معذرت کر کے وہ دونوں قص میں مشغول ہو گئے۔ دونوں نہایت اچھا ناطق تھے۔ اچھی بولی تھی۔

شام نے کہا: مولے اس کے کہ ہم بیوقوفوں کی طرح انہیں میٹھے دیکھتے ہیں۔ ہمارے لئے کوئی اور

چارہ کار نہیں غیر مذہب کا فرد ہونے کے باعث ہم کو کوئی منہ نہیں لگاتا۔ ورنہ ہم بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ بیشک میں نے تو یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ پردہ اسی صورت میں مفید ہے جب سماج کے تمام افراد اس کے پابند ہوں۔ تاکہ سوائے اپنے قریبی رشتہ داروں کے مرد و عورت نہ کسی سے مل سکیں نہ کسی کو دیکھ سکیں کیونکہ جنسی جذبات تو وہی ذرائع سے بیدار ہو سکتے ہیں۔ دیکھنے سے یا میل ملاپ سے اور یہی دونوں باتیں رسم پردہ میں ممنوع ہیں۔ اس لئے یا تو مسلم سماج اپنا دائرہ وسیع کرے تاکہ کم از کم اس کے افراد آپس میں مل جل کر مجلسی زندگی بسر کر سکیں اور اس طرح اپنے لئے بہترین شریک زندگی خود انتخاب کر سکیں۔ میں نے کہا۔

اتنے میں ناسخ ختم ہوا اور دونوں واپس مینے کے گرد آگئے۔

شام بولا۔ جوانی کی بہاریں آپ لوگوں ہی کے لئے ہیں ہم تو بھارمچھونکنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ مائیکل۔ جوانی تو ایک طرف رہی۔ بڑھا پا بھی آزاد سماج میں ایک نعمت ہے عمر بیدہ اشخاص کو بڑی مراعات حاصل ہوتی ہیں فوجوانوں میں رہ کر وہ اپنے علم پیرایہ سالی کو انعامسوس نہیں کرتے۔ جتنا کہ تنہائی میں۔ نوجوان مرد و عورتیں ان کا دل بہلاتے ہیں۔ آپ نے قص کے دوران میں ملاحظہ کیا ہوگا کہ عمر رسیدہ مرد و عورت کی کتنی تعظیم کی جاتی ہے۔ وہ جس سے دل چاہے، قص کر سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہر حسین و نوجوان عورت کا بوسہ لے سکتے ہیں۔ اب آپ ہی اندازہ لگائیے۔ ایک طرف ایک خوبی کی حفاظت میں سب مسترتوں سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ دوسری طرف تشویش تو ذرا ہے۔ مگر مستتریں پیشیا رہیں۔ کیا پھول چھیننے کے لئے آپ کانٹوں میں الجھنا پسند نہیں کرتے ہیں۔ ہر چیز کی قیمت ہے۔ قیمت ادا کرنا ہی ہوگی۔ خواہ دونوں میں سے کوئی راہ اختیار کر دے۔

تیسرا باب

سماجی مسٹرین

مائیکل کو ہم موسیقی اور سُن کی دُنیا میں چھوڑ کر واپس اپنے گھر لوٹے۔ کیونکہ وہ چند دن کے مزید قیام کا خواہاں نہ تھا۔ شام بھی اپنے کام پر واپس چلا گیا۔ اب میں اور انصر رہ گئے۔ انصر کو شادی کے بعد احباب کی تشنگی کیوں ہوتی۔ انصر اور مائیکل کی دُنیا آباد تھی۔ وہ تنہا نہیں تھے۔ میں بیالدا رہتے ہوئے بھی تنہا تھا۔ میرے رفیق حیات میرے دست تھے۔ بیوی نہیں تھی۔ انصر سے ملاقات جاری تھی۔ مگر عورت کے بغیر زندگی بویا محض تشنہ تکمیل رہتی ہے۔ مائیکل کے خطوط باقاعدہ موصول ہوتے رہے۔ اس کا رومان ترقی پر تھا۔ ایک ماہ کے بعد مائیکل مس رینی کے ہمراہ واپس آیا۔ وہ منسوب ہو چکے تھے۔ اور آج شام اسی خوشی میں پارٹی تھی شام کی عدم موجودگی کو بڑا محسوس کیا جا رہا تھا۔ انصر بھی حاضر تھا مگر کچھ طول نظر آتا تھا۔

میکوں انصر کیا بات ہے۔ آج تمہارے دوست کی شادی کی بنیاد رکھی جا رہی ہے اور تم اُداس ہو۔ میں نے کہا۔

انصر: چھوڑو شادی کی بات۔ کوئی اور بات کر دو۔ میں تو شادی کر کے آفت میں گرفتار ہوں۔ اچھا ابھی تمہاری خوشی۔ مائیکل تمہارے بغیر ہم ہیبت اُداس رہے۔ کچھ محض کلنزا ہی جاتا رہا یہ کیوں۔ میں نے موضوع چھیڑتے ہوئے کہا۔

مائیکل: بات صرف اتنی ہے کہ انسان سماجی حیوان ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے سمجھنوں

کے ساتھ مسئلہ کھانسنے پکھنے یا باتیں کرے۔ کچھ اپنی کہے کچھ دوسروں کی سننے۔ اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کلب یا سوسائٹی وجود میں آتی ہے۔ دعوتیں اور پارٹیاں دی جاتی ہیں۔ مقصد کھانا پینا نہیں ہوتا۔ یہ سب مل بیٹھنے کے بہانے ہیں۔ ایسے موقعوں پر گپیں ہانکنا یا باتیں کرنا بہت زیادہ آسان کم غریب اور مقبول عام شغل ہے۔ مرد و عورت سبکی اس دلچسپ تفریح میں حصہ لیتے ہیں۔

انصر: مگر آپ گپیں ہانکنے کی بجائے مختلف موضوعات پر گفتگو کرنے کے زیادہ شائق ہیں اس کی وجہ کیا ہے؟

مائیکل: گپ ہانکنے کے لئے کوئی مواد چاہئے۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ دوسروں کے حالات و معاملات پر خواہ مخواہ تفتہ کرنا پسند کرتا ہے۔ جو کچھ اسے کسی کی بابت معلوم ہو یا سن چکا ہو۔ وہ سب کو سنانا چاہتا ہے۔ سچ ہو کہ جھوٹ۔ عام خیال یہ ہے کہ عورتیں بہت باتیں کرتی ہیں۔ جب کہیں سادی بیاہ ہو یا کسی اور موقع پر اکٹھی ہو جائیں تو سب زبان فنی کی طرح چلتی ہے۔ ایک دوسرے کی رازدار بن کر جو کچھ اپنے خاندان و سہیلیوں۔ رشتہ داروں کے متعلق معلوم ہوتا ہے، اگل دیتی ہیں۔ مگر مرد بھی تو کم نہیں۔ ہم لوگ بھی تو باتیں کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ فرق اتنا ہے کہ کم سمجھ عورتیں یا مرد غیبت کرنے میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ ذی عقل مرد اور عورتیں ذاتیات پر گفتگو نہیں کرتیں جیسے ہم کوئی موضوع چھیڑ لیتے ہیں تاکہ تبادلہ خیالات ہو۔ باتیں کرنے کی بھی خواہش کی تسکین ہو جائے اور علم میں بھی اضافہ ہو۔ تفریح کی تفریح ہو جائے اور زندگی کے قیمتی لحاظ بھی رائیگاں نہ جائیں۔

اصغر: گپ گفتگو اخلاقی رائے کیا ہے۔ کیا گپ شب و گانا برا فعل ہے؟

مائیکل: گپیں ہانکنا یا باتیں کرنا فطری اقتضا ہے۔ اکثر لوگ گفتگو کرتے وقت اس بات کو ملحوظ نہیں رکھتے کہ دوسرے بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں۔ وہ اپنی سی ہانکے چلے جاتے ہیں۔ اپنی آواز کو سن کر خوش ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ سروں کی باؤل میں دخل در انداز ہو کر سلسلہ کلام منقطع کر دیتے ہیں اور اپنی ہی ہانکنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس بات کی انہیں پروا نہیں ہوتی کہ جو کچھ وہ بیان کر رہے ہیں دلچسپ ہے کہ نہیں۔ انہیں سننے والوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے کوئی نہ کوئی موضوع گفتگو کے لئے تیار رکھتے ہیں اور اس میں نمک مرچ لگا کر پیش کرتے ہیں۔ اگر کوئی موضوع دستیاب

نہ ہو تو پھر کوئی قصہ اختراع کر لیا جاتا ہے۔ کسی مشہور و معروف ہستی سے ذاتی تعلقات اور تجربات
 وابستہ کر دیئے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس غلغلہ گفتگو کرنے والے بھی ہوتے ہیں جو اپنے مشاہدات اور
 تجربات سے حاضرین کو غفلت کرتے ہیں۔ کہانی اتنی دلچسپ نہیں ہوتی جتنا کہ اسلوب بیان اور ایسے
 لوگ غلبہ کی جان سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے بغیر غفلت سونی معلوم ہوتی ہے۔ ان کے برعکس اول الذکر
 اشخاص کی نیت تو بد نہیں ہوتی۔ وہ کسی کی دانستہ بُرائی یا غلبہ نہیں کرنا چاہتے۔ مگر وہ
 بد اعتیاد سے ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جو مناسب نہیں ہوتیں اور کسی کے وقار کو ضعف پہنچا
 کا باعث ہو سکتی ہیں۔ گپ شپ لگانے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ہر انسان دوسروں کی نظروں میں بہت
 حاصل کرنی چاہتا ہے۔ یہ بھی فطری اقصا ہے۔ شہرت و عزت کی تشنگی کی تکلیف ہر انسان مختلف
 طریقوں سے کرنے کی سعی کرتا رہتا ہے۔ باتوں سے تسکین کا وسیلہ سب سے سہل ہے۔ اس لئے
 سماجی زندگی میں بھی انسان اسی خواہش کے زیر اثر اکثر گفتگو کرتا ہے۔ الفاظِ حقیقت کی ترجمانی
 کرتے ہیں۔ ایک انسان کی گفتگو اس کے کردار کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ تجلیات اور وسوسات کے
 اظہار کے تین ہی طریقے ہیں۔ گفتگو، اشارہ اور تحریر۔ اپنی استطاعت علم کے مطابق ہر کوئی
 اظہار رائے کرتا ہے۔ کوئی زیادہ کوئی کم۔ سب میں کوئی خاموش کیسے رہ سکتا ہے۔ اگر وہ خاموش
 انسان ہے اور کسی سے گفتگو نہیں کرتا۔ وہ اپنے خیالات اور احساسات کو قلمبند کرنے کا عادی
 ہوتا ہے۔ یا وہ چند اشخاص سے گفتگو کرنا پسند کرتا ہے۔ اگر یہ بھی نہیں تو پھر وہ اپنے دل ہی
 دل میں گفتگو کرتا ہوگا۔ کیونکہ ہر انسان ایک ذہن کا مالک ہے اور ذہن سوچنے کے بغیر نہیں رہ سکتا
 سو چنانچہ درحقیقت اپنے آپ سے گفتگو کرنا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ الفاظ بلند آواز سے
 اور نہیں کہے جاتے۔ خاموشی کا یہ طلب نہیں کہ زبان سے کوئی لفظ ادا کیا جائے۔ ایک مقرر
 اپنی زبان سے یہ کام لیتا ہے۔ ایک مصنف اپنے قلم سے اور ایک مصلح اپنے موافق سے۔ جذبہ ایک
 ہی کام کرتا ہے۔ اظہار کے طریقے مختلف ہیں۔ کوئی باتیں زیادہ کرتا ہے۔ کوئی سُنتا زیادہ ہے اور
 جو سب سے زیادہ سُنتا ہے۔ وہی اصل میں زیادہ باتیں کرتا ہے جیسے کہ سعید قم ۵
 ”وہ کیونکر؟ میں نے پوچھا۔

مائیکل : عام طور پر انسان باتیں کرنا زیادہ پسند کرتا ہے اور اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو اپنی اہمیت دوسروں پر جتنا چاہتے ہیں۔ ان کو اپنی قابلیت اور شخصیت پر فخر ہوتا ہے۔ وہ اپنا پروپگنڈا آپ کرتے ہیں۔ مغرور انسان اپنے کارنامے خود بیان کرتا ہے۔ ایک واقعی قابل شخص اپنے منہ سے اپنی تعریف نہیں کرتا۔ مگر تعریف کی خواہش سے وہ بھی بے نیاز نہیں ہوتا۔ اس لئے جو شخص دوسروں کی بڑ کو بڑے اہلینان سے سن سکتا ہے۔ ایک کان سُنکر دوسرے سے نکال دیتا ہے۔ اسے باتیں سنانے والے بہت پسند کرتے ہیں۔ یہ انسان کی فطری کمزوری ہے۔ ان کی دل کی ہڈ اس نکل جاتی ہے۔ اس لئے ایک سیدھا سا دانشمند یہی ہے کہ دوسروں کی سُنو۔ اگر کسی اظہارِ ہمدردی کو ناپاچہ سمجھتا ہو۔ اس کے غم میں یا خوشی میں شریک ہونا چاہتے ہو تو دوسروں کو ٹھہرا کر جذبات و نیالات کا موقع دو۔ وہ اپنا غبار نکال لیں گے۔ آپ چپکے سُننا کیجئے۔ پھر دیکھئے آپ کا کس طرح شکر کر دیا کیا جائے گا۔

انصر : آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ یعنی گپ مشپ کے متعلق اخلاقی رائے کیا ہے؟

مائیکل : یہ نہیں تھی۔ باتیں کرنے کے فعل کے پڑے میں جو جذبات اور جو خواہشات کام کرتی ہیں۔ ان کا سمجھنا ضروری ہے۔ گفتگو کا موضوع ذاتی رائے۔ اظہارِ خیال و جذبات، ذاتی مشاہدات اور تجربات ہوتے ہیں۔ یا کوئی شخص دوسروں کے خیالات، مشاہدات اور تجربات بیان کرتا ہے۔ اپنے متعلق گفتگو کرتے وقت دروغ بیانی سے اکثر کام لیا جاتا ہے۔ اسکی وجہ میں بیان کر چکا ہوں۔ ہر انسان اپنی اہمیت جتنا چاہتا ہے۔ وہ کسی سے کم نہیں رہنا چاہتا۔ اس مقصد براری کے لئے اگر اس کے پاس حقائق کا ذخیرہ نہیں ہے تو وہ مفروضات سے کام لینے کی سعی کرتا ہے۔ مبالغہ آرائی اور دروغ بیانی اس کا لازمی نتیجہ ہیں۔ اس کو ہم گپ ہانکنے سے موسوم کرتے ہیں۔ لیکن ایسی باتوں کی معنی جلد ہی کھل جاتی ہے اور یہ امر باعثِ شرمندگی بن جاتا ہے۔ اس لئے اپنے متعلق گپ ہانکنا بھی اخلاقی معیار سے گرا ہوا فعل ہے۔ اب بیچے دوسری صورت یعنی دوسروں کے متعلق گفتگو کرنا۔ اس صورت میں بھی دروغ بیانی اور راست گوئی دونوں طریقوں سے کام لیا جاتا ہے۔ اس کو غیبت کہتے ہیں۔ یہ نہایت

مذموم فعل ہے۔ بسا اوقات ہمارے کانوں تک ہمارے اپنے متعلق ایسی باتیں پہنچتی ہیں جو بیدر بخدہ ثابت ہوتی ہیں۔ ایسی باتیں اختراع کر لی جاتی ہیں جو بے حد رنجہ ثابت ہوتی ہیں۔ ایسی باتیں اختراع کر لی جاتی ہیں جن کا کوئی وجود نہیں ہوتا جنہیں سن کر حیرانی بھی ہوتی ہے اور سنج بھی۔ اکثر اوقات یہ اقوال ایسے اشخاص سے منسوب ہوتے ہیں جنہیں ہم اپنا دوست اور عزیز گردانتے ہیں۔ اگر کسی وقت ان باتوں کا سُرائے لگانے کی کوشش کی جاتی ہے تو پتہ نہیں چلتا کہ کس کا یقین کیا جائے۔ راوی بیان دیتا ہے کہ اس نے یہ باتیں کہی تھیں۔ دوست کا بیان ہوتا ہے کہ وہ ہرگز ایسا نہیں کہہ سکتا۔ کس کا یقین کیا جائے اس لئے میں تو ہرگز ایسی باتوں کی پرواہ نہیں کرتا۔ جو شخص بیٹھ بیٹھ بڑائی کرتا ہے۔ اس جیسا بزدل انسان کوئی نہیں جو بات کہہ کر کمر جاتا ہے۔ اس جیسا کبندہ انسان کوئی نہیں۔ اس لئے میں تو بڑا محتاط رہتا ہوں۔ کسی کی سُنی سُنائی پر یقین نہیں لاتا کسی کے متعلق جو کچھ سناؤں اسے دوسرے کان سے نکال دیتا ہوں تاکہ زبان سے باہر نہ آئے۔ کیونکہ اگر میں اس شخص کو یہ سُنی سُنائی بات دہراؤں تو اُسے رنج ہو گا اور جب بات کا کھوج لگایا جائیگا تو اتنی اخلاقی جرأت کسی میں کم ہی ہوتی ہے کہ اس کا اقبال کر لے۔ اس لئے اگر کسی میں جرأت ہے تو منہ پر بات کہے۔ اگر کوئی شکوہ ہے تو بیان کرے شیکسپیر کا قول ہے کہ غیبت کی دھات تلوار سے زیادہ تیز ہے اور ایسے زہر میں کھجی ہوئی ہے جس کے سامنے دریائے نیل کے تمام سانپوں کا زہر بیچ ہے۔“

افسرہ اسلام بھی غیبت کی سخت مذمت کرتا ہے۔ رسولِ عربی کا قول ہے کہ غیبت کے معنی ہیں کہ تم کسی کی عدم موجودگی میں ایسی باتیں کہتے ہو جو اُسے ناگوار گذریں گی۔ ایک صحابی نے دریافت کیا کہ اگر وہ باتیں بھی سچی ہوں تو ان کے بیان کرنے میں کوئی حرج تو نہیں۔ آپ نے اس کی بھی ممانعت کی۔ یہاں تک فرمایا کہ غیبت زنا کاری سے بھی بدتر ہے۔ کیونکہ یہ فعل دوسرے کی نارضا مندی سے سرزد ہوتا ہے۔“

ماہیکل۔ بیشک ایک انسان کے یہی شایانِ شان ہے کہ وہ کسی کے منہ پر بھی ایسی بات نہ کہے جو اسے رنجیدہ کر دے۔ اگر آپ کو کسی سے ہمدردی ہے اور آپ اس کی خیر خواہی کا دم بھرتے ہیں تو اس کی عدوتانہ طریقے سے اصلاح کر دو۔ بات دراصل یہ ہے کہ تنقید کرنے والا اپنی برتری جتانے

کے لئے ایسی بات کہنا ہے جس سے اس کے نفس کو تسکین حاصل ہوتی ہے کہ وہ ایسا نہیں ہے۔ اس لئے میرا تو یہ اصول ہے کہ کسی کے متعلق بات کہنے سے پہلے اپنی ذات سے ذہنی طور پر یہ سوالات کرو۔ کیا جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں۔ وہ ضروری ہے۔ اس سے کسی کو رنج پہنچنے کا احتمال تو نہیں کیا اس سے اپنی نفسانی تسکین مفقود ہے یا دوسرے کی اصلاح۔ اگر اصلاح مقصود ہے تو اس شخص سے جو بات کیجئے۔ دشمن بنانے کا سب سے آسان طریقہ یہی ہے کہ دوسروں پر تنقید کرو۔ جس پر تنقید کرو گے۔ وہی تمہارا دشمن ہو جائے گا۔ اس حقیقت کو ملحوظ رکھو کہ ہر انسان ایک شخصیت کا مالک ہے۔ مفلس سے مفلس شخص بھی ایک خودی کا مالک ہے۔ آپ اسے اختیار سمجھتے ہیں تو اس کی خودی کو ٹھیس لگتی ہے۔ وہ آپ کو کچھ جواب نہیں دے سکتا۔ یہ اس کی مجبوری ہے۔ وہ دل میں ہزا کا لبیاں دیتا ہے۔ ایک انگریز ایک برمن کو فلام سمجھتا ہے۔ وہ گوری چھڑی پر تاز کرتا ہے مگر برمن انگریز کے سائے سے پرہیز کرتا ہے۔ اگر اس کا سایہ اس پر پڑ جائے تو گھر جا کر اشناں کرتا ہے تاکہ پو تر ہو جائے۔ اس کو بھی اپنی تہذیب پر فخر ہے۔ ایک جاپانی کسی جاپانی عورت کو کسی امریکی سے رقص کرنے دیکھتا ہے تو جل اٹھتا ہے۔ ذلیل عورت ایک امریکی سے ناچ رہی ہے۔ وہ جاپانی ہونے پر ناز کرتا ہے اور دنیا کا بہترین انسان ہونے پر یقین رکھتا ہے۔ امریکی اپنے آپ کو تمام انسانوں سے بالاتر سمجھتا ہے۔ ہر قوم اپنے آپ کو دوسری قوموں پر ترجیح دیتی ہے۔ ہر انسان اپنے آپ کو دوسرے انسانوں سے علیحدہ اور مختلف تصور کرتا ہے۔ اس لئے تنقید کوئی گوارا نہیں کرتا۔ یہ فطری اقتضا ہے۔ ایک ذہنی عقل انسان ہی تنقید سے صحیح فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ ایک دوست کا بھی یہی فرض ہے کہ وہ دوست کے افعال پر صحیح تنقید کرے اور اس کی اصلاح کی سعی کرے۔ فرق صرف تنقید کرنے کے طریقے میں ہے۔ ایک حجام بھی آپ کی حجامت یا شیو کرنے سے پہلے داڑھی کو خوب صابن لگا کر نرم کر لیتا ہے تاکہ انسرے کی کاٹ محسوس نہ ہو۔ اسی طرح فرض کرو کہ آپ کا کلرک کھتے وقت خوشحالی کو ملحوظ نہیں رکھتا تو بجائے اس کو ڈانٹنے کے آپ اس سے یوں مخاطب ہو سکتے ہیں۔ تم لباس تو خوب پہنتے ہو۔ بڑا جمالیاتی ذوق رکھتے ہو اگر کھٹے میں بھی جمالیاتی ذوق کا ثبوت دیتے تو کیا یہی اچھا ہوتا۔ اس طرح آپ اس کے جذبات کو مجروح کرنے کی بجائے اس کو اپنی خودی بند کرنے کی ترغیب دو گے۔ وہ آپ کے میاں خیال پر اترنے کی سعی کرے گا۔ آپ اس کو جھڑکینگے تو اسے رنج پہنچے گا۔ وہ اپنی غلطی کی اصلاح کرنے کی سعی نہیں کرے گا۔ اس لئے اصلاح سے پہلے غلطی کا احساس دلانا ضروری ہے

صحیح تنقید کا مزاج بھی ہے جب دوسرا خود میسوس کسے کہ غلطی ہے۔ آپ کی تنقید اس کی اپنی ذاتی تنقید میں مبتدل ہو جائے اسے اگر آپ کو کسی سے ہمدی ہے یا غیر عوامی کا دعویٰ ہے تو طریقہ اختیار کرو۔ اگر نہیں ہے تو اس پر تنقید یعنی ہے۔ آپ کو کسی متعلق لکھو یا اظہار رائے کا کوئی حق نہیں۔ اپنے دل میں چاہے جو خیال کرو۔ ہاں اپنے متعلق جو چاہے کہو۔ اپنے خیالات اور بات کے اظہار کا نہیں حق ہے بشرطیکہ دوسرے شخص کیلئے آمادہ ہوں اپنی بھی کہو اور دوسروں کی بھی سونگسی پڑا حق حملہ کرو۔ اگر تمہیں کسی کی عادات پسند نہیں تو نہ ہی۔ آپ اس کی صحبت گریز اختیار کریں۔ ہر کوئی اپنے ہم جنسوں کی صحبت کو ترجیح دیتا ہے۔

انصر بیگم باتیں کیا ایک کم خیر اور اہل تفریح ہے مگر غیبت مجھے بھی لغزت ہے۔ مجھے آپ لوگوں کی صحبت اسی لئے پسند آتی کہ آپ لوگ سوائے علمی یا ادبی موضوعات کے بہت کم کسی کتب متعلق گفتگو کرتے ہیں کسی کے متعلق بقدر نظر نایا افواہ پھیلاتا۔ بہت ہی مذموم فعل ہے اس سے غیبت کرنیوالے کی سنجی کا صاف ثبوت یہ سمجھتا ہے اور ایسے اشخاص کا علاج یہ ہے کہ انہیں منہ نہ لگایا جائے۔ کبھی میں انہیں خوش آمدید نہ کہی جائے۔ منہ پر دروغ بیانی کی تو کچھ ممانعت ممکن ہے مگر پیچھے ہٹ کر روکنا اعمال ہے مصیبت تو یہی پیش آتی ہے کہ اگر کرنیوالے کا پتہ نہیں چلتا مثل مشہور ہے کہ کھجور کو چوبیس گھنٹے کا وقفہ دے دو اور کچھ ہی تم اس کو پکڑ نہ سکو گے۔ ایک جھیل میں اگر پتھر پھینکا جائے تو ایک لمحہ تو پتھر جس جگہ غرق ہوتا ہے۔ دکھائی دیتا ہے مگر پتھروں کے بعد دھڑ سے کبھی یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ پتھر کس جگہ گرایا گیا تھا یہی حال غیبت افواہ یا گپ کا ہے منہ سے بات نکالنا سہل ہے مگر ادا کئے ہوئے الفاظ پھر کبھی واپس نہیں آتے۔

مس دینی: مجھے ایک نئی یاد ہے نیٹ فلیس کے پاس ایک عورت آتی جو ایسی ہی بد عادات کی شکار تھی اور اپنی اصلاح کی خواہاں تھی اس کو حکم ہوا کہ وہ ایک نئی عمارت خرید کر ایک منصوبہ بنوامں تمام تک پیدل چلا۔ اسی دوران میں مرغی کے پرفوج فوج کھینکتی جائے جب یہ کام ختم ہو جائے تو اگر اطلاع دے عورت حیران تھی کہ اسے گناہ کا کفارہ کی صورت تھی اس کی کو بنائی گئی۔ وہ جلدی جلدی کام سرانجام دے کر وہیں پہنچی نیٹ فلیس نے تعمیل حکم پر شاباش دی اور کہا کہ اب باقی کام بھی مکمل کر دو یعنی واپس جا کر جس جس اسٹے سے گذری ہو وہاں سے تمام کچھرے پکٹھے کر کے لے آؤ عورت بولی۔ یہ تو ناممکن ہے کیونکہ اس نے لاپرواہی سے پرکھیے تھے اور ہوا ان کو اڑا کر کہیں کا کہیں لے گئی ہوگی۔ وہ کہاں کہاں تلاش کر سکیگی فلیس نے کہا تمہاری مٹھی اور غیبت کی باتیں بھی انہی کچھرے ہوئے ہیں جن کو وقت نے دوھر اور پھر کچھیر دیا ہے جلاؤ اور ان باتوں کو داپس بلاؤ۔ اس کے بغیر کفارہ ناممکن ہے۔

انصر بیگم: سیاسی پروپیگنڈے کے متعلق کیا رائے ہے۔ اخلاقاً ایسے موقع پر مبالغہ اور دروغ گوئی کہاں تک

جائز بھی جاسکتی ہے۔ کیونکہ جنگ و جدت میں سب کچھ جائز ہے۔

مآئیکل۔ ایسے موقع پر مبالغہ آرائی اور دروغ بیانی کو قدرے بڑاشت کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ گروہ اپنے لیڈر کی خیر خواہی کے جذبات میں بہ جلتے ہیں۔ یہ فطری امر ہے مگر یہاں بھی وہی اصول کارفرما ہونا چاہئے۔ اپنے متعلق مبالغہ آرائی سے کام لے کر کوئی شخص خود اپنی توقیر کو ضعف پہنچا بیگا مگر اس کو یا اس کی پارٹی کو یہ حق حاصل نہیں ہونا چاہئے کہ وہ مخالف گروہ یا اس کے لیڈر کی مذمت کے اس کے متعلق کوئی افواہ پھیلانے اس کے خاندان کے متعلق دروغ بیانی سے کام لے تاکہ لوگوں کو نفرت ہو تھائی تو بیشک اشتہار کر سکتا ہے مگر بے بنیاد الزامات اختراع کرنا نہایت مذموم فعل ہے اور ایسے پروپیگنڈے کی خلاف آواز آئے گا۔ **مآئیکل**۔ اس کا عملی ثبوت وہ اس کے خلاف مدوٹ دیکر دے سکتا ہے۔ ایک مکینہ اور دروغ گو انسان نمائندگی کا اہل نہیں ہو سکتا۔ اس کی قانوناً ممانعت ہونی چاہئے۔

انصر۔ بیشک یہی اصول بھی تبلیغ کیلئے بھی قانون کی صورت میں عائد ہونا چاہئے۔ مذہبی اختلاف رائے کس قدر نفرت اور کشت و خون کی بنیاد بن چکا ہے۔ ہر شخص اپنے مذہب کو ترجیح دیتا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسرے مذہب کی مذمت کی جائے۔ میں اسلام کو پسند کرتا ہوں۔ آپ عیسائی کہلاتے ہیں شام ہند کہلاتا ہے مگر ہم کسی پر اعتراض نہیں کرتے آپ اپنا سائیکلنگ فخر پیش کرتے ہیں میں اسلامی فلسفہ پیش کرتا ہوں ہم ان نظریوں علمی تمقید کو کرتے ہیں مگر تعصب کی بنا پر نہیں۔ میرے زادائے کا حامی ہوں میں سچائی کا پرستار ہوں جو بات حق ہوگی میں وہی تسلیم کروں گا۔ اس لئے میں آپ سے تبادلہ نظریات کئے گا۔ اشتہائی رکھتا ہوں میں اسلامی عقائد کو آپ کی سائنس کی کسوٹی پر رکھتا ہوں میں کھولے سونے کو اپنے پاس کبھی رکھنا پسند نہیں کر سکتا میں پتلی کو کھولے سونے پر ترجیح دیتا ہوں جو خود پر طبع پڑھا کر دھوکا تو نہیں دیتا۔ یہی میں چاہتا ہوں کہ سچائی کا راستہ معلوم کروں اور پھر اس پر گامزن ہو جاؤں۔ اسی لئے میں آپ لوگوں کی باتیں سن کر زیادہ ہوں اور کہتا کم ہوں۔ میں نے کہا۔

مآئیکل۔ آج تو بات چیت کے موضوع پر خوب گفتگو ہوتی ہے غیبت اور دروغ بیانی سے کیا شرکار ہمارے پاس اتنے موضوعات ابھی باقی ہیں کہ ختم نہیں ہو سکتے۔ یہ تو جابلوں کے مشاغل میں ہم اس ضرورت کو اس طرح پورا کرتے ہیں تو دوسرے طریقے استعمال کرتے ہیں طریقہ کو نسا بہتر ہے۔ اس کے کہنے کی ضرورت نہیں۔ ہاتھ لنگن کو آرسی کیا۔ اب چلو کوئی کمبل کیلیں۔ تاش لائو کیمر بورڈ یا شطرنج جو بھی چاہو۔ ابھی ابھی حاضر کیا جاسکتا ہے۔

و شطرنج تو دنیاؤں کی کمبل جو چاہے۔ میرے خیال میں فیل گھوڑ سوار اور پیادے کی جگہ اب بار بار ہوائی جہاز و مشین

ٹیک اور ایجاد ہونے چاہئیں۔ زمانے کی یہ تھا کہ کھیلوں میں ترقی بھی ہونی چاہیے۔ ایسے نے شطرنج کی خدمت کرتے ہوئے کہا۔
 صخرہ تاش کی بازی لگانے کے حق میں تھامیں اور انصر کرم کے حق میں نہ۔ مگر ہم تھیں پانچویں صدی کے۔
 انتخاب کیا گیا تاکہ مشغول ہو سکیں۔ اب ایک اور وقت آن پڑی صخرہ تاش کو ترجیح دینا تھا۔ انصر اسے گناہ تصور کرتا تھا۔
 مائیکل بھی محسوم لغزین کا قائل تھا۔ کھیلتا تو ایک طرف رہا۔ جوئے کے موضوع پر بحث چھڑ گئی۔

مائیکل نے میرے نزدیک ایسے تمام جسمانی یا دوزخی کھیلوں میں جھڑپ کرنا بہترین تھی۔ جو آدمی کو گناہ سے آلودہ
 نہیں کرتے۔ اسی طرح دوسرے کھیل میں مثلاً تاش۔ لڈو۔ کیرم۔ ہورو۔ شطرنج۔ ڈاٹ بورڈ۔ بیرڈ۔ پنگ پے۔ ٹیگ وغیرہ ایسے
 مشغول سے جسم یا دماغ کو کوئی ٹھکن محسوس نہیں ہوتی۔ انسانی ذہن دوسری طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے
 تفکرات بھول جاتا ہے۔ انسان کی فطری خواہش برتری خود کو دکھاتی ہے۔ ہر کوئی جیتنا چاہتا ہے۔ مقابلہ میں لطف آتا ہے
 صخرہ تاش کی بازی لگانا بھی اسی لطف میں اضافہ کا باعث بنتا ہے۔ مقابلہ زیادہ شدت اختیار کر لیتا ہے۔ مارنے
 جیتنے کا سوال ہیثیت حاصل کر لیتا ہے اور شطرنج کی بازی لگاتی ہے جب کسی ٹورنامنٹ میں کپکپ انعام شامل ہو
 تو پھر کھیل کس قدر دلچسپ ہوتا ہے اور مقابلہ کتنا سخت ہوتا ہے۔

مائیکل نے مگر کھیل کپکپ حصول کیلئے کھیلا نہیں جاتا۔ اس کی قیمت ملحوظ نہیں ہوتی بلکہ کپکپ کے ساتھ جو فتح و کامیابی
 کی ستر اور عزت و شہرت منسوب ہوتی ہے۔ کھلاڑی اس کیلئے مرتا ہے۔ پچاندی کا تحفہ و کپ تو معمولی قیمت کا ہوتا
 ہے۔ یہ رقم تو وہ بآسانی حاصل کر سکتا ہے۔

صخرہ تاش جوئے سے آپ کیا مراد دیتے ہیں؟

مائیکل: جو کھیلنے کے معنی ہیں کہ دوسرے کے نقصان سے فائدہ اٹھایا جائے۔

صخرہ تاش اس نقصان کو برداشت کرنے کیلئے دوسرے ضامن ہوتے ہیں کسی سے ذہنی و مصلحتی نہیں کیا جاتا۔
 مائیکل: بیشک اس کی ضامن میں شامل ہوتی ہے مگر اس سے مجموعی دولت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ ایک
 دولت سمٹ کر دوسرے کپکپ چلی جاتی ہے۔ جو کھیلو۔ شرط لگاؤ۔ یا گھوڑوں کے ٹکٹ خرید دیا۔ شہر میں
 بہر حال دسروں کو روکنا ہیچا کر ہی حاصل ہوتی ہے۔ کہ یہ سب کچھ تو فساد و فحش ہے۔ اس میں شہرت کی قیمت نہیں ہوتی۔
 اپنے جیسے انسانوں کے انصافوں کی کچھ انسانیت کے لائق نہیں ہو سکتی۔ یہ بدعت کوئی اب شرٹ میں بھلا ہوتا
 میں اور ہر ملک میں قمار بازی کی تباہ کاری لگاتی رہی ہے۔ تاریخ اس کی شاہد ہے۔ کو روکنا دلوں کا اقتدار

رومن لطفت کی تباہی اس کی مشہور مثالیں ہیں۔ موجودہ زمانہ میں جو ادب کی صورت اختیار کر چکا ہے ہر طبقہ کے لوگ اس مرض کا نشان ہیں۔ شہروں میں رہنے والے کلرک ہوں یا چہر اسی، مزدوروں یا سربراہان عورت ہو یا مرد۔ سبھی شام کے اخبارات کی اشاعت کا بچپنی سے انتظار کرتے ہیں۔ کیوں؟ کیا وہ سیاسی معاملات میں دلچسپی لیتے ہیں؟ کیا وہ اپنی ملکی متنی اور بیہودی کے خواہاں ہیں؟ نہیں۔ وہ سلسلہ کا بھاد معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ گھٹو دور کے نتائج سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں۔ تاکہ دیکھیں کہ وہ امیر کبیر ہو گئے ہیں یا پہلے سے بھی زیادہ مفلس۔ لالچ ہسی بلا ہے۔ امیر مغل کے امکانات بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ ورنہ جو اٹھانے والوں کو فائدہ ہے۔ آخر ایک شخص کو بہت سارو پیسے بٹا کر دینا کی جیسے ہی حاصل ہوگا۔ ہارنے کا امکان ہمیشہ زیادہ ہوتا ہے۔ ہارنے کی صورت میں ایک مفلس شخص چوری کا اتمام کرتا ہے، ایک غریب کلرک یا چہر اسی اتنی احتیاط کماں رکھتا ہے۔ یہ اُمید ہمیشہ ختمی ہے کہ اگلی دفعہ شاید کچھ لاخسارہ پورا ہو جائے۔ وہ پھر دواؤں لگاتا ہے اور یہی قمار بازی کا سب سے بڑا عیب ہے کہ ہارنے کی صورت میں انسان کبھی کھیلنا بند نہیں کر سکتا۔ وہ جیتنا چاہتا ہے اور یہی خواہش اس کی تباہی کا پیش خمیہ بنتی ہے۔ جیل کے ریکارڈس بات کا ثبوت ہیں۔ اکثر مفلس لوگ اس قمار بازی کی بدولت جیل کی جوا کھاتے ہیں۔ اکثر غریب کلرک چوری کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور اپنے ساتھ اپنے خاندان کی عزت کو بھی ڈبو بیٹھتے ہیں۔ بچہ اگلی طرح کھیلنا جاتا ہے مقصد ایک ہی ہے۔ تاش پاسہ گھوڑے۔ سٹرسٹاک اور شیرزیہ سب قمار بازی میں شمار ہوتے ہیں۔ سوئی کا رول جیسے مقامات موجودہ دور بہت مزیدار ہیں۔ میزوں کے گرد کھیلنے والوں کے چہروں پر نظر ڈالنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ کس طرح قمار بازی ان کے ذہن پر مسلط ہو چکی ہے۔ کیا ایسا کوئی کھیل تفریح کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے جس کا نتیجہ دولت اور تباہی ہو؟

صغیر و مگر یہ تو جو کھیلنے والوں کا اپنا تصور ہے۔ انہیں اتنا ہی کھیلنے چاہیے جتنا کہ وہ آسانی سے ہار سکتے ہیں۔

مائیکل جی ہی تو بھید ہے کہ انسان ہر کبھی ہمت نہیں ہارتا۔ جب تک سانس متب تک اس نے ہارنے والا کھیلنا چلا جاتا ہے۔ امید کی ٹہری کرن اسے سحر کے رکھتی ہے۔ بچوں جوں و دو ہارتا ہے جیتنے کا جذبہ اور شدت اختیار کرتا جاتا ہے۔ اس کی خودی کو بخش لگتی ہے اور اس کی تحافی اسی طرح ممکن ہے کہ وہ جیتے شکست کس قدر نفرت انگیز مرے یہی جذبہ ملوہ ملوہ کھیلنے والے کو تباہی کے غاتک لے جاتا ہے۔

اڑی بیڑی سے غار کی تاریکیوں میں پھیل دیتا ہے۔ دھماکے کی آواز سے انسان چوکتا ہے مگر بیسود۔“

انصرؒ اس کی مثال تو ایسی ہے کہ کسی شرابی کو دکان میں بند کر دیا جائے اور پھر اس کو مورد الزام

ٹھہرایا جائے کہ اس نے حد سے زیادہ کیوں پی۔ قمار بازی بھی ایک نشہ ہے۔ شراب کی لت کے برابر۔“

مس روپیؒ جبے برج اور غلیش کا عام رواج ہوا ہے۔ قمار بازی بھی ترقی پذیر ہے۔ بعض

سوسائٹیوں میں تو یہاں تک ان کھیلوں کا جنون ہے کہ صبح سے شام ہو جاتی ہے اور شام سے پھر صبح،

مگر کھیل جاری رہتا ہے۔ صوف تھوڑا وقفہ کھانے کے لئے دیا جاتا ہے۔ رہنچ پارٹیاں مغرب میں بے شمار

شادی شدہ اور دو شیرہ لڑکیوں کی عصمت کی بربادی کا باعث بن چکی ہیں۔ وہ اس قدر رقم ہار جاتی ہیں

جو ان کی استطاعت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اپنے شوہر اور والدین کو اس حقیقت سے بے خبر رکھنے

کے لئے اپنے مرد دوستوں سے قرض لینے پر مجبور ہو جاتی ہیں اور اس طرح بیشمار عورتیں اکثر بدکردار مردوں

کے پنجے میں گرفتار ہو جاتی ہیں جو اپنا قرضہ وصول کرنے کا سہل طریقہ جانتے ہیں۔ بیشمار عورتوں کی عصمت

اس قمار بازی کے بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔“

انصرؒ اسی لئے تو قرآن حکم دیتا ہے کہ اے ایمان والو! بلاشبہ شراب، جوا۔ پانسداؤ

بُت مذموم شیطانی افعال ہیں۔ اس لئے ان سے پرہیز کرو تا کہ تم پھیلو اور ٹھپو۔“

تاش کی بازی شروع ہوئی۔ آخر ایک تجویز پاس ہوئی۔ یعنی کھیلنے والے ایک یا دو روپیہ سے نیلے

رقم نہ ہائیں جیت کی رقم کھیل کے اختتام پر ایک جگہ جمع کر دی جائے۔ جب کافی رقم ہو جائے تو اسے

کسی دن پینک میں صرف کر دیا جائے جس میں باسے کھیلنے والے شریک ہوں۔ صرف چھٹی کے دن

دو تین گھنٹوں کے لئے اس تفریح سے حظ اٹھایا جائے۔ دونوں فطری ضروریات کی تسکین کا یہ طریقہ

اختراع کیا گیا۔ اگلے دن کے لئے پینک کا پروگرام مرتب کرنے کے بعد ہم رخصت ہوئے۔

پوٹھا باب

پکنک۔ پارٹیاں۔ دعوتیں وغیرہ

رستوران میں احباب وقت مقررہ پر حاضر تھے۔ پکنک کا سامان ہتیا کس کے جانب دریا روانہ ہو گئے لاری میں اسی موضوع پر گفتگو شروع ہوئی۔

مائیکلؒ کھانا اور پینا فطری جسمانی ضرورت بھی ہے اور ذائقہ کی لذت اس فعل کا اہم جزو ہے۔ انسان سماجی حیوان ہے۔ اس لئے وہ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ کھانے پینے میں ایک مسرت محسوس کرتا ہے یہ مسرت وہ پکنک، ڈنر، چائے یا گارڈن پارٹی یا شاوی کی دعوت کے ذریعے حاصل کرتا ہے۔ مقصد تو افراد کو جمع کرنا ہوتا ہے۔ یہ سب سماجی خواہش کی بدولت عمل میں آتا ہے۔ کھانے پینے سے لطف اٹھانا ثانوی درجہ رکھتا ہے۔ ایسے مواقع ہتیا کرنا یا ان میں شامل ہونا اخلاقی نکتہ نگاہ سے جائز ہیں۔ صرف اتنی احتیاط لازمی ہے کہ زبان قابو میں رہے۔ کیونکہ باتیں کرنا ایسے مواقع پر ہی مرغوب ترین مشغلہ ہوتا ہے اور یہی وہ سب سے کم قیمت تفریح ہے جس کو ہم زیر بحث لا چکے ہیں۔ گفتگو کے علاوہ کھیل۔ تماشے۔ موسیقی اور رقص بھی ایسے مواقع کے لوازمات ہو سکتے ہیں۔ غیبت، ہنجلی، افواہ اور دروغ بیاہنی سے اجتناب کے علاوہ اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہئے کہ ایسے مواقع پر مفلس و نادار ہمسائے اور رشتہ دار بھی فیض یاب ہو سکیں کیونکہ عام طور پر صاحب ثروت لوگ ہی ایسی دعوتوں کا انتظام کر سکتے ہیں اور مدعو بھی امراء

اور رؤسا کو ہی اکثر کیا جاتا ہے۔ لذیذ کھانے صاحب ثروت لوگوں کے لئے اتنی جاذبیت نہیں رکھتے۔ جتنی کہ عزت و شہرت کی بھوک کی تسکین۔ اس لئے بچے کچھے کھانے کی بجائے مفلس و نادار لوگوں کو اچھے اور لذیذ کھانے کھلانے چاہئیں تاکہ حقیقی مسرت حاصل ہو۔

انصر: اس امر کو میں بھی محسوس کرتا ہوں کہ فائدہ اہل مسلمان عید اور بقر عید کے تہواروں پر تحفے و تحائف ایسے اشخاص کو بھیجتے ہیں جو ان کی طرح صاحب ثروت ہوتے ہیں۔ قربانی کے جانور کا گوشت اسلامی حکم کے مطابق تین حصوں میں تقسیم کرنا چاہئے۔ ایک حصہ اپنے لئے۔ ایک مفلسوں کے لئے اور ایک حصہ سزا و اقرار کے لئے وقف ہونا چاہئے۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ اچھا گوشت زوان لوگوں کی نذر ہو جاتا ہے جو سائے سال گوشت کی لذت سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں جن کے لئے گوشت کوئی جاذبیت نہیں رکھتا۔ قربانی کا گوشت ایسے لوگوں کو عموماً بھیجا جاتا ہے جو خود بھی قربانی کا گوشت بلوریتھ بھینچنے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ اس لئے آپس میں ایک قسم کا تبادلہ گوشت قرار پاتا ہے۔ یعنی اس طرح دوسرا حصہ بھی اپنے پاس ہی رہتا ہے اور تیسرا جو غریب و مساکین کا حق ہے اس میں سے برائے نام نھوڑا ساقیوں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ اس لئے خواہ میرے صاحب ثروت لہذا و اقربا مجھ سے کشیدہ خاطر رہیں میں تو ان کو گوشت نہیں بھیجتا۔ جو احباب ارشد و ارادہ مندانے قربانی کی استطاعت نہیں رکھتے۔ میں ان کو گوشت بھیجتا ہوں تاکہ تبادلہ نہ ہو سکے۔ احباب کی دعوت کے لئے گوشت بچا کر باقی سب گوشت مفلس و نادار لوگوں میں تقسیم کر دیتا ہوں مجھے جو مسرت ان لوگوں کو کھلا کر ہوتی ہے۔ وہ صاحب ثروت لوگوں کو کھلانے سے نہیں ہوتی۔

مائیکل: بے شک یہ اخلاقی کمزوری ہے کہ دولت مندوں سے زیادہ راہ و رسم رکھی جائے۔ کیونکہ ان سے فائدہ پہنچنے کا امکان ہوتا ہے۔ یہ سرمایہ داری کی لعنت ہے۔ جس کے طفیل ایک بدکردار شخص دولت کے چمکیلے لباس سے اپنے عیوب کی پردہ پوشی کرتا ہے۔

انصر: امداد مسلمان جو سوائے خدا کے کسی کے لئے نہیں جھک سکتا۔ ایک انسان کی خوشنودی کا طالب ہوتا ہے۔ اس کی خوشامد کرتا ہے۔ غلط سچا ہے اور اس لئے مسلمان کو باطل کے

آگے کبھی سڑنگوں نہیں ہونا چاہئے۔ باطل کیا ہے۔ یہی انسان کی فطری کمزوریاں جن پر فتح حاصل کرنا آیت کی فتح ہے اور انسانیت کی فتح اللہ کی شیطان پر فتح ہے۔

ان خاص مواقع کے علاوہ تعطیل کا دن کیونکر گزارنا چاہئے؟ میں نے سوال پیش کیا۔

انصر پہلی بات تو یہ ہے کہ اتوار۔ جمعہ یا منگل کا دن ہر ہفتہ میں مختلف مذاہب نے بطور تعطیل اس لئے مختار کیا ہے تاکہ انسان آرام اور تفریح کر سکے اور ساتھ ہی مذہبی امور کی ادائیگی اور تعلیم کے لئے ہفتہ میں ایک دن خاص طور پر مفید بنا سکے۔ عیسائیوں کا اتوار۔ مسلمانوں کا جمعہ ہندوؤں کا منگل وغیرہ سب اسی مقصد کو لئے ہوئے ہیں۔ تاکہ ہر شخص اس دن آرام کر سکے اور مذہبی تعلیم حاصل کر سکے۔ کیونکہ کاروباری اوقات میں سب کا ایک ہی جگہ جمع ہونا ایک مشکل امر ہے۔ ایک دن کے لئے دُنیاوی و حندوں سے نجات اس تعطیل کا مقصد ہے۔

ماٹیکل : مگر ہوتا کیا ہے۔ اس کی تصویر میں پیش کرتا ہوں۔ مغرب میں اتوار کے جشن بڑے مقبول ہیں۔ ہفتہ کی شام تک جہاں آجاتے ہیں۔ ایک شاندار ڈنر کا انتظام کیا جاتا ہے۔ موسیقی و رقص اور برج کا کھیل آدھی رات گئے تک جاری رہتا ہے۔ اتوار کی صبح کو نو بجے سے گیارہ بجے تک ناشتہ کھلانے میں نوکر مصروف رہتے ہیں کچھ جہاں رسماً گر جانا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے گھوڑے اور گاڑیوں کا بندوبست نوکروں کے ذمہ ہوتا ہے جب تک جہاں واپس نہیں آتے۔ گھر والے اور نوکر چاکر و سپر کے کھانے کے انتظام میں مصروف رہتے ہیں۔ اس کے بعد کچھ جہاں گولف کھیل میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ کچھ دیہات کے گرد و نواح کی سیر کے لئے چلے جاتے ہیں پھر شام کی چائے کا وقت ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی کچھ اور جہاں بھی پہنچ جاتے ہیں۔ بجائے خدام ان کا بھی انتظام کرتے ہیں۔ شام سے سات تک پھر وہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ آدھی رات گئے تک نوکر چاکر ڈرامہ کر سیدھی کرتے ہیں کہ سبج ہو جاتی ہے اور انہیں علی الصبح ہی ناشتہ اور سواری کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ میزبان کے جانے کے بعد وہی روز کا معمول اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اب عیسائیت کے نقطہ خیال سے غور کیجئے۔ یہ کس قدر اتوار کے مقصد کے منافی ہے حضرت عیسیٰ نے تو اس لئے اتوار کو دُنیاوی کاروبار کی ممانعت کی تھی تاکہ تمہاری خادمہ اور خادم کو تمہاری طرح

آرام کا دن نصیب ہو۔ کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ بچے ملازم جو چھ دن محنت اور مزدوری کرتے ہیں۔ تعطیل کے دن ان سے دو گنا سہ گنا کام لیا جائے۔ ان کی صحت ہماری امانت میں ہے۔ کیا اس ذمہ داری سے اسی طرح عہدہ براری کی جاتی ہے کہ بجائے چھٹی دینے کے ان سے اور زیادہ کام لیا جائے۔ ان کی جدت کو تباہ کیا جائے۔ یہ اتوار کا جشن ان کے اپنے لئے تو تعیش کا روز ہے مگر نادموں کے حق میں صریحاً ظلم ہے۔ کیا یہ جشن کسی اور دن ممکن نہیں ہے۔ یہ امر تو عیاں ہے کہ جو دعوتیں دینے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ وہ جس دن چاہیں جشن منا سکتے ہیں۔ ان کے لئے تو تعطیل کا انتظار کوئی ضروری نہیں ہوتا۔ وہ کسی دن بھی اپنے احباب کو مدعو کر سکتے ہیں۔ مگر اپنے ملازمین کو ان کے حق سے محروم کرنا سراسر ظلم، گناہ اور بے انصافی ہے۔ ان کا دل بھی گرجا جانے کو چاہتا ہے۔ آرام اور تفریح کے لئے جی تو رستہ ہے۔ انہیں اس سے باز رکھنے کا ذمہ دار سربراہ دارانہ نظام ہے۔

افسردہ اتوار، جمعہ یا کوئی اور چھٹی کا دن کس طرح بسر کرنا چاہئے؟
سائیکل۔ اس سلسلے میں دو باتوں کو اصول تصور کر سکتے ہو۔ ایک یہ کہ چھٹی کا دن کسی مذہبی تقریب سے وابستہ ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ تعطیل کا مقصد جسمانی اور ذہنی خست و مشقت سے گزارہ کشی ہے یعنی آرام اور تفریح کے ذریعے تازہ دم ہو کر ہجر زندگی کی جگہ کے لئے تیاری۔ اب رہا سوال کہ تفریح کس قسم کی ہونی چاہئے تو اس کے لئے کوئی قاعدہ مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ہر فرد اپنی پسند کا کامک ہے اور حالات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک دو لقمہ شخص ہفتہ کا مزدور نہیں کیسے نہ جانے موٹر پر سیر کرنے میں گزارا کرتا ہے۔ اس کے برعکس ایک کلرک یا مزدور کو اتنی فرحت کہاں کہ وہ چھ دن میں سوائے کام کے کوئی تفریح کے لئے وقت نکال سکے۔ اس لئے اس کے لئے یہی مناسب ہے کہ وہ چھٹی کے دن خوب کھیلے۔ سیر کرے۔ سائیکل پر شہر سے باہر نکل جائے۔ دریا میں نہلے۔ ذہن کو آرام کا موقع دے۔ نیچے تو کوئی ہوتی ہے۔ جب لوگ گھر آکر بھی وہی دفتر کی باتیں دہرانا شروع کر دیتے ہیں چھٹی کے دن دوسروں کو اپنی کاروباری اور دفتری زندگی کی غیر دلچسپ باتیں سناتے ہیں۔ چھٹی کے دن سب تفکرات سے نجات حاصل کرنی چاہئے۔ یہ دفتر کی باتیں دفتر میں ہی متغفل کر دینی چاہئیں۔ زندگی جیتنے

کا نام ہے۔ اس لئے ایک دن تو مینا سیکھو۔ ایک دن آزاد رہنا بکھو گے تو باقی چھ دن کی غلامی سے بھی نجات حاصل کرنے کی راہ سوچو گے۔ کھیلنا، کھانا، تاجنا، گانا اگر سوموار کو جائز ہے تو اتوار یا جمعہ کو ناجائز نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ اتوار کو مذہبی رہنماؤں کی نگاہ میں شمس کھیلنا وغیرہ گناہ ہے مگر جس کو سوائے اتوار کے اور کوئی دن ہی تفریح کے لئے نصیب نہ ہو، وہ بیچارہ کیا کرے۔ میں نے اُسول یہ وضع کیا ہے کہ جو لوگ چھ دنوں کیلئے اتنی استطاعت رکھتے ہیں کہ وہ ہر تفریح اور کھیل سے شام کو یا کسی اور وقت لطف اندوز ہو سکیں۔ ان کے لئے یہی مناسبت ہے کہ وہ چھپوٹے دن اپنی تفریحات میں وقت گزارنے کی بجائے کوئی اور مفید کام سرانجام دیں۔ اپنے ہجمنوں کی بھلائی کے لئے قدم اٹھائیں۔ بل نصیب انسانوں کی کوئی خدمت کریں۔ ان کے لئے ہر روز عید ہے۔ ہر روز اتوار ہے۔ اس لئے اتوار کو بھی وہی مشاغل اختیار کرنا کوئی احسن فعل قرار نہیں دیا جاسکتا۔ چھٹی ان کا سختی ہے جو محنت و مشقت کرتے ہیں۔ جو چھ دن قید میں گزارتے ہیں۔ دفتر اور دکانیں جیل سے کچھ کم نہیں ہیں۔ وہ ایک دن کھلی ہوا میں آزادی کا سانس لیں۔ جیسے ہمارے سعید صاحب اور جو چھ دن آزادی کی ہو اکھاتے ہیں۔ ان کے لئے کوئی سنجیدہ مشغل ہی مناسبت ہے۔“

اتنے میں دریا کا پل اُگیا۔ ہم لوگ اتر کر کسی سایہ دار جگہ کی تلاش میں مشغول ہو گئے۔ پھر لکڑیاں چننی گئیں۔ چو لھانا یا گیا سوری بچھا دی گئی اور گراموفون سے موسیقی کا چشمہ اُل پڑا۔ ایک ایک فرض سب کو سوپ دیا گیا۔ کوئی آلو پھیلنے لگا تو کوئی پایز کاٹنے لگا۔ ہاتھ کام میں مصروف تھے۔ زبان گفتگو میں مشغول تھی۔ کان موسیقی سے معمور تھے۔ نظریں قدرتی مناظر سے لبریز تھیں۔ مس روہی نے انگریزی ناپچ کار لیکار ڈلگا دیا اور اپنے حسین جسم کو حرکت دی۔

موسیقی بھی کیا سحر ہے اور جب حسن اسے سرانجام دے تو پھر سونے پر بہاگ ہو جاتا ہے۔ ”صخر گو یا ہو“ مائیکل۔ دس اور موسیقی تو ام نہیں ہیں موسیقی حسنِ صوت ہے تو قص حسنِ حرکت ہے۔ فضا موسیقی سے جب معمور ہوتی ہے تو انسانی ذہن پر ایک سکوت سا طاری ہو جاتا ہے۔ ایک کیف سا محسوس ہوتا ہے۔ اگر موسیقی ناچ کی قسم سے ہو تو خود بخود انسانی اعضا متحرک ہو جاتے ہیں حسنِ صورت و صورتِ انسان کے لئے بے پناہ کشش اور جاذبیت رکھتا ہے۔ بادشاہ ہو یا فقیر۔ ولی اللہ ہو یا گنہگار۔ موسیقی

سب کے لئے یکساں طور پر سحر طراز ہے۔ موسیقی کان کے پردوں کے ذریعے ذہن کو مسحور کرتی ہے تو رقص آنکھوں کی تپیلوں کے ذریعے ذہن کو مسحور کرتا ہے۔“

”رقص اور موسیقی کی تاریخ کیا ہے؟ میں نے پوچھا۔

مائیکل۔ تمام زمانوں میں موسیقی اور رقص انسانی جذبات کی ترجمانی کرتے آئے ہیں۔ قدیم دور ہندوستان میں تو ان دونوں کو عبادت میں ایک خاص اہمیت حاصل تھی۔ موسیقی تو اب بھی کئی مذاہب کی عبادت کا ایک جزو ہے۔ اگرچہ رقص کو عیسائیت اور اسلام میں کوئی مذہبی درجہ حاصل نہیں ہے۔ لیکن مغرب میں رقص عید قبول ہے۔ رقص کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو رقص دیکھنا دوسرے تو رقص میں حصہ لینا۔“

”رقص کے کمالات کے مظاہر سے لطف اندوز ہونا اخلاقاً کہاں تک جائز ہے؟ میں نے پوچھا۔

مائیکل۔ جہذب رقص کے کمالات کا مظاہرہ جائز ہے، البتہ رقص جو آرٹ کا حامل ہو۔ اکثر رقص اس فحش کے ہوتے ہیں جن کی دلکشی کا باعث صرف عورت کا وجود ہوتا ہے۔ عورت کا حسین جسم برہنہ یا نیم برہنہ حالت میں ایک خاص انسانی طبقہ کے لئے جاذبِ نظر ہوتا ہے۔ یہ جنسی جھوک کی تسکین کا ایک ذریعہ ہے۔ لیکن تو کیا ہو سکتی ہے۔ البتہ جذبات ضرور مشتعل ہو سکتے ہیں تسکین تو صرف انہی اشخاص کو حاصل ہو سکتی ہے جو صرف جالیاتی ذوق کی ذہنی تسکین چاہتے ہیں۔ اصول یہی قائم کیا جا سکتا ہے کہ ہر شخص اس معاملے میں اپنی سمجھ سے کام لے۔ اگر وہ ایسے رقص کا متحمل ہو سکتا ہے اگر وہ شادی شدہ ہے اور کسی قسم کی ترغیب گناہ محسوس نہیں کرتا تو اس کے لئے ایسے رقص سے لطف اندوز ہونا جائز ہے۔ اگر وہ کنوارا ہے اور ایسے رقص اس کے جذبات کو مشتعل کرتے ہیں تو یقیناً اس کے لئے ناجائز ہیں۔ میری رائے میں گناہوں کو بلائے رقص دیکھنے سے پرہیز ہی رکھنا مناسب ہے۔ اسی طرح نابالغ بچوں کیلئے عشقیہ یا جنسی فلمیں اور رقص وغیرہ ممنوع ہونے چاہئیں سب میں ان کی اپنی بھلائی مضمر ہے۔“

”اچھا تو تفریحی رقص کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ میں نے پوچھا۔

مائیکل۔ رقص بطور ایک سماجی تفریح مجھے بہت پسند ہے۔ مشرق میں اس کا عام رواج نہیں اور یہ بھی کیسے سکتا ہے جو اقوام مرد و عورت کے آزادانہ میل ملاپ کی حامی نہیں ہیں۔ ان کی معاشرتی اور صلی زندگی میں تفریحی رقص دوسری کو کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔ مگر جو لوگ مرد و عورت کے ملاپ کو بری نظر

نہیں دیکھتے۔ ان کے سماج میں شام یا رات کا رقص بطور ایک تفریح ہی مقبول ہے۔ یہ رقص بھی ایک کھیل یا تفریح کی حیثیت رکھتا ہے اور محصورانہ طریق سے اس سے لطف اندوز ہونے میں کوئی بُرائی نہیں ہے۔ انصر آپ کا کیا خیال ہے؟

انصر: مذہب تو اصولاً لہو و لعب پر ہیبنہ کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ تاکہ گناہ کی ترغیب عمل میں نہ لگے۔ اسلام بھی تعیش کو پسند نہیں کرتا۔ پاکیزہ موسیقی اور رقص سے حطاً اٹھانا ممنوع نہیں۔ باقی رہا تفریحی رقص کا سوال تو اس کے لئے مشرق کی طرز معاشرت میں کوئی جگہ نہیں۔ اسلامی حکام پر وہ کی موجودگی میں اس کے جائز یا ناجائز ہونا خارج از بحث معاملہ ہے۔

مس روبی: میں رقص کی دلدادہ ہوں مگر مجھے ایک اعتراض ہے کہ تفریحی رقص عام طور پر رات کو دیر میں شروع ہوتا ہے اور آدھی رات گزرنے کے تین چار گھنٹہ بعد جا کر کہیں ختم ہوتا ہے۔ اس سے جسم و صحت کو اڑھ تکلیف پہنچتی ہے۔ نیند کی کمی اور اس پر کثرت شراب نوشی کا انا ر دوسرے دن عموماً نہایت تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے ناچ شام کو غروب آفتاب کے بعد ہی شروع ہو جانا چاہئے اور زیادہ سے زیادہ ساڑھے گیارہ بجے ختم ہو جانا چاہئے۔ اس قسم کا قانون مجھے خیال میں ضرور وضع ہونا چاہئے تاکہ رقص گاہیں وقت مقررہ پر بند ہو جائیں۔

مائیکل: مجھے آپ کے اتفاق سے حد سے تجاوز کرنا اپنے ہی حق میں مضرت رساں ہے۔

انصر: اس رقص سے فائدہ کیا ہوتا ہے؟

مائیکل: تفریحی رقص بہت سی خوبیوں کا حامل ہے۔ رقص ایک ترقی خواہش ہے۔ اس لئے انسانی ضرورت بھی ہے۔ ورزش کی ورزش اور تفریح کی تفریح۔ اچھا رقص کرنے کے لئے جسم کا ترقی ہونا لازمی امر ہے۔ بے ڈول جسم سے رقص میں جھڑپ آنا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ رقص نوجوان مرد و عورت کو باہمی میل ملاپ کا موقع بہم پہنچاتا ہے۔ اجنبیت دور ہو جاتی ہے اور اس طرح اپنے لئے شریک زندگی کے انتخاب کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ تفریحی رقص سے ہفتہ میں ایک دو دفعہ لطف اندوز ہونا چاہئے۔ ہر روز یہی پروگرام مناسب نہیں۔ دنیا میں اور کام بھی ہیں اور صحت کے لئے نیند لازمی چیز ہے۔

انصر نہ کر اس قسم کے رقص سے اخلاق تباہ ہونے کا اندیشہ رہتا ہے جیسے سننے میں یہی آیا ہے کہ رقص کے دوران میں مرد و عورت اپنے اخلاق کو پس پشت ڈال دیتے ہیں اور آزادانہ جسمی بھوک کی تسکین کرتے ہیں۔

مائل یہ کہنا حقائق سے لاعلمی کا اظہار ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مغربی سماج میں رقصین سے ہی لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کی موجودگی کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ وہ لڑکپن سے ہی رقص کا درس لینا شروع کر دیتے ہیں اور اس طرح عادی ہو جاتے ہیں۔ عورت کا لمس ان کے لئے بھی کاجھٹکا نہیں رہتا جیسا کہ مشرقی سماج میں۔ مرد و عورت کے جسم یا ہاتھوں کا لمس ہونا کوئی انوکھی بات نہیں رہتی۔ رقص میں حصہ لینے والے مہذب ہوتے ہیں۔ البتہ بدکردار مرد و عورت بر سملج میں پائے جاتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک لڑکی جو دیہات میں پلی ہو۔ اسے بخلنت کسی عالی شان رقص گاہ میں ناچنے کا موقع میسر آ جائے۔ اس کے جذبات بھرک اٹھیں اور کسی مرد کی چابو پسی کا شکار ہو جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس لئے اس کا اصول یہ ہے کہ جو مرد عورت رقص گاہ کے ماحول کے متحمل نہیں ہو سکتے جو موسیقی کا جسمی ترغیب اور روحانی فضا کا مقابلہ نہیں کر سکتے جیتیں گناہ کی ترغیب ہوتی ہے اور جنہیں اپنے جذبات پر عبور حاصل نہیں ہے۔ ان کیلئے رقص میں حصہ لینا یقیناً گناہ ہے۔ ان کے لئے معصوم تفریح بھی نامناسب اور ناجائز ہے مگر ایسے مرد عورت جو رقص سے معصومانہ طور پر حفا اٹھا سکتے ہیں۔ انہیں اس سے مسرت حاصل کرنے کا حق ہے ان کو رقص کرنے دو۔ جہاں تک وہ کسی بھی قول و فعل سے قانون زندگی کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔ انہیں ہر طرح کا حق حاصل ہے۔ ہر چیز سے لطف اٹھاؤ۔ فطری ضروریات زندگی کو پورا کرو مگر گناہ سے دامن کو آلودہ نہ ہونے دو۔ اگر موسیقی اور رقص نہیں خدا۔ سچائی۔ نیکی کے راستے سے گمراہ کرنا چاہتے ہیں یا تم خطرہ محسوس کرتے ہو تو ان چیزوں سے پرہیز کرو۔ تمہیں ان سے مسرت حاصل کرنے کا کوئی حق نہیں ہے کسی کی آزادی کی کسی کو نا انہایت مذموم فعل ہیں۔ رقص اور بیوقوفانہ چیزیں ہیں۔ ان کو اپنے گندے خیالات سے آلودہ نہ کرو جو فعل انسانیت کے شایان شان ہے وہ کرو۔ نیکی اور سچائی کے راستے پر گامزن رہو یا مذہبی اصطلاح میں اللہ کے احکام کی اطاعت کرتے رہو۔ خود جیو اور دوسروں کو جینے دو۔ خود پاکیزہ رہو اور دوسروں کی عصمت کا تحفظ کرو۔ اس قانون پر عمل پیرا ہو کر نوب رقص کرو۔

حسن سے ہم خوش رہو۔ موسیقی سے ہمکنار رہو۔“

اور یہ کہ مائیکل نے رونی کے ساتھ قصہ کرنا شروع کر دیا۔ نعمتہ نفس پر کیف تھا۔ موسیقی کی نصرت عینا نہیں ہو سکتی۔ ہم کس قدر خوش نصیب ہیں جو ایسے وقت میں پیدا ہوئے۔ موسیقی دیکھا ڈول میں بند بیماری خدمت میں ہر وقت دست بستہ حاضر ہے۔ بہترین موسیقار اک پل میں حاضر دربار ہو سکتے ہیں۔ ریڈیو دنیا کے بہترین موسیقاروں۔ رقاصوں۔ ادیبوں اور شاعروں کو ہماری خدمت میں۔ دوزانہ پیش کرتا ہے۔ یہی نہیں۔ سینا کا پردہ جادو کا وہ قالین ہے جو ہمیں گھر بیٹھے ہر ملک کو سیر کرتا ہے۔ اس قدر آسائش اور مسترتوں پر ہیں تو کبھی پرانے وقتوں کو ترجیح نہیں دے گا۔ کیا پوچھنے سے کہہ دیتے ہیں کہ کیا گزرا زمانہ بڑا اچھا تھا۔ خاک اچھا تھا۔ نہ جینے کا شعور تھا۔ وقت بیکار صرف ہوتا تھا۔ اب بھی کسی کو اگر پرانے وقتوں سے عشق ہے تو اسے پاتے کہ وہ دیہات میں جا رہے۔ جہاں وقت صدیوں سے گاؤں کے گندے پانی کے جوہر کی طرح سرسبز رہا ہے اور دیہاتی اس گندی فضا میں کیڑوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ میں تو کاش اور ایک صدی بعد پیدا ہوا ہوتا۔ میں نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد ہم کشتی میں بیٹھ کر سیر دریا کو نکل گئے۔ واپس آئے تو کھانا تیار ہو چکا تھا۔ کھانے کے بعد تاشس کا کھیل شروع ہوا۔ کچھ دیر کھیلنے کے بعد گھاس پر لیٹ گئے۔ مائیکل اور رونی راز و نیاز کی گفتگو میں مصروف تھے۔ اصغر بیچہ ملول ہو گیا تھا۔ آہ بھر کر کہنے لگا۔ میری بھی کوئی زندگی ہے۔ شریک حیات سے تو زندگی بھر کے لئے نفرت ہو گئی ہے۔ میری بیوی میرے دل سے اتر چکی ہے۔ مگر طلاق کے بغیر نجات ناممکن نظر آرہی ہے۔ ہم سب ششدر رہ گئے۔ اتنی جلدی کیا شادی سے طبیعت سیر ہو گئی؟ انصر طلاق کے متعلق کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ چلو یہی موضوع رہی۔ مائیکل نے کہا۔

انصر: ہونا بہ طلاق کو رد نہیں رکھتے تھے۔ منٹا عیسائیت۔ وہ بھی اپنے اپنے دستور و شلو میں ترمیم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ طلاق کے متعلق قوانین وضع کرنے کی اہمیت سے انہا نہیں کیا جاسکتا۔ کس قدر مضحکہ خیز امر ہے کہ زبان سے جو ایک دفعہ گرہ دے دی جائے۔ دوبارہ

اسے دانتوں سے کھولا نہیں جاسکتا۔ شادی آخر کیا ہے۔ فقط ایک اقرار نامہ۔ ایک عورت اپنے شریک زندگی سے نفرت کرتی ہے اس کے ساتھ اس کو زندگی بسر کرنے پر مجبور کرنا کہاں کی دانائی ہے۔ ایک مرد جو اپنی بیوی سے نفرت کرتا ہے۔ اسے اس کے ساتھ نباہ کرنے پر مجبور کرنا سراسر حماقت ہے۔ جن مذاہب نے اب تک طلاق کے اصول کو تسلیم نہیں کیا۔ وہ فطرت سے بیکار جنگ کر رہے ہیں۔ ایک میاں بیوی کے باہمی تعلقات کو جو ایک دوسرے سے نفرت کتے ہیں۔ کس طرح سماج میں جاتر فراہم کر سکتی ہے۔ جبکہ ان کا ضمیر اور فطرت پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے پیدا نہیں ہوئے۔ بیوی خاوند سے نفرت کرتی ہے۔ مگر سماج اسے اس بندھن سے آزاد نہیں ہونے دیتا۔ کیا اس طرح مرد و زنانہ جو کرب و تکلیب نہیں ہوتا۔ جب مرد و عورت میں باہمی محبت اور رفاقت مسموٰۃ ہے تو شادی کا مقصد ہی فنا ہو جاتا ہے۔ شادی اسی رفاقت اور محبت کا عہد و پیمان ہے۔ ایک اقرار نامہ ہے جو دونوں کی رضا سے وجود میں آتا ہے۔ اگر ایک فریق اس اقرار نامے سے قطع نعلق کرنا چاہتا ہے تو یہ اس کا قدرتی حق ہے۔ کاروباری معاملات کا بھی یہی دستور ہے۔ جب کبھی عہد نامہ کی شرائط پر عمل درآمد نہیں ہوتا تو اس پر عمل نہ کرنے والے کو ہرجانہ دینا لازمی ہے جس کی ادائیگی کے بعد وہ آزاد ہو سکتا ہے۔ اسی طرح شادی کا عہد نامہ ہے۔ اگر مرد و عورت کو طلاق دے تو اسے ہر کی رقم ادا کرنی ضروری ہے اور اگر عورت طلاق چاہے تو اسے ہر کی ادھی رقم وصول کرنے کا کوئی حق نہیں رہتا۔

مس دینی تگر کیا یہ عورتوں کیساتھ زیادتی اور بے انصافی نہیں ہے کیا طلاق عورت کی جھک کے مترادف نہیں انصاف بالکل نہیں، بلکہ طلاق عورت کے حقوق کی محافظ ہے۔ اس کی آزادی کی علم بردار ہے۔ ایک عورت جب ایک ظالم، بدکار اور وحشی خاوند سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہے تو طلاق اس کو اس فیصلے نجات دلاتی ہے قانون طلاق دونوں کے لئے یکساں مفید ثابت ہوتا ہے جو مرد و عورت محبت غیر جنس کے بار سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں جو زندگی میں صحیح رفاقت کے طالب ہیں جو جیتے جا زندہ درگور ہونا نہیں چاہتے۔ ان کے لئے یہ قانون نعمت غیر مترقبہ ہے۔ آزادی کا یہ پودہ ہر مرد و عورت کو اپنے لئے نئے سرے سے رفیق صادق اور مخلص عاشق کے انتخاب کا موقعہ دیتا ہے

اسلام دنیا کا پہلا مذہب ہے جو اخلاقی رہنماؤں کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کروانا ہے جو عورت کی تعظیم اور آزادی کی دعوت دیتا ہے۔ اس کی مرضی کے خلاف اس کی زبردستی شادی نہیں کی جاسکتی اور مجبوری کی حالت میں وہ خاوند کو طلاق دے سکتی ہے۔

ماتیکل :- اس مجبوری کی وضاحت فرمائیے۔ طلاق کس حالت میں مجبوری کا درجہ اختیار کرتی ہے۔

انصرہ قرآن میں اللہ اس کے متعلق یوں فرماتا ہے۔ جو لوگ اپنی بیویوں سے علیحدگی کا مصمم

ارادہ کر لیتے ہیں۔ ان کے لئے چار مہینے انتظار کرنا ضروری ہے۔ اگر وہ اپنے ارادہ کو تبدیل کر دیں تو انہیں اپنی بیویوں کے پاس مراجعت کرنے کی اجازت ہے۔ اللہ بیشک مہربان ہے۔

اگر اس مدت کے گزرنے پر ان کے ارادہ میں کوئی تبدیلی نہ آئے اور طلاق کا تہیہ کر لیں تو اللہ ہی وہ قوت ہے جسے سب چیزوں کا فرمان ہے۔ اسی طرح عورت کے لئے بھی یہی قاعدہ مقرر ہے قرآن

کے احکام کے مطابق طلاق کا دستور یہ ہے کہ خاوند ہر ممکن طریقے سے مصالحت کی کوشش کرے تاکہ باہمی اتفاق و ارتباط ممکن ہو جائے جو نفاس وہ بیوی میں پاتا ہے یا جو عیوب اس کی بیوی برداشت نہیں کر

کر سکتی۔ ان کے دفعہ کا انتظام کیا جائے۔ اگر خدا کی جڑ اختلاف ملے ہے تو خاوند کو ایثار سے کام لیکر اپنے الفاظ واپس لینے چاہئیں تاکہ صلح ہو جائے اور گھر میں بدامنی کی بنیاد نہ رکھی جائے۔ اس طرح بیوی

کی خوشنودی حاصل کر کے ازدواجی زندگی کو پھر سے استوار کر لے۔ لیکن اس صورت میں کہ خاوند کی تمام غلصہ کو شناسی بیکار ثابت ہوں اور مصالحت غیر ممکن ہو جائے تو وہ کچھ عرصہ کے لئے بالکل علیحدگی

اعتیار کر لے۔ اس پر بھی اگر کوئی اُمید کی صورت نظر نہ آئے اور یقین ہو جائے کہ اس کی بیوی و خاوند اور اطاعت گزار ثابت نہ ہو سکے گی تو واضح الفاظ میں طلاق دے دے یعنی اس فقرے کا مفہوم یہ ہو

کہ میں طلاق دیدوں گا اور یہ کہ تیسری دفعہ طلاق کے الفاظ دہرانے پر پھر وہ کبھی اپنے الفاظ واپس نہیں لے گا۔ پہلی دفعہ طلاق دینے کے وقت یہ ضروری ہے کہ بیوی ماہواری آیام سے فارغ ہو۔ طلاق کا

امادہ ظاہر کرنے کے بعد یہ لازمی ہے کہ میاں بیوی ایک جہینے کے لئے قطعاً علیحدہ رہیں یعنی ان کے جسمانی تعلقات بالکل منقطع ہوں۔ اگر ایک جہینے کے اندر بیوی مصالحت پر آمادہ ہو جائے یا خاوند اپنے

الفاظ واپس لینا چاہے تو وہ بخوشی ایسا کر سکتا ہے۔ اللہ اس کی اجازت دیتا ہے۔ اگر اس جہینے کے

اختتام پر بھی طلاق کا ارادہ تبدیل نہ کیا جائے تو طلاق کے الفاظ واضح طور پر ادا کرنے لازمی ہیں۔ دوسرے
 ہیمنے کے اختتام تک بھی مصالحت کی اجازت ہے۔ اگر سمجھوتہ نہیں ہوتا تو خاوند دوبارہ کہے کہ میں تمہیں
 طلاق دیتا ہوں تبسرا ہیمنہ فیصلہ کن اور آخری ہیمنہ ہے۔ اس کے اختتام تک میاں بیوی ازدواجی زندگی
 از سر نو شروع کر سکتے ہیں۔ ان کو مذہب کی طرف سے کوئی گرفت نہیں مگر تیسری دفعہ طلاق کے الفاظ ادا
 کرنے پر طلاق مکمل ہو جاتی ہے اور الفاظ واپس نہیں لئے جاسکتے اور وہ قانونی طور پر علیحدہ ہو سکتے ہیں طلاق کے
 ارادہ کو طوری کرنے میں دونوں کی بھلائی ہے۔ وہ بھی طرح اپنے اقدام پر تنقید کر سکتے ہیں۔ ایک فائدہ یہ ہے کہ
 اگر عورت حاملہ ہوگی تو یہ آخری ہیمنہ نہیں رہ سکتا۔ یہ امر بھی مصالحت پر آمادہ کرنے کا زبردست باعث بن سکتا ہے
 اگر وہ حاملہ نہیں ہے تو اس کو اختیار ہے کہ جس مرد سے چاہے۔ شادی کر لے۔ خاوند کو اس کے راستے میں
 حائل ہونے کا کوئی حق نہیں ہے۔ وہ قانونی طور پر اس کو منع نہیں کر سکتا۔ بالعرض وہ حاملہ ہے اور چاہتی ہے
 کہ بچے کی پیدائش تک انتظار کرے تو خاوند کو قانوناً عورت کے اخراجات برداشت کرنے ہوں گے۔ بچہ کی
 پیدائش کے بعد دو سال تک عورت ضروریات زندگی کے لئے پریشان نہیں ہو سکتی۔ مرقانوناً ان اخراجات
 کا قبضل ہو گا۔ اگر عورت اپنی رضامندی سے یہ اخراجات نہ لینا چاہے یا شادی کر لے تو اور بات ہے۔
 کفالت کے دوران میں سابقہ شوہر کو عورت پر کوئی حق نہیں رہتا۔ اس کی حیثیت بالکل جہنی مرد کی سی
 ہے جس سے پردہ لازمی ہے۔ عورت کو ملنے یا اس سے گفتگو کرنے کا اسے کوئی قانونی حق نہیں رہتا۔ اخراجات
 کا قبضل ہونا اسے عورت پر کوئی حقوق نہیں دلاتا۔ اسی طرح اگر مرد عورت پر ظلم کرے اور اسے طلاق بھی نہ دے
 عورت سے نفرت بھی کرے مگر آزادی بھی دینا نہ چاہے تو عورت قانونی طور پر طلاق حاصل کر سکتی ہے۔ آپ
 نوگ خود ہی انصاف کریں کہ طلاق عورت کی بھلائی کے لئے ہے یا لفظ ان کیلئے؟ طلاق کے قوانین کے بغیر کوئی
 دستور شادی مکمل نہیں کہلایا جاسکتا۔ طلاق کے محاسن پر کچھ اور زیادہ کہنا بیکار رہے۔ کیونکہ یورپ اور امریکہ
 جو عیسائیت کا گھر ہے۔ وہاں مسلم نمائند سے کہیں زیادہ طلاق کا دواج ہے۔ اس کی وجہ طلاق کے خام
 قوانین ہیں۔ اسلامی طریقہ طلاق ممکن بھی ہے اور ناممکن بھی ہے۔ طلاق لینے یا دینے کی وہی سہی کرے گا
 جو قطعاً مجبور ہو جائے۔ مرد عورت جب تک اس طریقہ پر عمل پر نہیں ہوں گے۔ طلاق سے فیض یا ب
 نہیں ہو سکتے۔ سماج کو ایسا طریقہ اختیار کرنا ہی ہو گا۔ میں طلاق کے مسئلہ پر اس لئے زور دے رہا ہوں

تاکہ وہ اقوام جو شادی کی سرشتوں سے تو آگاہ ہیں مگر طلاق کے فائدے سے لاعلم ہیں۔ وہ اپنے قوانین شادی میں ترمیم کر سکیں۔ ہر مرد کا فرض ہے کہ وہ اپنے بدنصیب بھائیوں کو انکی فضول خرچی اور بیوفائیوں کے چھکے سے آزاد ہونے میں اعانت کرے۔ ہر عورت کا فرض ہے کہ وہ اپنی مظلوم بہنوں کو ظالم اور عیاش مردوں کے پیچھے سے نجات دلانے کی سعی کرے۔ مغربی عورتیں اس بات پر کمر بستہ ہیں کہ ان کو خاوندوں سے آزادی دلائیں۔ اُن مردوں سے جو کورٹ شپ کے ذریعہ میں اک اشارے پر جان دینے کو تیار تھے مگر شادی کے بعد محبت کے خطوط لکھنے والا عاشق عنقا ہو گیا۔ وہ ان محبت اور خوشامد بھرے الفاظ کو ترستی ہیں۔ جنہوں نے اُن کی آنکھوں میں چکاچند پیدا کر دی تھی۔ حکومت خاوندوں کو بیویوں کی پرورش کرنے پر مجبور کر سکتی ہے۔ اُن کی ضروریات زندگی دہیا کرنے میں اعانت کر سکتی ہے۔ مگر خاوند کی محبت کا نعم البدل وہ کہاں سے دستیاب کریں گی۔ وہ بدنصیب عورتیں کس کے پاس فریاد لے کر جائیں۔ جن کے مذہب میں شادی کی پابندی نہ ہے۔ مگر طلاق کی آزادی نہیں۔ ایسی عورتوں کے زخم سوائے طلاق کی مرہم کے مندمل نہیں ہو سکتے۔ اب بھی وقت ہے کہ سملج اکھیں کھولے اور طلاق کو مجبوری کی حالت میں جائز قرار دے۔ یونانی، رومی اور شامی مردوں کو تو طلاق دینے کا حق حاصل ہے۔ مگر عورتوں کو نہیں۔ اسلام پہلا مذہب ہے جس نے عورت کو طلاق کا حق دیا۔ عیسائیت نے بھی تسلیم کر لیا کہ طلاق عورت کی بے وفائی کی صورت کے علاوہ بھی اکثر اوقات لازمی ہو جاتی ہے۔ امریکہ طلاق کے معاملے میں باقی دنیا پر سبقت لے جا چکا ہے۔ یعنی امریکہ کے صرف بیاتہلے متخدہ میں جتنی طلاقیں سال بھر میں دی جاتی ہیں۔ اُن کی مجموعی تعداد باقی تمام دنیا سے زیادہ ہے۔ عذائیں دن رات اسی کام میں مصروف رہتی ہیں۔ یہاں تک ذہن پرستی پہنچ چکی ہے کہ تار برقی اور ٹیلیفون کے ذریعے طلاق دی جانے لگی ہے۔ ذرا سی رنجش پیدا ہونے پر میاں بیوی طلاق کی درخواست دے دیتے ہیں۔ بیوی اگر دوسرے مرد کو خاوند پر ترجیح دیتی ہے تو جھٹ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے۔ جھوٹی شہادت اور بیانات کے بعد طلاق حاصل ہو جاتی ہے۔ ایسے مضحکہ خیز واقعات سننے میں آتے ہیں کہ حیرانی ہوتی ہے۔ شادی کے بعد خاوند بنی مومن کے لئے

ایک جگہ تجویز کرتا ہے۔ بیوی اُس سے اتفاق نہیں کرتی۔ اسی وقت جھگڑا پیدا ہو جاتا ہے اور شکوہ کے کچھ منٹ بعد ہی طلاق کی درخواست جج کے سامنے پیش کر دی جاتی ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ شکاگو کے ایک جج کا قول ہے کہ طلاق کی ارزانی جذباتی شادی کا باعث ہے۔ طلاق ایک آسان طریقہ ہے جس سے میاں بیوی جب چاہیں علیحدہ ہو سکتے ہیں۔ اس طلاق کی آسانی نے اخلاق کو تباہ کر دیا ہے۔ ان شادیوں کو ہم جائز و مکاری سے موسوم کر سکتے ہیں۔ طلاق کے قوانین کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ طلاق کا حصول مشکل ہو۔ طلاق خاندانی زندگی کو برقرار رکھے نہ کہ اُسے برباد کرنے میں مدد دے۔ طلاق خواہ کتنی ہی خوبیوں کا حامل کیوں نہ ہو ہے ایک بدعت۔ ایک تلخ ٹھونٹ ہے جسے دوسمجھ کر پینا پڑتا ہے۔ اس کی حوصلہ افزائی کرنا ایک مذموم فعل ہے۔ رسول عربی کا قول ہے کہ اللہ کسی چیز سے اتنی نفرت نہیں کرتا جتنی کہ طلاق سے۔“

ماتیکل : امریکہ کے ایک منصف اعلیٰ کا قول ہے کہ ایسے حالات بھی پیدا ہوتے ہیں جس وقت طلاق ایک فرضیہ بن جاتی ہے۔ ایسے موقع پر طلاق نہ دنیا ایک گناہ کبیرہ ہے جس وقت ایک ظالم شوہر بلا کسی وجہ کے بیوی کو زد و کوب کرتا ہے۔ اس کو بچوں سمیت باہر نکال دیتا ہے ایسی حالت میں شوہر کو بیوی اور بچوں کی پرورش کے اخراجات کو برداشت کرنے پر مجبور کرنا ایک مستحسن فعل ہے۔ مگر اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا کہ طلاق کے پس پردہ روپے کا حصول بھی عورتوں کو طلاق کی درخواست کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ طلاق کو مشکل بنا دیں۔ اس قدر مشکل کہ طلاق کا تہیہ کرنے والے دود بارہ اور سہ بارہ طلاق کی درخواست کرنے سے پہلے کچھ غور بھی کریں۔“

انصر : یہ اسلامی اصول طلاق کی تائید نہیں تو ادا کیا ہے؟ اسلامی طریقہ طلاق کو مد نظر رکھتے اور پھر ان امریکی ججوں کے اقوال سے اُن کا موازنہ کیجئے۔ حقیقت عیاں ہو جائے گی۔“

مسس روبی : بیشک طریقہ مناسب تجویز کیا گیا ہے۔ اس وقت مغرب میں طلاق سروروی کا باعث بن چکی ہے۔ علماء اور حکما اس کا حل تلاش کر رہے ہیں مغربی اقوام سے ان لوگوں نے اپیل کی ہے کہ وہ اس مسئلہ پر بخیرگی سے غور کریں۔ اپنے لئے نہیں تو کم از کم اپنے بچوں کے مستقبل کا خیال کریں۔ شادی

ایک پاکیزہ انسانی رشتہ ہے۔ آئندہ نسلوں کی ہیودی آج کی شادیوں پر منحصر ہے۔ اس لئے طلاق کا تصفیہ کرنے سے پہلے اُس بچے کا خیال کریں جو اُن کے درمیان ایک پل کی طرح قائم ہے۔ عورت اپنے آپ سے یہ چند سوالات کرے۔ کیا وہ بچے کے حسین خیال کو برباد کرنے کا حق رکھتی ہے؟ تمہیں بیشک دھوکا ہو آرزوئی کے تلخ تجربہ نے تمہیں مایوس بنا دیا ہے لیکن تمہارا بچہ تو خوشی میں گزرا تمہیں تو اپنی نشوونما کے لئے موقع ملا۔ کیا تم اپنے بچے کو اس مسرت اور حق سے محروم رکھنا چاہتی ہو؟ کیا تم اُس کے باپ کو اُس کی نظروں میں ذلیل کرنا چاہتی ہو؟ زندگی کے متعلق بچے کو مکروہ نظریات قائم کرنے میں اسکا معاون بننا پسند کرتی ہو؟ اپنی زندگی پر نظر ڈالو تمہاری زندگی کیا ہوتی۔ اگر تمہیں محبت بھرے والدین نصیب نہ ہوتے؟ تم اپنے شوہر پر یہ الزام عائد کرتی ہو کہ وہ خود غرض ہے۔ وہ تمہارا خیال نہیں رکھتا۔ مگر کیا تم بھی اس خود غرضی کی خاطر اپنے بچے کی زندگی نباہ کرنے پر نہیں تلی ہوئی ہو؟ کیا بچے کی پیدائش کی تم ذمہ دار نہیں ہو؟

اصغرؒ جب ان ممالک کا یہ حال ہے جو اُزادی کے علمبردار ہیں۔ جہاں طلاق امرِ محلیٰ۔ جہاں شادی سے پہلے مرد و عورت ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں تو وہاں کس لئے یہ شادیوں کا مایاب رہتی ہیں؟ طلاقوں کی اتنی بھرمار کیوں ہے؟

ماتیکل۔ اس کی سب سے بڑی وجہ عشق و محبت اور شادی کے غلط نظریات کا قیام ہے۔ عشق و محبت کے دور سے گزرنا بیشک ایک حسین تجربہ ہے۔ اگر خوش قسمتی سے دو طرفہ محبت قائم ہو جائے مگر یہ فرض کر لینا کہ عشق و محبت کی شدت شادی کے بعد بھی قائم رہے گی۔ اپنے آپ کو زبردست فریب دینا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ کسی چیز کا تعاقب اُسی وقت تک کیا جاتا ہے جب تک اُس کا حصول ناممکن ہو۔ جب تمہاری محبوبہ تمہارے قبضہ میں آجائے تو خواہش حصول کی موت لازمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جذبات تلخ بستہ ہو جاتے ہیں مرد و عورت کے جنسی تعلقات کا بھی یہی اصول ہے۔ عشق کی شدت میں کمی آنا فطری امر ہے۔ محبت، رفاقت، بچوں سے شفقت۔ رشتہ داروں اور ہمالیوں سے اُنس سب مل کر عشق کی جگہ لے لیتے ہیں۔

مس روہیؒ اسی لئے مرد کو یہ کبھی نہیں بھولنا چاہئے کہ اس کی بیوی اُس کی محبوبہ رہ

پہلے ہے۔ وہ ایک لڑکی تھی جس کے عشق میں وہ سب کچھ قربان کرنے پر تیار ہوا تھا اور اب اس سے سخت کلامی سے پیش آتا ہے۔ بچے کی رونڈھی آواز سن کر برم ہو جانا ہے جو اب ادھر ادھر ہو جلتے پڑ پڑا اٹھتا ہے ہمیشہ اپنی بیوی کو اپنا ساتھی تصور کرو۔ اسے بہترین دوست بنانے کی کوشش کرو۔ وہ تمہارے گھر کی منتظر ہے۔ تمہارے بچوں کی ماں ہے عشق اپنا کام کر چکا۔ اس نے تمہیں کبھا کر دیا۔ ایک دوسرے سے ہمکنار کر دیا۔ اس نے یہ مفروضہ داغ سے نکال دیا کہ عشق کی شدت وہی ہی رہتی چاہئے عورت محبوبہ ہی بنی ہے ہمیشہ محبت کی باتیں ہی کرتی رہے۔ یہ سب کورٹ شپ کے زمانے کی مستر تیں ہیں۔ جب شادی ہو جاتی ہے تو اس کا مطلب ایک خاندان کی بنیاد ہے۔ بچوں کی پرورش اور خاندانی زندگی میں عشق کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر تمام عمر عشق سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہو تو ایسی عورت سے عشق کرو جس کا حصول ناممکن ہو۔ یہ فطری اقتضا ہے وصل عشق کی موت ہے۔“

مائیکل۔ آپ کے خیالات مجھ سے کس قدر متفق ہیں۔ عورت کو بھی شادی کے بعد عشق کی تمنا نہیں رکھنی چاہئے۔ مرد و عورت کو کتنا چاہتا ہے۔ اس کا ثبوت عملی طور پر شادی کرنے کے بعد وہ بہم پہنچاتا ہے۔ اس سے بہترین ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد پھر اس سے توقع رکھنا کہ شادی سے پہلے کا عشق جاری رکھے۔ اس کا تعاقب کرے محبت بھرے الفاظ سے اس کی خوشامد کرے۔ اسے بھول بطور تحفہ بھیجے اسکو اپنا۔ سراسر حماقت ہے۔“

• بیشک۔ میں نے کہا۔ ”مرد کو بے شمار کام ہوتے ہیں۔ کاروباری تفکرات، خاندان کی پرورش کی نگرانی، دو بیویاں اسے عشق و محبت فراموش کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں جس وقت وہ گھر لوٹتا ہے تو بیوی سے ہمدردی اور خوش اطواری کا منتفع ہوتا ہے۔ وہ مجھ کے الفاظ سننا چاہتا ہے تاکہ اس کی ساری کوتاہی دُور ہو جائے۔ مگر اکثر بیویاں بیچارے مجھ ایسے خاوندوں کی۔ بچوں کی لڑائی۔ ساس ہند سے تکرار، ہمسیاؤں سے جھگڑا۔ رشتہ داروں سے چونچیں اور نوکر دوں کی شکایات سے تواضع کرتی ہیں جو ان کی کاروباری مشکلات کے سامنے ذہن ہمارے ہی وقت نہیں رکھتیں۔ بیوی ایک تھکے ماندے خاوند سے ایسی باتیں سننے کی کس طرح توقع کر سکتی ہے وہ لذیذ کھانے چاہتا ہے مگر وہ شکایتوں سے پرہیز کرنا چاہتی ہے۔ بعض عورتیں تو اپنے جلے ہوئے کپڑوں اور پٹھے ہوئے دودھ کا ذکر چھیڑ دیتی ہیں۔ اگر ان کے

اس سلسلے میں ہمدردی کی ضرورت تھی۔ تو بہتر تھا کہ کسی خاندان یا ہوسٹل کے منیجر سے شادی کر لی جوتی کیا بیان کر دوں۔ مخالف طبائع کی مالک بیوی سے نباہ کرنا مشکل ترین کام ہے۔ میں تو اسے جہاد کا جڑ دیتا ہوں۔ جان دینا آسان ہے مگر کھل کھل کر مرنے کا ہمت دینا ہے۔

مائیکل: بیشک مرو کو بیوی سے عشق کی توقع نہیں رکھنی چاہئے مگر اتنا بھی نہ ہو کہ بیوی ان جذبات سے قطعاً عاری ہو جائے۔ مرد آخر مرد ہے۔ اس کی جنسی بھوک بدستور کسی قدر کم شدت سے قائم رہتی ہے اگر وہ ناجائز تعلقات کو گناہ گوارا سمجھتا ہے اور اس لئے اپنی بیوی سے ہی عشق بھرنا چاہتا ہے تو بیوی کو اس پہلو پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔ مرد کبھی پسند نہیں کرتا کہ اس کی بیوی جی بھورت اور دلکش نہ ہو۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ عورت ہر وقت بناؤ سنگا رہیں ہی مصروف ہے۔ دونوں پہلوؤں میں توازن قائم رکھنا ہی عقلیت کی دلیل ہے۔ تعلیم کا فائدہ جمعی ہے جب عورت مرد کی نفسیات سے آگاہ ہو کہ مرد کی مسرت کو مطمئن رکھے۔

مس روبی: مجھے آپ کے اتفاق ہے۔ بیوی کو نہ فضول خرچ ہونا چاہئے اور نہ اتنا کجخوس کہ روپیہ جمع کرنے کی فکریں اچھے بلوسات کو ترک کر دے۔ آرائش و زیبائش کا خیال نہ کرے۔ اپنے آپ کو غیر دلکش اور بڑھی تصور کرے۔ عشق و محبت کا شادی کے بعد خاتمہ کر دے۔ حقیقت ہے کہ مرد اپنی بیوی کو ہمیشہ آسان اور دلکش دیکھنا چاہتا ہے۔ مرد کا جمالیاتی ذوق کبھی مردہ نہیں ہو سکتا۔

دلکاش میری بیوی حقیقت ذہن نشین کر سکے۔ میں نے کہا۔

اصغر: جو بیوی خاندان کی بجائے والدین کی اطاعت کرے۔ اس کے متعلق کیا ارشاد ہے؟

مس روبی: بیوی کو کبھی رشتہ داروں اور بھائیوں کی باتوں پر نہیں جانا چاہئے۔ ان کو خوش کرنے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ ان کو اپنے ذاتی معاملات میں کبھی دخل انداز ہونے کا موقع نہیں دینا چاہئے۔ شوہر سے زیادہ کسی کو بیوی سے ہمدردی نہیں ہوتی۔ بیوی کو یہی کوشش کرنی چاہئے کہ وہ اپنے معاملات آپ سمجھائے۔ زندگی اس نے بسر کرنی ہے۔ اس کے والدین اور رشتہ داراں نے نہیں۔ ہر مرد میں چند انوکھی باتیں ہوتی ہیں۔ دو طبیعتیں بالکل یکساں نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے زندگی کے ایسے اہم مسئلہ پر وقت صرف کرنا ضروری ہے۔ ایک دوسرے کی نفسیات کا مطالعہ

نہایت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔“

نامشکل :- بات تو سیدھی ہے۔ ہر مرد و عورت کی زندگی کا طرز عمل ان کی خواہشات پر منحصر ہے۔ دونوں اگر باہمی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو ایک دوسرے کی خواہشات کی تکمیل میں اعانت کرنا ہی باہمی محبت کو استوار کر سکتا ہے۔ دونوں فریقین کو کچھ نہ کچھ ایثار کرنا ہی ہو گا۔ تالی ہمیشہ دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ اگر میاں بیوی اپنی اپنی حدود پر قائم رہیں تو مصالحت ناممکن ہے۔ ایسے مرد و عورت جو بٹ بٹ کر واقع ہو گئے ہیں۔ وہ کسی سے بھی نباہ نہیں کر سکتے۔ ان کے لئے ایک کو طلاق دے کر دوسرے سے نباہ کی امید رکھنا خود فحشی کے مترادف ہے۔ طبیعتوں کی مکمل ہم آہنگی ناممکن ہے۔ اس کے علاوہ کوئی مرد بھی بیوی کا غلام بن کر رہنا پسند نہیں کرتا۔ خواہ اس کی بیوی حکمہ ہی کیوں نہ ہو۔ مرد و عورت کو دل کی حکمہ بننا تاہم گمراہ خود بادشاہ بننا پسند کرتا ہے۔ مرد بیوی کے رونے اور ٹھوٹے بہانے کو پسند نہیں کرتا۔ کیونکہ مرد خود بہت کم آنسو بہاتا ہے۔ کوئی شوہر یہ پسند نہیں کرتا کہ صبح کا ناشتہ پھکیوں پر مشتمل ہو۔ اس کی اجبا دینی یا مطالعہ بیوی کے آنسوؤں سے تر ہو۔ اگر خاوند کو مایوسی کا سامنا ہوتا ہے۔ وہ دل برداشتہ ہو کر گھر لوٹتا ہے تو اس کے زخموں پر ادھار دیا نہ چھڑکا جائے۔ اس کے دل کو ڈھار دی جائے۔ یہ نہ ہو کہ آنسو بہانے شروع کر دے جائیں اور چرخ پکار شروع کر دی جائے۔ رفا کا ثبوت دینے کا یہی موقع ہے۔ عورت کی یہی غفلت مرد کی نفرت کا باعث بنتی ہے۔“

نامشکل آپ کو ان مشکلات کا سامنا کرنا نہیں پڑے گا جن سے ہم دوچار ہیں۔ اکثر مردوں کو یہ شکایت ہوتی ہے کہ بیویاں ان کے خطوط پڑھ لیتی ہیں۔ شرعی عورتیں ابھی بہت جہالت میں مبتلا ہیں۔ مردوں کی خواہشات کا انہیں کوئی پاس نہیں۔“

مس۔ روبی :- بیشک بیوی کو کوئی حق نہیں کہ خاوند کے خطوط پڑھے۔ البتہ وہ خوشی سے اس کو اس کی اجازت بھی دے سکتا ہے۔ بیوی صحیح رفیق زندگی تو جیسی کہلا سکتی ہے۔ جب وہ زندگی کو کامیاب بنانے میں مرد کی اعانت کرے۔ عورت کی زندگی کا کامیابی کا راز بہترین بیوی اور ماں بننے پر ہی موقوف ہے۔ مرد کو ازدواجی زندگی کے علاوہ اپنے نسب اعیان کے حصول کیلئے جدوجہد کرنا بھی لازمی ہے۔ اس کی کامیابی کا انحصار بیوی پر ہے۔ مشاہیر عالم کی زندگی کا مطالعہ

ثابت کرتا ہے کہ ان کی کامیابی میں عورت کا کتنا ہاتھ ہے۔ اگر بیوی ہی اپنے شوہر کا ساتھ نہ دے تو اور کون دے گا۔ وہ ہمدردی اور حوصلہ افزائی کہاں سے پائے گا۔ بے غرض ہمدردی اور اعانت صرف دوستوں کی ذات سے ممکن ہے اور بیوی جب تک دوست نہ بنے۔ اس کا وجود بیکار ہے وہ مرد ایک بوجھ ہے جسے مرد برداشت کرنے پر مجبور رہتا ہے۔“

انصرؓ اپنے بیوی کا صحیح مفہوم بیان کیا ہے درمسل عربی پر بھی جب سب سے پہلے وحی نازل ہوئی تھی۔ آپ پر ایک عجب کیفیت طاری تھی۔ کس قدر اہم فریضہ آپ کو سونپا جا رہا تھا۔ دنیا کے مستحق اور مخالفت کا مقابلہ درپیش تھا۔ آپ نے سب سے پہلے اپنی بیوی خدیجہ کو اس حقیقت سے آگاہ کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ بیشک آپ نبی برحق ہیں۔ وہ ایمان لے آئیں۔ اپنے شوہر کی ڈھارس بندھوائی۔ پھر آپ نے اپنے جگری دوست حضرت ابوبکرؓ پر اس حقیقت کا انکشاف کیا۔ انہوں نے آمنا و صدقہ کہا۔ اس کے بعد رسولِ عربی باطل کے مقابلہ میں خیمہ شونک کھڑا کر آئے۔ اس کا نتیجہ آج دنیا پر روشن ہے۔“

”کاش ہماری بیویاں بھی ایسی ہی ہوں۔“ ہیں اور انصرؓ ایک ساتھ گویا ہوئے۔
 مائیکل : بیشک بیوی اور دوست اگر کسی مرد کی تکمیل خودی میں معاون ثابت نہیں ہو تو وہ فینِ حیات اور رفیقِ صادق کہلانے کے برگزینہ تھی نہیں۔“

پانچواں باب

عورت اور شراب

شام کے خطوط باقاعدہ موصول ہوتے رہتے تھے۔ اس کا کاروبار ترقی پر تھا۔ روپے کی فراوانی نے ایک چھوڑ گئی دینیائیں اُس کے قدموں پر ڈال دی تھیں۔ عورت اور شراب اس کی ولداری کے لئے اک اشارے کی منتظر رہتی تھیں۔ کلکتہ جیسے شہر میں ان دونوں چیزوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ بنگال میں بھوک سے مرنے والے ایسے انسان تھے جو ذہنی طور پر غلام تھے۔ ذہنی غلامی نے انہیں بزدل بنا دیا تھا۔ ورنہ مرنا کیا نہیں کرتا۔ کھانے پینے کی چیزوں کے انبار سامنے ہوں اور وہ اسے چھین نہ سکیں۔ وہ جیل آسانی سے بنا سکتے تھے۔ وہاں انہیں پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے عام ضروریات زندگی تو بیسرا سکتی تھیں۔ رہنے کے لئے کوٹھڑی۔ پہننے کے لئے کپڑے۔ کھانے کو روٹی اور مہینوں کی صحبت۔ رستوران میں احباب جمع تھے۔ شام کا خط سننے کے بعد انصریوں کو کیا ہوا۔ انصری مائیکل شراب کے متعلق سائنس کا کیا نظریہ ہے اور شراب کا عورت سے کیا تعلق ہے؟

مائیکل شراب کی کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً انگوری شراب۔ وکی۔ برانڈی۔ روم۔ جن۔ کلیئرٹ۔ میشری۔ بیریاٹوڈی۔ شراب کی یہ تمام اقسام الکوحل کے تناسب کے مطابق نام پائی گئی ہیں فرق صرف الکوحل کی مقدار میں ہے۔ ایک سو اونس بیریں پانچ فیصدی الکوحل ہے تو

دسکی میں پچاس سے لیکر ستر فیصد می تک الکوحل ہوتی ہے۔ مقوڑی سی مقدار پینے کے بعد خون کا دورہ تیز ہو جاتا ہے۔ ذہن میں حسی اور خیالات میں روانی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی پینے سے قبل غموں میں ہو تو وہ کیف اور سرور سامعوس کرتا ہے۔ طبیعت بکاش ہو جاتی ہے مگر رنج کی حالت میں شراب اور بھی رنجیدہ کر دیتی ہے۔ اس کا باعث خون کے دورہ کی تیزی ہے۔ ذہن اس تیزی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جوں جوں الکوحل کی مقدار زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ اتنی ہی تیزی بڑھتی جاتی ہے۔ ذہن زیادہ غور و فکر نہیں کر سکتا۔ اسلئے الفاظ اور خیالات میں کوئی ربط نہیں ہوتا۔ جومنیں آگیا نکل گیا۔ ایک عام مہذب انسان الکوحل کے زیر اثر ایسی حرکات کا مرتکب ہوتا ہے۔ جو اسے بوقوف ٹھہراتی ہیں۔ خاموشی اور کم گفتگو کرنے والا بھی باتونی بن جاتا ہے۔ نشہ کی حالت میں کسی چیز کی پروا نہیں رہتی۔ ہاتھ یا حکام اس کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ وہ بڑے سے بڑے رتبہ والے سے مخاطب ہو سکتا ہے۔ وہ چٹانوں سے ٹکرا سکتا ہے۔ اپنے سے طاقتور کے ساتھ لڑ سکتا ہے۔ دلیر اور شجاع بن جاتا ہے۔ الکوحل کا نشہ بزدل نہیں بناتا۔ شرابی راست گو۔ صاف دل اور دلیر ہوتا ہے۔ جب تک نشہ استوار ہے۔ وہ تمام دنیا کا بادشاہ ہے۔ غم و الم بے معنی ہیں۔ جذبات حکمرانی کرتے ہیں۔ عقل مختیار چھینک دیتی ہے۔ جہاں تک ان خوبیوں کا تعلق ہے شراب کا مقابلہ اور کوئی نشہ آور چیز نہیں کر سکتی۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ شراب بھی صفات کی حامل ہے۔ مثل شہور ہے کہ انسان دو حالتوں میں جھوٹ بولنا کبھی گوارا نہیں کرتا ایک مرتے وقت اور دوسرے مذہوشی کی حالت میں۔ شراب مہروں کے سینے سے راز برآمد کرنے کی عرض سے اکثر کام میں لائی جاتی ہے۔ مغرب میں سیاسی اور کاروباری ممالک شراب کی موجودگی میں کئے جاتے ہیں۔ ایسے اشخاص بھی ہوتے ہیں جو نشہ کی حالت میں بھی اپنے حواس پر قابو رکھنا جانتے ہیں۔ اور کسی ایسی حرکت کے مرتکب نہیں ہوتے جو اپنی ذات کو یا کسی دوسرے کی ذات کو مضرت رساں ہو۔ یہ نشہ کی پہلی منزل کہلاتی ہے۔ اس منزل کا یہ روشن پہلو میں نے بیان کیا ہے۔ اب تاریک پہلو کو لیجئے۔ نشہ کی پہلی منزل سے

یک ذی ہوش انسان لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ جو اپنے آپ پر عبور رکھتا ہے۔ وہ سرت کے تلخ گھونٹ پیتا ہے۔ وہ خرد کی بدولت پھول چن لیتا ہے اور خس و خاشاک چنیک دیتا ہے۔ مگر جذبات کی زد میں بہہ جانے والا انسان عقل سے بالکل عاری ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ بے پروا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ ایسے افعال مثلاً لڑنے جھگڑنے اور گالی طوط کو ایک معمولی بات گردانتا ہے۔ اس کے علاوہ نوشی کی حالت میں اور زیادہ سرت کا ملاپ ہو جاتا ہے۔ عورت کے بغیر ہر ایک انجمن بے کیف ہوتی ہے۔ اس لئے وہ عورت کی عدم موجودگی کو ضرور محسوس کرتا ہے۔ اس وقت جو عورت بھی دستیاب ہو سکے وہ اس کے لئے کم و بیش سرت میں اضافہ کی باعث ہو سکتی ہے۔ اگر آزادانہ میل ملاپ کے حامی افراد ایک جگہ جمع ہوں تو قدرتی طور پر مرد و عورت رومان کی ترغیب پاتے ہیں اور اس طرح شہ کی حالت میں گناہ کا ارتکاب کوئی بڑی بات نہیں لگتا اور شراب لازم و ملزوم ہیں تفریحی ناچ کے موقع پر شراب لازمی طور پر استعمال میں آتی ہے۔ کیونکہ اس کی اعانت کے بغیر انسان اپنی فطری حیا اور شرم سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔ کیف و سرور کے زیر اثر وہ کسی اجنبی مرد و عورت سے گفتگو کر سکتا ہے۔ اُس کے ساتھ ناچ سکتا ہے اور ان سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ شراب جائز ہے کہ ناجائز؟ طبی سائنس کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ معوی مقدار میں الکوحل سودمند ثابت ہو سکتی ہے جسم کو حرارت پہنچانے میں فوری دوا کا کام دیتی ہے۔ ماضیہ کو تیز کرتی ہے۔ مگر کثرت استعمال نقصان دہ ہے۔ شراب اعلیٰ قسم کی ہی مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ گھٹیا شراب پینے سے زہر ہلکا زیادہ بہتر ہے۔ اگر کوئی شخص پہلی منزل تک ہی محدود رہنے دے تو وہ عقل مند کی کاثبت دیتا ہے۔ اگر وہ حد سے تجاوز کر لے تو اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے۔

انصر۔ وہ کیونکر؟ اس حد کی پہچان کیا ہے۔ کیا شراب کی کوئی خاص مقدار مقرر کی جا سکتی ہے؟ مائیکل۔ شراب کی مقدار ہر فرد کے لئے یکساں نہیں ہو سکتی۔ مگر مشاہدہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک عام انسان کے لئے کتنی مقدار، اُسے پہلی منزل تک پہنچانے میں کامیاب ہو

سکتی ہے پہلی منزل میں کیف و سرور ہوتا ہے۔ مگر نشہ بے قابو نہیں ہوتا۔ ہوش اور مدہوشی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ٹٹکتے ہیں۔ مدہوشی کج روی اختیار کرنا چاہتی ہے تو ہوش ہاتھ کے جھٹکے سے اسے منع کر دیتا ہے۔

انصر۔ ”مگر جب ہوش بھی مدہوشی کا ساتھ دے تو پھر کیا ہوتا ہے۔“
 مائیکل۔ ”ہر شرابی اپنی حد کو پہچانتا ہے۔ باقی یہ اس کے اختیار میں ہے کہ وہ حد سے تجاوز کر لے یا نہ کرے۔ اگر کوئی تنہائی میں شراب پیتا ہے۔ تو اس کے فعل سے صرف اس کی اپنی ذات کو جسمانی ایذا پہنچنے کا احتمال ہے۔ مگر سماج میں اس کے بے قابو ہونے سے دوسروں کو نقصان پہنچنے کا امکان بھی موجود ہوتا ہے۔ کسی دوست یا اجنبی کی بے عزتی کر سکتا ہے۔ کسی عورت کو گناہ پر آمادہ کر سکتا ہے۔ اپنی محبوبہ کی عصمت پر حملہ کر سکتا ہے۔ اگر وہ کنواری ہو۔ یا کسی دوسرے شخص کی بیوی کو ورغلائے کا اقدام کر سکتا ہے۔ شراب کی یہ خوبی بالکل بجلی کی قوت سے مشابہ ہے۔ اگر شراب سے بے پروائی کیف و سرور۔ دلیری اور شجاعت کے جذبات پر انسان قابو رکھ سکتا ہے۔ تو وہ اپنی مسرت میں کمی گنا اضافہ کر سکتا ہے۔ اس سے مستفیض ہو سکتا ہے۔ بجلی کی طرح اس قوت سے بڑے کام لے سکتا ہے۔ مگر قوت بے قابو ہو جائے تو اپنا ہی نقصان ہے۔ جو لوگ اپنے جذبات پر قدرت نہیں رکھتے ان کے حق میں یہ بے پروائی ایسی ہی ہے۔ جیسے کسی نادان کے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول۔ جو خود بھی ہلاک ہو جاتا ہے۔ دوسروں کو بھی ہلاک کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان دونوں حالتوں میں یعنی انفرادی اور سماجی زندگی میں وہ زندگی کے قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ اگر وہ اس قانون پر عمل پیرا ہے تو اخلاقی طور پر شراب اس کے لئے جائز ہے ورنہ ناجائز۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ جسمانی اعتبار سے جب وہ نشے کی دوسری منزل میں قدم رکھتا ہے تو دوران خون بے حد شدت اختیار کر لیتا ہے۔ چہرہ سرخ ہو جاتا ہے۔ آنکھوں کے ڈورے گلابی ہو جاتے ہیں۔ سر میں ایک بھاری پن محسوس ہونے لگتا ہے۔ خون کی تیزی کی وجہ سے کنپٹیوں

پر زور پڑتا ہے۔ اعضائے جسمانی کو غیر معمولی فعل سرانجام دینا پڑتا ہے۔ فطرت اپنا انتقام لینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ وہ زیادتی کو کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔ شہابی کو حد سے بڑھنے کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ مسرت کی قیمت ادا کرنا لازمی امر ہے۔ وہ شرابی اس طرح ادا کرتا ہے خاموش ہو جاتا ہے۔ اس کا دل آرام کا خواباں تو ہے بنیاد اس پر غلبہ پالتی ہے اعضائے جسمانی اس کا تھپیڑ سے نکار کر دیتے ہیں۔ قدرتی سائنس کا اصول ہے کہ ہر عمل کا رد عمل ضرور ہوتا ہے۔ گیند کو جتنی زور سے زمین پر مارو گے اتنی ہی شدت سے وہ اوپر ابھرے گی۔ اسی طرح شراب کا رد عمل ہے۔ شرابی نے وہ لطف اٹھایا۔ جو عام حالت میں ممکن نہیں تھا۔ اس لئے رد عمل سے بھی دوچار ہونا ضروری ہے۔ نشہ جب اترتا ہے اس وقت مسرت کی قیمت ادا کی جاتی ہے۔ سر میں شدت کا درد پیٹ میں جلن۔ حلق میں پیاس کے کانٹے اور اکثر اوقات قے اگر نشہ کی حالت میں زیادہ پیٹ بھر لیا گیا ہو۔ یہ ہے مسرت کی قیمت۔ قے کر لینے سے کچھ افاقہ ضرور ہوتا ہے مگر غور طلب امر ہے کہ ایسے ایسے لذیذ کھانوں کا یہ حشر کتنا اندوہناک ہے جو شرابی نشہ کی حالت میں کھاتا چلا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر سستی کا عمل تیز ہوتا ہے اس لئے عام حالت سے ایک عام انسان کئی گنا کھا جاتا ہے۔ مگر پیٹ میں گنجائش تو اتنی ہی ہوتی ہے۔ شراب معدہ کے فعل کو ناکارہ کر دیتی ہے۔ اس لئے رد عمل کے وقت معدہ بھی اسطو عمل اختیار کرتا ہے۔ کم از کم بارہ گھنٹے یہ رد عمل جاری رہتا ہے۔ سر کا درد۔ پیاس اور بے چینی سارا مزاکرہ کر دیتی ہے۔ سر درد اور قے تو فوری جبرانہ کی صورت میں ادا کرنا پڑتے ہیں۔ قدرت جسمانی انتقام تو فوراً لیتی ہے۔ وہ کبھی معاف نہیں کرتی۔ اخلاقی طرز عمل کی وہ ذمہ دار نہیں ہے۔ جو قانون قدرت کی خلاف ورزی کرتا ہے سزا پاتا ہے۔ اخلاقی طور پر سزا اس کو سماج دے سکتا ہے۔ انفرادی زندگی میں اس کو سزا خود بخود جسمانی طور پر مل جاتی ہے۔ مگر سماجی زندگی میں اخلاقی قانون کی خلاف ورزی کی سزا سماج ہی دے سکتا ہے۔ یہ تو فوری سزا کی صورت ہے۔ اس کے علاوہ اعضائے جسمانی

کو کیا کیا نقصان پہنچتا ہے۔ اس کا فیصلہ دت کرتا ہے یہ ہیں وہ حقائق جن سے کوئی شرابی انکار نہیں کر سکتا ہے۔ اگر کسی نے خود تجربہ نہیں کیا تو کر کے دیکھ سکتا ہے۔ یا کسی شرابی سے دریافت کر سکتا ہے۔“

انصر: آپ نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کی روشنی میں پھر کیا نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے؟ شراب استعمال کرنی چاہیئے کہ نہیں؟“

ماٹیکل: کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے دونوں پہلوؤں کو ایک تہذیب میں تو نا ضروری ہوگا۔

ایک پلٹے میں خوبیاں ڈالو اور دوسرے میں عیوب۔ شراب کی خوبی پر نظر ڈالیں۔

(۱) تھوڑی مقدار میں شراب دوران خون کو تیز کرنے میں فوری مدد دے سکتی ہے جسم کو فوری حرارت پہنچا سکتی ہے۔ یعنی طبی ضروریات کے لحاظ سے دوا کا کام دے سکتی ہے

(۲) وکی۔ برانڈی جن۔ بیرو وغیرہ کی مناسب مقدار کیف و سرور۔ مسرتی اور مسرت

کا باعث بن سکتی ہے۔ مسرت کو دوبالا کر سکتی ہے۔ غم غلط کرنے میں معاون ہو سکتی

ہے بشرطیکہ پیئے والا اس پر آمادہ ہو۔ ورنہ رنج میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ

نشہ کی حالت میں جذبات مشتعل ہوتے ہیں۔ اور اک سست ہوتا ہے۔ میرا تو یہی تجربہ

اور مشاہدہ ہے۔ غم غلط کرنے کا شراب دعویٰ نہیں کر سکتی غم غلط اسی صہمت میں ہو سکتا

ہے کہ حد سے زیادہ پی لی جائے۔ یہ ہوشی کی حد تک۔ اس کے بعد نیند غلبہ پائے اور

اور انسان سو جائے۔ مگر ہوش آنے پر رنج پھر عود کرتا ہے۔ اس لئے شراب بھی

اسی صورت میں اعانت کر سکتی ہے جب خود شرابی اپنے آپ سے یہ کہے کہ گزے

ہوئے واقعات پر افسوس بیکار ہے۔ ماضی کسی کا نہیں۔ حال اپنا ہے اور مستقبل حال

پر منحصر ہے۔ مسرت امید کے دامن کے ساتھ وابستہ ہے۔ امید ہمیشہ بشارت رہتی ہے

یاس مسرت کے حق میں زہر قاتل ہے۔ یاس کا علاج شراب کے پاس بھی نہیں۔ اسکی

دوا صرف محبت ہے۔ کسی محبوبہ کی محبت جس کے سامنے دنیا کی تمام بہترین شرا ہیں

بیچ ہیں جس کے نشہ کا کوئی رد عمل نہیں۔ شرابی کی تباہ شدہ زندگی کو اگر نئی زندگی کوئی

چیز بخش سکتی ہے تو وہ عورت ہے۔ عورت کی محبت کا نشہ شراب سے کہیں بڑھ کر ہے (۲) طبیعت جب بالیدگی پاتی ہے۔ ذہن تفکرات سے نجات پاتا ہے تو انسان مسرت محسوس کرتا ہے۔ یہی احساس کیف و سرور کا باعث ہیں۔ اس صورت میں شراب کی یہ خوبی انسان کو دلیر اور شجاع بنا دیتی ہے۔ وہ کسی سے خوف نہیں کھاتا۔ وہ بادشاہوں اور چٹانوں سے ٹکرا سکتا ہے۔ جسمانی تکلیف محسوس نہیں کرتا۔ جھوٹ سے نفرت کرتا ہے وہ آزادانہ گفتگو کر سکتا ہے۔ وہ سچ بولنے کی جرأت رکھتا ہے۔ وہ شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ اس لئے دعوتوں اور تفریحی ناچ کے دوران میں شراب کا استعمال لازمی جزو ہو جاتا ہے۔ اس کے بغیر ناچ اور گفتگو سے حظ کم اٹھایا جاتا ہے۔

(۴) ان کے علاوہ ایک خوبی اور بھی ہے یعنی باقی نشہ آور اشیا کی طرح شراب بھی اساک میں اضافہ کرتی ہے۔ اس لئے عیاشی کا بہترین نسخہ ہے۔ مسرت کو کئی گنا زیادہ کرنے میں زبردست معاون ثابت ہوتی ہے۔ یہ تو تھیں اس کی خوبیاں اب عیوب کی کو دوسرے پلڑے میں ڈالئے۔ (۱) شراب کا رنگ تو جاذبِ نظر ہے مگر ذائقہ اچھا نہیں۔ دسکی براڈی۔ رم کی قسم کی شراب تو تلخ ہوتی ہے۔ مگر اس تلخی سے مزہ آتا ہے کباب کی لذت اس تلخی کے باعث دو بالا ہو جاتی ہے۔ اس لئے شراب اور کباب مشرق میں لازم و ملزوم چیزیں ہیں۔ یہ عیب بھی ہے اور خوبی بھی۔ اس لئے اُدھی دھی دونوں پڑیں تو یہ کیجا کجی تیں اچھا تو اب لیجئے اس کی بو۔ یہ بھی ناگوار ہوتی ہے۔ البتہ چین اور بیر کی بو قدرے بہتر ہے۔ اس کو بھی عیب کے پلڑے میں ڈالو۔ اس کے علاوہ خلق سے اترنے وقت جلن پیدا کرتی ہے۔ اور پیٹ میں بھی جلن دیر تک رہتی ہے (۲) ہاضمہ کو اس کی زیادہ مقدار خراب کرتی ہے۔ سرور و پیاس اور قے شراب کے ردِ عمل ہیں۔ یہ عیوب نہایت ہی نفرت آگیں ہیں اور شراب کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ چند گھنٹوں کی مسرت کے عوض کئی گھنٹے تکلیف اٹھانا ردِ عمل اور جہانہ کی قیمت ہے۔ شراب کی کثرت استعمال صحت کو تباہ کر دیتی ہے۔ (۳) بہت کم لوگ ایسے ہیں

جو پہلی منزل سے تجاوز نہیں کرتے نشہ کی حالت میں اپنے آپ پر قابو رکھنا بہت کا کام ہے۔ اپنی انفرادی قوت کے حسب مقدار پنا ایک بہت بڑی خوبی ہے۔ یہ وہی کر سکتا ہے جسے اپنی خواہشات اور جذبات پر کامل اختیار ہو۔ یعنی انفرادی زندگی کے قانون پر پوری طرح سے عمل پیرا ہو۔ مگر اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو حد سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ وہ اپنی حد کو جانتے بھی ہیں مگر اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتے۔ اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ وہ شعور سے نابلد ہو جاتے ہیں۔ دوسری منزل میں غیر منہج حرکات اور گناہ کا ارتکاب معمولی بات ہے۔ جذبات بہت جلد مشتعل ہو جاتے ہیں۔ قساوت قتل۔ عصمت درمی اور لوٹ مار میں آسانی ہو جاتی ہے۔ جلیوں کے ریکارڈ اس بات کا ثبوت ہیں کہ اکثر جبرائیم نشہ کی حالت میں سرزد ہوتے ہیں (۴) کیونکہ انسان شرم و حیا بلا سہ طاق رکھ دیتا ہے۔ اس لئے اس بے پروائی کی حالت میں وہ گناہ کی ترغیب پاتا ہے۔ تفریحی رقص کی محفلوں میں یا اور کئی موقعوں پر نشہ اس کی عقل پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ وہ خدا۔ سماج اور حکومت کو اس وقت خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ تسکین جذبات چاہتا ہے۔ اسکی قیمت اسے کیا ادا کرنا ہوگی۔ اسے کوئی پروا نہیں ہوتی۔ شعور اپنی کمزور آواز بلند کرتا ہے ضمیر اس کا ہاتھ روکنے کی سعی کرتا ہے۔ مگر بے سو۔ جذبات بد کے ہوئے گھوڑے کی طرح مشکل سے ہی قابو میں آتے ہیں۔ یہی خوبی عیب میں بدل ہو جاتی ہے۔ یہی بے پروائی جو مسرت کو دوبالا کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے وہی بے پروائی گناہ اور جرم کے ارتکاب کی موجب ٹھہرتی ہے۔ یہی دلیری اور شجاعت کی صفت جو ایک انسان کو نشہ کی حالت میں سچ بولنے کی ترغیب دیتی ہے۔ دوستوں کو قریب تر کرتی ہے۔ یہی دلیری کشت و خون اور لوٹ مار پر آمادہ کرتی ہے۔ گہرے دوستوں کے آپس دست و گریباں ہونے کا باعث بنتی ہے۔ اور ہزاروں آفتوں کا پیش خیمہ بنتی ہے (۵) دوسری منزل میں نشہ اس قدر حاوی ہوتا ہے کہ اعضائے جسمانی حرکت کرنے سے جواب دے دیتے ہیں۔ آنکھوں کے پوٹے کھلے نہیں رہ سکتے۔ قوت ارادی سلب ہو جاتی ہے

بند اپنا غلبہ پالیتی ہے۔ ایسی حالت میں انسان بے ہوشی کی نیند سو جاتا ہے۔ موت بھی آ جائے تو بڑی بات نہیں۔ دوستوں کے لئے پریشانی کا باعث ہوتا ہے۔ اس حالت میں یہ ہوشی میں شرابی کو لوٹ لینا یا قتل کر دینا یا کہیں پھینک دینا نہایت آسان ہو جاتا ہے۔ فلم دی کال آف دی فلیش یا اس کا ہندوستانی چربہ جو خزانچی کے نام سے مشہور ہے۔ اس امر کی وضاحت کرتا ہے۔ چوروں۔ لیٹروں اور رہنروں کے لئے شراب بہترین حربہ ہے۔ عیاش لوگوں کے لئے عورت کی عصمت درمی کا نہایت آسان ذریعہ ہے۔ پہلی منزل میں انسان مافعت کر سکتا ہے۔ اس کا شعور بیدار ہوتا ہے۔ مگر دوسری منزل میں شعور پر غنودگی ہوتی ہے۔ اعضائے جنائی میں حرکت کی قوت باقی نہیں رہتی۔ ہوش اگرچہ قائم بھی ہو۔ چور اگرچہ جیب سے بٹوانکال بھی رہا ہو اور بدست شرابی اُسے ایسا کرتے ہوئے دیکھ بھی رہا ہو۔ تب بھی وہ مافعت نہیں کر سکتا۔ نہ ہاتھ اٹھا سکتا ہے نہ کسی کو مدد کے لئے پکار سکتا ہے (۶) جسم اور صحت کو جو نقصان پہنچتا ہے۔ وہ کسی سے مخفی نہیں۔ شراب کی کثرت استعمال دل۔ دماغ۔ جگر۔ گِرے۔ معدہ وغیرہ کو سخت ایذا پہنچاتی ہے (۷) شراب قوتِ امساک میں وقتی طور پر اضافہ ضرور کرتی ہے۔ مگر ہر بار اس کی مدد لیتا۔ مرد کی قدرتی قوت کو بیکار کر دیتا ہے۔ شرابی شراب کا سہارا لئے بغیر یہ فعل سرانجام نہیں دے سکتا ہے۔

انصر۔ بس کیجئے۔ عیوب تو خوبیوں سے بہت بڑھ گئے۔ یقیناً عیوب کا پلاڑی بھاری ہو گیا۔

مائیکل۔ مجھے اس حقیقت سے انکار نہیں۔ میں نے بے لاگ تنقید حقائق کی روشنی میں کی ہے۔ عیوب کا پلاڑی بیشک جھک گیا ہے۔ میں صحیح تو لےنے والا ہوں۔ سائنس کا دھرم گناہ میرے ہاتھ میں ہے۔

انصر۔ قرآن بھی تو یہی فرماتا ہے کہ اے ایمان والو۔ بلاشبہ شراب میں خوبیاں بھی ہیں۔ مگر اس کے عیوب خوبیوں سے زیادہ ہیں۔ اس لئے اس سے پرہیز کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔

مائیکل : میں اس اصول کی تائید کرتا ہوں۔ مگر دنیا میں اکثر ایسے انسان بھی ہیں۔ جو شراب نوشی سے معصومانہ خط اٹھا سکتے ہیں۔ ان کے لئے مناسب مقدار کا استعمال میں جائز سمجھتا ہوں۔ مذہب کی احتیاط کا مقصد میں خوب سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اکثریت حد سے تجاوز نہ کر جاتی ہے۔ اس لئے میں نے سائٹفک نتیجہ یہی اخذ کیا ہے۔ کہ شراب کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کی جائے تاکہ جسمانی اعضا کے نقصان کا احتمال نہ رہے۔ اس کے لئے حکومت اپنا ادارہ قائم کر سکتی ہے۔ جو سوائے بہترین شراب کے گھٹیا قسم کی شراب پر کڑی تیار نہ کرے۔ اور نہ کسی کو کرے۔ نہ سوائے حکومت کے کسی فرد یا افراد کو شراب کی کشید کا حق نہ دیا جائے۔ قانون کی ضمانت و رزی کرے۔ نہ والوں کو سخت سے سخت سزا دے۔ تاکہ سوائے بہترین شراب کے لوگ اور کسی قسم کی شراب استعمال نہ کر سکیں۔ اس کے علاوہ سماج کا یہ فرض ہو کہ وہ کسی فرد کو حد سے تجاوز نہ کرنے دے۔ اعتدال سے بڑھنے نہ دے۔ یہ فرض فرد کے احباب۔ رشتہ داروں اور سماج پر عاید ہوتا ہے کہ وہ تعلیم و تربیت کے ذریعہ افراد کی اصلاح کرے۔ اور جو افراد صریحاً بدست ہو کر سماج کے امن میں رخنہ انداز ہوں۔ ان کو حکومت مزا دینے کا حق رکھتی ہے۔

انصر : جیسی شراب آپ پسند کرتے ہیں وہ صرف بہشت میں ہی میسر آ سکتی ہے۔ قرآن اس سلسلے میں فرماتا ہے کہ حنبت کی شراب دنیاوی شرابوں کے تمام عیوب سے پاک ہوگی۔ وہاں کی شراب کی یہ خصوصیات ہوں گی۔ کیف و سرور ہوگا۔ مگر نشہ نہیں ہوگا۔ بدستی طاری نہیں ہوگی۔ شراب سفید اور شفاف ہوگی اور اس کا ذائقہ بھی خوش کن ہوگا۔ و عمل یعنی سرور و پیکس۔ بدھنمی وغیرہ کی شکایات سے بالکل پاک ہوگی۔

مائیکل : بیشک آپ اس شراب کا انتظار کر سکتے ہیں۔ مگر جو لوگ صبر نہیں کر سکتے۔ ان کے لئے یہی اصول وضع کیا جاسکتا ہے۔ کہ زندگی میں دنیا کی ہر چیز سے خطا اٹھاؤ گے مگر اس شرط پر کہ تمہاری اپنی ذات نہ کسی اور کی ذات کو اس فعل سے کوئی ضرر پہنچے یہی سیدھا اور سچا راستہ ہے۔ اگر کوئی اس پر عمل نہیں کرتا۔ تو اس کا وہ خود ذمہ دار ہے۔

انصر۔ عام انسان اس اصول پر عمل پیرا نہیں ہوتا۔ شراب کی مقدار مقرر نہیں کی جا سکتی۔ یہ مشکل امر تھا کہ پینے کے ساتھ کوئی پابندی عاید کی جاتی۔ چند لوگوں کے لئے جائز قرار دی جاتی اور باقی لوگوں کے لئے ناجائز۔ اس لئے اسلام نے اس خطرہ کو محسوس کرتے ہوئے شراب تمام لوگوں کے لئے حرام کر دی۔ کیونکہ شراب نیکی کی نسبت بدی کی ترغیب زیادہ دیتی ہے۔

مائیکل۔ ”مجھے اسلام کی نیک نیتی پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بیشک مذہب تقدس کی تعلیم دیتا ہے اور جو شخص پاکباز رہتا ہے۔ اس کی میری نظروں میں بڑی وقعت ہے میں آپ کو پینے کی ترغیب نہیں دیتا۔ میرا اپنا اصول ہے۔ اور میں اس کا پابند ہونے کی ہمیشہ سعی کرتا ہوں۔ فطری کمزوری سے میں بھی مستثنیٰ نہیں۔ مگر آپ جانتے ہیں میں آدرش کے حصول کی کوشش کرتا ہوں۔ آپ مذہب کا محتاط راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں میں خطرات سے مقابلہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں بدی پر بہت حد تک فتح پا چکا ہوں۔ آپ کا شیطان بھی مجھے اپنے اصول زندگی سے منحرف ہونے کی ترغیب نہیں دے سکتا۔ میرا آدرش یہی ہے کہ میں وہی راستہ اختیار کئے رکھوں جو انسان کے شایاں ہے۔ میں بدی کے سمندر میں اپنی کشتی ڈوبنے نہیں دوں گا۔ وہ صحیح سلامت کنا سے لگے گی۔ اس کا مجھے ایسا ہی یقین ہے جیسا کہ آپ کو خدا پر“

انصر۔ آپ کی باتیں اور اصول بیشک درست ہیں۔ کاش انسان صحیح معنوں میں انسان بن جائیں۔ یہی مذہب کا مقصد ہے۔

چھٹا باب

علم و ہنر

”تعلیم کے متعلق آپ کا کیا نظریہ ہے؟ علم و ہنر کیوں ضروری ہیں؟ معیارِ تعلیم کیا ہونا چاہیئے؟ ہمارا موجودہ نظامِ تعلیم کیوں ناقص ہے؟“ میں نے مائیکل سے سوال کیا۔

مائیکل: ”زندگی حرکت کا نام ہے۔ حرکت کس طرح کرنی چاہیئے یہ ہمیں علم سے پتہ چلتا ہے، علم کی روشنی ہی ہم کو راستہ دکھا سکتی ہے۔ اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارنا ذمی شعور انسان کا کام نہیں۔ یاد ہوگا ہماری گفتگو کا آغاز اسی سوال سے ہوا تھا کہ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ جب تک ہم زندہ ہیں ہمیں اس دنیا میں زندگی بسر کرنا ہے۔ زندگی بسر کیسے کی جائے؟ اسی موضوع پر ہماری گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہمیں ان تجربات اور مشاہدات کا علم ہو جو ہمارے متاخرین ہمارے لئے کتابوں کی صورت میں درج کر گئے ہیں۔ جو کچھ حاضرینِ علم میں اضافہ کر رہے ہیں اس کا بھی ہمیں علم ہونا چاہیئے۔ پھر اس علم کی روشنی میں اپنے تجربات اور مشاہدات کا جائزہ لینا چاہیئے انکشافات اور ایجادات اس صورت میں ممکن ہیں۔ اس لئے پہلی ضروری بات یہی ہے کہ علم حاصل کیا جائے۔ علوم کی اقسام میں اختصار سے بیان کر دوں گا تاکہ آپ کا تمام علوم سے تعارف ہو جائے۔ اور یہی ابتدائی اور لازمی تعلیم کا مقصد بھی ہونا چاہیئے۔ انسان کے نکتہ نگاہ سے دو ہی چیزوں کا علم ضروری ہے۔ ایک انسان کا اپنے متعلق

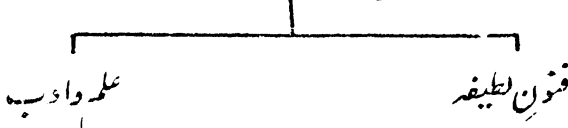
اور دوسرے یہ دنیا جس میں وہ رہتا ہے۔ دنیا کے علم میں تمام دنیاوی اشیاء شامل ہیں میرے خیال میں اس کا نقشہ پیش کرنا مطالب کی زیادہ وضاحت کریگا۔ یہ کہہ کر مایکل نے ایک علم و ہنر کا نقشہ بنایا اور پھر اس کی وضاحت کی۔ یہ نقشہ میں یہاں نقل کر رہا ہوں۔

انسان

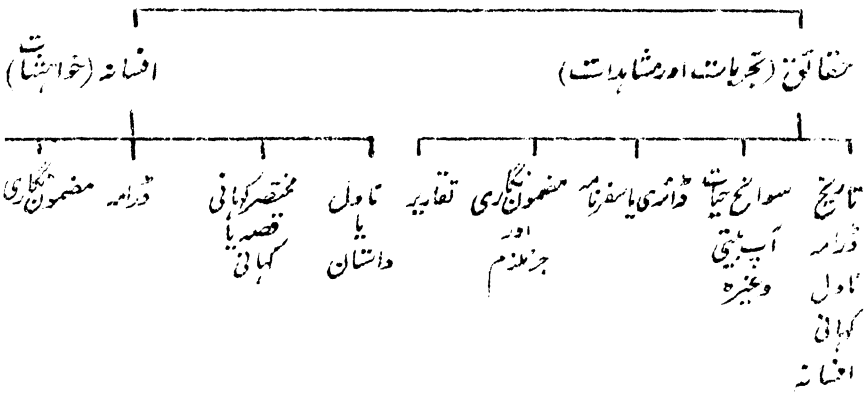
جسم ذہن میں نفس اور ادراک و فو

انسان کی غوی دو چیزوں کا مرکب ہے۔ ایک جسم دوسرا ذہن۔ اعضائے جسمانی خدام سے مشابہ ہیں۔ ذہن فرمانروا کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں تک جسم کا تعلق ہے ہمیں جسم کو زندہ اور صحت مند رکھنے کا علم ہونا ضروری ہے۔ اس مقصد کے لئے فزیالوجی تشریح جسم انسانی یعنی اناتومی۔ نسلیات۔ علم حیوانات اور نباتات۔ جنیات وغیرہ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ تاکہ معلوم ہو کہ انسان کیا ہے اس کے اعضائے جسمانی کی ساخت اور ان کا فعل کیا ہے۔ ان کو افعال کے قابل کس طرح رکھا جاسکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی واقفیت ہونی چاہیے۔ اگر ہماری صحت خراب ہو جائے یا اعضائے جسمانی میں کوئی نقص آجائے تو اس کی درستی کس طرح ہو سکتی ہے جسم دوبارہ صحت مند کیسے کیا جاسکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بیماریوں کو شفا دینے کا فن بھی ضروری ہے طب جرحت اس ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ اب لیجئے ذہن جسم کی ساخت اور افعال کے علم کی طرح ذہن کے متعلق بھی علم کا حصول ضروری ہے۔ انسان کیا ہے؟ انسان اس دنیا میں کہاں سے اور کیسے آیا؟ اس کی زندگی یا موجودگی کا مقصد کیا ہے؟ زندگی کا طرز عمل کیا ہونا چاہیے؟ انسان کو کس طرح بننا چاہیے؟ کیا اس زندگی کے بعد بھی کوئی زندگی ہے؟ اس دنیا کا کوئی خالق ہے کہ نہیں؟ یہ تمام ضروری سوالات ہیں اور ان کا جواب ہم نہ برکبٹ لایکے ہیں۔ فلسفہ۔ مذہب۔ اخلاقیات۔ علم النفس۔ سیاسیات اور معاشیات یہ تمام انہی جوابات کو پیش کرتے ہیں۔ بیشتر سوالوں کا جواب دیا جا چکا ہے۔ باقی زیر بحث

لائے جائیں گے۔ ان تمام علوم کا انسان کی زندگی کے ساتھ تعلق ہے۔ دراصل سوال ایک ہی ہے یعنی انسان کو زندگی کیسے بسر کرنی چاہیے؟ اور یہ تمام علوم اس سوال کے جوابات ہیں۔ اگر آپ غور سے ان علوم کے مقصد پر نگاہ ڈالیں تو مقصد صاف ظاہر ہو جائے گا یعنی زندگی کو مسرور ترین بنانے کا فن



موسیقی اور قصہ فنِ اداکاری کیمیل اور تفریح نشر نظم
 علم و ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ نظم ہو یا نشر مقصد اظہار خیالات و احساسات ہے۔ ادیب اور شاعر زندگی کی تصویر کشی کرتے ہیں تنقید بھی کرتے ہیں اور مسرور ترین بنانے کا راستہ بھی تجویز کرتے ہیں مگر اچھا شاعر یا ادیب وعظ نہیں کرتا۔ یہ کام فلسفیوں۔ مذہبی معلموں وغیرہ کو زیب دیتا ہے۔ علم و ادب کی دو قسمیں ہیں۔
 علم و ادب (نثر اور نظم)



کائنات

دنیا کو جلوہ گاہ حسن اور راحت کہ بنانے کا فن

علم

کاشتکاری سینا پر ونا مصوری انجینئرنگ
 باغبانی سونے چاندی رنگ سازی ہر قسم کی
 اور دھات کا معامی
 کام۔ کلاسی فوٹو گرافی
 ہاتھی دانت سینما
 وغیرہ کا کام فوٹو گرافی
 پرنٹنگ
 کتابت

جغرافیہ نجوم حساب طبعیات کیمیا
 جو میٹری حیوانات
 الجبرا نباتات
 اقلیدس وغیرہ جمادات

دنیا ایک ایسا مقام ہے جہاں ہم نے زندگی بسر کرنی ہے۔ اس لئے اس کی قدرتی خوبصورتی میں اضافہ کرنا انسانی ضروریات میں شامل ہے۔ اس مقام کو راحت کہہ کر بنانا ہمارا فرض ہے۔ ہر انسان اس کام میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ زمین کے جو کچھ باہر ہے اور جو اس میں مدفون ہے اس کا علم بھی ضروری ہے۔ ان علوم سے ہم فائدہ اٹھا کر مختلف فنون کی شکل میں اصل مقصد کے تکمیل کی سعی کرتے ہیں۔ اس مختصر تجزیہ علوم و فنون سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ہماری تعلیم کا زمانہ دو حصوں میں منقسم ہونا چاہیے۔ تعلیمی نصاب کے پہلے حصہ میں تمام علوم و فنون سے طالب علموں کو متعارف کروانا چاہیے۔ مثال کے طور پر کسی ایک زبان میں لکھنے پڑھنے کے علاوہ فزائیوجی۔ ایٹم۔ جنسیات۔ فلسفہ۔ دینیات۔ اطلاقیات۔ نفسیات۔ تاریخ۔ جغرافیہ۔ علم الطبیعیات۔ کیمیا دی علم۔ ریاضی۔ اقلیدس۔ علم الحیوانات۔ نباتات۔ جمادات۔ نسلیات وغیرہ کی مختصر طور پر تعلیم ضروری ہے۔ تاکہ

ہر فرد کے قدرتی رجحان کا علم ہو سکے۔ ایسے ابتدائی کورس کے لئے آٹھ سال کا عرصہ بہت کافی ہے۔ زندگی بہت تھوڑی ہے۔ اس لئے جوانی کا وقت ضائع کرنا دانا ہی نہیں ہے موجودہ طریقہ تعلیم میں یہی نقص ہے۔ کہ خواہ مخواہ وقت ضائع ہوتا ہے۔ پہلے اردو میں تعلیم حاصل کرو۔ پھر دہی مضمون انگریزی زبان میں دہراؤ۔ کالج میں پہنچ کر بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ طالب علم کا قدرتی رجحان کیا ہے۔ طالب علم کو خود اس بات کا علم نہیں ہوتا۔ وقت گزرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ قدرتی طور پر کس کام کے لئے پیدا ہوا ہے۔ اس کی فطرت اس سے کیا کام لینا چاہتی ہے اور اکثر اوقات ہوش ویر میں آتا ہے۔ یہ سب معلوم کا قصور ہے۔ اس لئے آٹھ سال کی لازمی اور ابتدائی تعلیم کے زمانہ میں اس بات کا تصفیہ ہو جانا چاہیے کہ فرد کا قدرتی رجحان کس علم یا فن کی طرف ہے۔ اس تصفیہ میں معلم طالب علم کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ وہ اپنے تجربات سے اسے مستفید کر سکتا ہے۔ تاکہ طالب علم اپنی خودی کو پہچانے اور پھر اس کی نشوونما کی سعی کرے۔ حکومت سماج اور خود فرد کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی تکمیل کرے۔

میں بھی اسی ناکارہ اور ناقص طریق تعلیم کا شکار ہوں۔ وقت گزر چکا ہے۔ میری فطرت کا جو اقتضا ہے۔ وہ میرے پیشہ سے بالکل مختلف ہے۔ مگر حالات کی مجبورگی مجھے ایسے کام کرنے پر مجبور کر دیتی ہے جس سے مجھے نفرت ہے۔ میں نے سرولہجہ میں کہا۔ **مائیکل** انسان بہت رکھتا ہو۔ اس کی آرزوئیں اور امنگیں جواں ہوں۔ امید کا دامن اس کے ہاتھ ہی میں ہو تو انسان کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ شیخ سعدی نے چالیس برس کی عمر میں پڑھنا شروع کیا تھا۔ تم اتنے ہی بوڑھے ہو جتنا کہ تم محسوس کرتے ہو جسم کا بڑھاپا اور چیز ہے۔ ذہن کی پیری اور چیز ہے۔ ذہن کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ تم اب بھی سب کچھ کر سکتے ہو۔ اپنی خودی کی تکمیل اب بھی کر سکتے ہو۔ مجبوریوں کو توڑ دو جس قفس میں تم مقید ہو اسے خیر باد کہہ دو۔ وقتِ ارادی ہو تو راہ خود بخود نکل آئے گی۔

ع عزمِ راسخ ہو تو ہو جانتے ہیں ساماں پیدا۔

”میں اس کا جلد ہی فیصلہ کرنے والا ہوں۔ صرف آپ کی رہنمائی کی ذرا ضرورت ہے“

میں نے جواب دیا۔ ”آٹھ سالہ ابتدائی کورس کی وضاحت فرمائیے“

مائیکل ۱۰ پہلے سال میں طالب علموں کو اس زبان سے روشناس کرایا جائے جو تعلیم کا ذریعہ بنے گی۔ مثلاً ہندوستان میں ہندوستانی۔ اس کے ساتھ ریاضی سے تعارف بھی ہو۔ دوسرے سال زبان کے علاوہ حساب کی جمع۔ تفریق۔ ضرب اور تقسیم سکھائی جائے۔ تیسرے سال میں ہائجن اور فرمایوجی کے علاوہ اپنے صوبہ کا جغرافیہ شامل کر دیا جائے۔ حساب کی ضرورت واقفیت کافی ہے۔ زیادہ حساب پر دقت صرف کرنا بیکار ہے۔ جو طالب علم ریاضی کا دلدادہ ہوگا اس کے لئے بعد میں کافی گنجائش ہوگی۔ چوتھے سال میں ہندوستان کا مختصر جغرافیہ اور مختصر تاریخ کا آغاز کر دیا جائے۔ ہائجن اور فرمایوجی کی جگہ علم الطبیعات سے تعارف کرایا جائے۔ ریاضی کی جگہ الجبرا کا درس دیا جائے۔ پانچویں سال میں تعلیمی زبان کے علاوہ کوئی دوسری غیر ملکی زبان مثلاً انگریزی شروع کر دی جائے۔ تاریخ ہند اور جغرافیہ ہند اس سال ختم ہو جانا چاہیے۔ الجبرا کا سبق جاری رہے۔ فزکس کا کورس بھی جاری رہے۔ چھٹے سال میں تعلیمی زبان کی جگہ انگریزی کو دے دی جائے۔ دنیا کی مختصر تاریخ اور جغرافیہ کا کورس شروع کر دیا جائے جو آٹھویں سال میں مکمل ہو جائے۔ فزکس کیسٹائٹ میٹری کا تعارف بھی کروا دیا جائے اور الجبرا کی جگہ جو میٹری کا ابتدائی درس دیا جائے۔ ساتویں سال میں انگریزی۔ تاریخ اور جغرافیہ کا کورس جاری رہے۔ فزکس اور کیسٹری کی جگہ ابتدائی علم الجیوانات اور نباتات کی تعلیم شروع کی جائے جو میٹری کی جگہ ڈرائنگ شروع کی جائے اور فلسفہ۔ دینیات۔ اخلاقیات اور سائنس کا لوہی کا تعارف کروایا جائے۔ آٹھویں سال میں ساتویں سال کے مضامین جاری رہیں۔ امتحان تین تین ماہ بعد لیا جائے۔ اور ترقی پواروں سے ماہی امتحانات کے اوسط نمبروں کی بنا پر دی جائے۔ آٹھویں سال کے اختتام پر یونیورسٹی کا امتحان ہو جس جس مضمون میں کوئی فیل ہو جائے اس کا سترہین مہینہ بعد امتحان ہو۔ آٹھویں سال کے اختتام پر طالب علم کو تصفیہ کر لینا چاہیے کہ وہ کالج میں کیا مضامین انتخاب کرے گا۔

کا کورس چار سال کا ہو۔ اور تین چار مضامین کا ایک ایک مجلہ ایسا ہو جو کسی مخصوص پیشہ کے اختیار کرنے میں معاون ہو۔ مثلاً حساب۔ الجبر۔ جو میٹری۔ فزکس اور ڈرائیونگ انجینئرنگ کے کورس کے لئے ضروری ہیں کیمسٹری۔ بیا لوجی۔ بٹانی۔ ذوا لوجی وغیرہ میڈیکل کورس کے لئے لازمی ہیں۔ اسی طرح تاریخ۔ جغرافیہ سیاسیات اور معاشیات کا روبری سیاسی یا حکومت کے شعبوں میں ملازمت کے لئے مفید ہونگے۔ علم ادب۔ فلسفہ۔ دینیات۔ انشائیات اور علم النفس ادبی یا اخباری یا قانون لٹریچر کی قسم کے پیشوں کے لئے لازمی ہیں۔ یہ مضامین ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اور ان چاروں مجموعوں میں سے انتخاب کیا جاسکتا ہے۔ مگر انتخاب کرتے وقت پیشہ کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ پیشہ کے مطابق مضامین کا انتخاب عمل میں لانا چاہیے۔ چار سالہ یونیورسٹی کورس کے بعد پیشہ کی تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ معاشی کورس چار پانچ سال سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس کورس کے پاس کرنے پر اس مخصوص آرٹ کے ماسٹر ہونے کی سند ملنی چاہیے۔ ورنہ اصل بی۔ اے اور ایم۔ اے غلط اصطلاحیں ہیں۔ ان ڈگریوں کا حصول کسی بھی آرٹ کا ماسٹر نہیں بناتا۔ البتہ کسی پیشہ کے سکھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ اس لئے یہ ڈگریاں تو فقط کلرک بناتی ہیں۔ یہ بہتر ہوگا کہ چار سالہ یونیورسٹی کورس میں کامیابی حاصل کرنے پر عالم کی ڈگری عطا کی جائے۔ جو طالب علم کسی خاص علم سے لگاؤ رکھتا ہے اور اسی کو پیشہ بنانا چاہتا ہے اسے چار سال اور ایک ہی علم کی مفصل تعلیم حاصل کرنی ہوگی۔ اس میں کامیابی حاصل کرنے پر اسے ماہر مہتمم کی ڈگری دی جائے۔ اسی طرح کسی فن میں کامیاب ہونے پر ماہر فن کی ڈگری ملنی چاہیے۔ اس طریق پر عمل پیرا ہونے سے طالب علم اکیس بائیس سال کی عمر میں ماہر علم یا ماہر فن بن سکتا ہے اور وہی پیشہ آسانی سے اختیار کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں حکومت کا فرض ہے کہ وہ اس کے لئے کام مہیا کرے۔ ایسا نہ ہو کہ ڈگری تو ماہر علم ادب کی ہو اور کام اس سے کھوکھلی یا حساب کتاب کا لیا جائے۔ یا فلسفہ کے ماہر کو کارخانے کا انجینئر بنا دیا جائے۔ موجودہ حالات اور نظام حکومت میں یہی بے راہ روی متعمل ہے

اس لئے حکومت کے ذمہ یہ اہم فرض ہے کہ ہر شخص کی تکمیل خودی میں اعانت کرے۔ اسے تعلیم و تربیت سے آراستہ کرے۔ اور اس کے لئے کام نہایا کرے۔ بریکاری کا نام و نشان تک نہ ہو۔ کوئی شخص بھی معاشی تفکرات سے دوچار ہونے نہ پائے۔ تعلیم ابتدائی کورس سے لیکر ماہر علم و فن کی ڈگری حاصل کرنے تک کے تمام فرائض حکومت کے ذمہ ہوں۔ تعلیم کے اختتام پر بریکاری سے کوئی بھی دوچار نہ ہونے پائے۔ یہ ہے آوازِ جوانان کے تباہی نشان ہے۔“

”اچھا تو عورتوں کی تعلیم کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ میں نے پوچھا۔

مائیکل: ”آٹھ سالہ ابتدائی تعلیم کا کورس لڑکیوں کے لئے بھی یکساں ضروری ہے۔ میں غلط تعلیم کا حامی ہوں مگر جو اقوام پیوہ کی پابند ہیں۔ وہ لڑکیوں کو علیحدہ تعلیم دلا سکتی ہیں۔ سکول دونوں قسم کے ہونے چاہئیں۔ اس کورس کے اختتام پر جو لڑکیاں کئی مردانہ پیشہ اختیار کرنا چاہئیں وہ کالجوں میں تعلیم حاصل کر سکتی ہیں۔ اور ماہر علم یا فن کی ڈگری لے سکتی ہیں۔ مگر جو لڑکیاں بہترین بیویاں اور مائیں بننا پسند کرتی ہیں۔ انہیں اس ابتدائی کورس کے بعد چار سالہ کورس پاس کرنا لازمی ہوگا۔ اس کے پاس کئے بغیر کوئی عورت شادی نہیں کر سکتی۔ اس کورس میں تمام ضروری امور مثلاً سینا پر ونا۔ کھانا پکانا۔ بچوں کی پرورش۔ نرسنگ اور جنسیات وغیرہ کی تعلیم دی جائے تاکہ وہ بے خطر ازدواجی زندگی میں قدم رکھ سکیں اس کورس میں کامیابی حاصل کرنے پر عالم کی ڈگری عطا کی جائے۔ اس طرح ایک عالم مرد کیلئے عالم بیوی میسر آسکے گی۔ جو لوگ ابتدائی کورس سے آگے بڑھنے کے اہل نہ ہوں۔ انہیں کسی پیشہ میں شاگرد کے طور پر شامل ہونے میں حکومت اعانت کرے۔“

”آپ نے یہ نہیں بتایا کہ تعلیم کس عمر سے شروع ہو اور تربیت کس طرح ہو؟ میں نے کہا مائیکل: ”ابتدائی تعلیم جو مرد و عورت کے لئے لازمی ہوگی اس کے ساتھ تربیت بھی ملوں گا فرض ہوگی۔ والدین پر تربیت کی ذمہ داری زیادہ عاید ہوتی ہے۔ تربیت نہایت ضروری چیز ہے اور اس کے لئے بہترین وقت بچپن کا ہے۔ یہی وہ عمر ہے جس وقت بچہ اچھی یا بُری

عادات اختیار کرتا ہے۔ یہ عاداتِ فطرتِ ثانی میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اور پھر جو افی میں ان کا تبدیل کرنا ایک امر محال بن جاتا ہے۔ اس لئے تربیت کا صحیح زمانہ بچپن ہی ہے۔ معلموں اور والدین کو اس طرف گہری توجہ مبذول کرنی چاہیے۔ تعلیم کسی عمر میں بھی حاصل کی جاسکتی ہے مگر تربیت کے لئے پھر موقعہ ملتا ہے نہیں آسکتا۔ اخلاقی تعلیم اتنی ہی ضروری ہے۔ جتنی کہ دوسرے علوم سے واقفیت۔ انہی عادات سے کسی انسان کا کردار بنتا ہے۔ بچپن کے زمانہ میں تاثرات، جو نفوشِ ذہن پر بنا دیتے ہیں۔ وہ پھر مٹائے نہیں ملتے۔ یہ نفوشِ لاشو کا جزو بن جاتے ہیں۔ سادہ شعور ان سے رہائی نہیں پاسکتا۔ مثلاً مشہور ہے کہ جو ہاتھ بچہ کا پنگھوڑا ملتا ہے۔ وہ دینار حکومت کرتا ہے کسی قوم کی ترقی کا راز اس کے افراد کا اعلیٰ کردار ہے تعلیم تربیت کا ایک اہم جزو ہے۔

انصاف ”تربیت کا بہترین زمانہ تو بچپن ہی ہو سکتا ہے۔ مگر تربیت کا بہترین طریقہ کیا ہے؟“ ”تربیت کا بہترین طریقہ بچوں کو کہانیاں سنانا ہے۔“ بچے کہانیوں کو بہت پسند کرتے ہیں۔ کہانی سننے کا شوق انسان کا تمام عمر ساتھ دیتا ہے۔ اسی جذبہ کی تسکین کے لئے ہم افسانے، ناولیں اور ڈرامے سنتے اور پڑھتے ہیں اور یہی جذبہ ہمیں تھیٹر اور فلم دیکھنے پر اکساتا ہے۔ علم ادب تفریح بھی ہے اور اصلاح بھی لطیف پیرائے میں پیش کرتا ہے۔ اس لئے ناگوار نہیں گذرتا۔ کہانیاں سننا فطری اقتضا ہے۔ اس لئے بچوں کو شروع میں صرف کہانیوں سے محفوظ رکھ دو۔ اخلاقی درس ان کی سمجھ سے بالاتر ہوتا ہے۔ وہ نیکی اور بدی کا مفہوم نہیں سمجھ سکتے۔ مگر کہانی میں نیکی اور بدی کے کردار کو عمل کرتے ہوئے محسوس کر سکتے ہیں کیونکہ کہانی میں ہم وفاداری کو مجسم طور پر ثبوت بنا کر پیش کرتے ہیں بچے وفاداری کی کہانی سن کر اپنے دل میں ایک جذبہ محسوس کرتے ہیں۔ اس بہادر لڑکے کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اسی طرح اعلیٰ کارنامے ہمیں اعلیٰ کارناموں کی ترغیب دیتے ہیں۔ جنگ کے وقت بہادروں کے کارنامے سنائے جاتے ہیں۔ جو جوشِ خروش میں اضافہ کرتے ہیں۔ شاعر منظوم کارنامے بیان کرتے ہیں۔ اور سبھی سر و دھڑکی بازی لگا

دیتے ہیں۔ موجودہ جنگ میں امریکی پرائیگنڈ افلوں نے بیحد کام کیا ہے۔ کہانیاں کس قدر دلچسپ تھیں اور مقصد خود بخود دیکھنے والوں کے ذہن کو متاثر کر دیتا تھا۔ جاپان اور جرمن کے خلاف نفرت اسی طریق پر پیدا کی گئی۔ اس لئے کہانی کی اہمیت سے استہزا ناممکن ہے۔ لیکن کہانیوں کے انتخاب میں احتیاط بہت اہمیت رکھتی ہے۔ کس قسم کی کہانی کس عمر کے بچے کو پیش کرنی چاہیے ایک غور طلب بات ہے۔ کہانیاں لاتعداد ہیں۔ اس لئے انتخاب آسان کام نہیں ہے۔ معلموں اور والدین کو اس معاملے میں بڑی دانا ئی سے کام لینا چاہیے۔ ایک بارہ سال کا لڑکا سات سال کی عمر کے بچے سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ وہ پریوں کی کہانی کو ناپسند کرتا ہے حالانکہ یہی کہانیاں بچپن میں اس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا کر دیا کرتی تھیں۔ وہ اب ٹھوس حقیقت چاہتا ہے۔ وہ ایسے ہیرو کے کارنامے سننا پسند کرتا ہے جو واقعی اس دنیا میں گزر چکے ہیں۔ اس لئے عمر کے مطابق کہانیوں کا انتخاب نہایت ضروری ہے۔ بس یہ اصول سمجھ لیجئے کہ بچوں کو ان کی کچھ سے بالاتر کہانی سننے سے اتنا نقصان نہیں پہنچتا کہ انکو کچھ سے گھٹیا کہانی سننے سے ہو سکتا ہے۔ معلم کو بچوں کی نفسیات سے واقفیت لازمی ہے میرے خیال میں ابتدائی کلاس کے معلموں کے لئے ایک سال کا درس مقرر ہونا چاہیے۔ جو بچوں کی تربیت اور ان کی نفسیات کے متعلق آگاہ کرے۔ ابتدائی کورس کے معلموں کے لئے عالم کی ڈگری کافی ہے۔ اس لئے مدرس بننے کے لئے ایک یا دو سال کا نصاب مقرر ہو جس میں تعلیم و تربیت کے طریقوں سے آگاہ کیا جائے۔ اس امتحان کو پاس کر لینے پر ماہر درس کی ڈگری عطا کی جائے۔ اس سند کے بغیر کوئی معلم یا مدرس مقرر نہ کیا جائے۔

انصر۔ اس امر کی ذرا وضاحت فرمائیے۔

ماہر۔ مثال کے طور پر معلم کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ بچے شرارتیں کیوں کرتے ہیں۔ یا وہ غلط راہ کیوں اختیار کرتے ہیں اور کس طرح انہیں صحیح راستے پر لگایا جاسکتا ہے۔ بچے ضد کیوں کرتے ہیں۔ وہ کیا چاہتے ہیں۔ ہم ان بچوں کو شرارتی، ضدی اور خراب کہہ کر اکتفا کر لیتے ہیں۔ مگر ان کی اصلاح کا طریقہ نہیں جانتے۔ ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ بھی میوہ

ثابت ہوتی ہے۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ یا تو بچہ میں کام کرنے کی قوت معمول سے زیادہ ہے یا بہت کم۔ ضد مستی۔ شرمیلہ پن۔ ڈرپوک ہونا۔ جھوٹ بولنا وغیرہ اس امر کی دلیل ہیں کہ بچہ میں قوت کی کمی ہے۔ وہ عالی تمہت نہیں ہے۔ اس کے برعکس ٹھیکلہ۔ جھگڑالو۔ شرارتی۔ چوری اور لوٹ مار کرنے والا بچہ قدرت کی عطا کی ہوئی قوت سے مالا مال ہوتا ہے۔ یہ ایک قوت ہے جو غلط راستہ اختیار کر چکی ہے۔ اس کی مثال ایک ہوائی جہاز کی سی ہے جو بمباری بھی کر سکتا ہے اور مسافروں کو ان کی منزل مقصود تک پہنچانے کی خدمت بھی سرانجام دے سکتا ہے۔ اس لئے ایک بچہ جو اس قوت سے مالا مال ہے۔ وہ اس قوت کو صرف کرنا چاہتا ہے یعنی موٹر میں پٹرول بھرا ہوا ہے۔ وہ تیزی سے جارہی ہے مگر ڈرائیور موجود نہیں۔ اس کے برعکس جو بچہ کم قوت کا ہے اس کی موٹر میں پٹرول ہی نہیں تو ڈرائیور بیکار ہے۔ مجھے ایک کہانی یاد آئی ہے سینے۔ ایک سکول کے پرنسپل نے آٹھویں جماعت میں لکڑی کے کام کی تعلیم اپنے طور پر شروع کر دی۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ بات یہ تھی کہ عام لڑکوں کی طرح اس سکول کے لڑکے بھی میزوں اور ڈیسکوں پر چاقو سے اپنے اپنے نام کھود ڈالتے تھے۔ اس جذبہ کا اظہار آپ نے کئی جگہ مشاہدہ کیا ہو گا۔ قطب مینار کی آخری منزل پر مقبروں کی دیواروں پر درختوں کے تنوں پر اور مرنے کے بعد قبروں پر کندہ کئے ہوئے نام سب اسی جذبہ کی کار فرمائیاں ہیں۔ یہ جذبہ ہے دوسروں کی نظر میں اہمیت حاصل کرنا۔ اس جذبہ کا اظہار آرٹسٹ اپنی تصویر کے نیچے اپنا نام لکھ کر اور ایک مصنف اپنی کتاب کے سرورق پر اپنا نام چھپوا کر کرتا ہے۔ ایک حاکم اپنی مہر سے اس جذبہ کی تسکین کرتا ہے۔ پرنسپل نے اس نفسیات کی روشنی میں اقدام کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکے خود پرنسپل سے درخواست کرتے تھے کہ انہیں میزوں کو پالش اور مرمت کرنے کی اجازت دی جائے کیونکہ ان کا نام میز کے کونے میں کندہ ہو سکتا تھا۔ وہ فخر کرتے تھے کہ یہ میز میں نے درست کی ہے۔ انصر بھی یہ میں اڑے کام کرتی ہے۔ یہ سب تصنیفات عمارتیں اور عجائبات اسی میں کی کہ شمع سار زیاں ہیں۔ ایک ڈاکو اور خونی بھی قابلیت کے جوہر ہے

مالا مال ہوتا ہے۔ کبھی انصر چوری بھی کی ہے۔ نہیں۔ میں نے اس کا بھی تجربہ کیا ہے۔ ورنہ میری تحقیق مکمل کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ فعل آسان نہیں ہے۔ اس کے لئے تہمت چاہیے۔ فرق صرف اتنا ہے۔ کہ چور اپنی قوت کو غلط راستے پر استعمال کرتا ہے۔ ایک سائنسدان یا شاعر اسے صحیح راستے پر کامزن کرتا ہے۔ ”چار سو بیس“ کرنے والے اپنی قابلیت کا ثبوت غلط طور پر پیش کرتے ہیں۔ مگر ہیں وہ قابل۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح شرارتی بچوں کو غنیمت جانو۔ انہیں ڈانٹ ٹوٹ کر مشاارت سے باز نہ رکھو۔ ان کی قوت کو سلب نہ کرو۔ بلکہ اس قوت کو صحیح راستے پر لگا دو۔ علم و قوت فساد کی جڑ بھی میں اور انسان کے لئے کار آمد بھی۔ فرق صرف راستے کا ہے۔“

ساتواں باب

کامیاب زندگی

”مائیکل۔ میں تو اس دفتر میں زندگی سے تنگ آچکا ہوں۔ سارا دن افسروں سے ہلک بھرتی ہے۔ میری رائے میں تو ہندوستانی حکومت کے ابھی تک اہل نہیں ہوئے۔ میں تو انگریزوں پر کوئی الزام عائد نہیں کرتا۔ وہ حکومت کرنا جانتے ہیں۔ اس لئے وہ راج کر رہے ہیں۔ ہمیں اپنے عیوب پر نگاہ ڈالنی چاہیے۔ جس دن ہم حکومت کرنے کے قابل ہونگے اس دن طوقِ علامی خود بخود اتر جائے گا۔ میں نے کم از کم آزاد ہونے کا تصفیہ کر لیا ہے۔ میں کو ایک معزز عہدے پر فائز ہوں مگر میں اس پر قناعت نہیں کر سکتا۔ میں اسے کامیابی تصور نہیں کرتا۔ مگر میرا تاجِ تجربہ تو یہی ہے کہ تقدیر تدبیر سے زبردست ہے۔ مجھے اپنے مقصد میں کامیابی کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ اس کی کیا وجہ ہے۔“ میں نے پوچھا۔

مائیکل۔ ”زندگی میں کامیابی کا مفہوم یہ ہے کہ تکمیل خودی ہو۔ اس کے متعلق آغاز میں گفتگو ہو چکی ہے۔ یعنی کسی فرد کی جہانی اور ذہنی قوتیں ہر ممکن طور پر نشو و نما پائیں۔ کامل کامیابی کے معنی یہی ہیں جہاں تک ممکن ہو کسی فرد کی تکمیل خودی کی جائے۔ اس سلسلے میں پہلی حقیقت یہی مد نظر رکھنی چاہیے کہ ہر فرد کی قدرتی قوتیں محدود ہیں۔ ہر فرد اس لحاظ سے مختلف ہے کسی شخص کی صلاحیت اس کی انفرادی قوت سے معلوم کر سکتے ہیں۔ میرا تجربہ اور مشاہدہ تو یہی ثابت کرتا ہے کہ ہر فرد قدرتی قوتیں اور صلاحیتیں کم یا زیادہ ہوتا ہے۔ تعلیم و تربیت اور

ماحول پر موقوف ہے حقائق سے انکار کرنا ہے۔ شاعر۔ ادیب۔ آرٹسٹ۔ سائنسدان پیدا ہوتے ہیں۔ بنائے نہیں جاتے۔ قدرتی صلاحیتیں ایک نائراشیدہ ہیرے کی طرح ہیں جنہیں محنت سے ایک انول ہیرے میں مبدل کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے کامیابی کا اندازہ ہم نسبتاً ہی کر سکتے ہیں۔ یعنی قدرتی صلاحیتیں کیا ہیں اور ان کو کہاں تک کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ ہر شخص اقبال یا غالب نہیں ہو سکتا۔ ایک معمولی ماسٹر اگر کسی کالج کا پرنسپل ہو جائے تو اس کی زندگی کامیاب کہلائی جاسکتی ہے۔ ایک سپاہی جدوجہد کر کے جرنیل یا کمانڈر انچیف کے عہدہ تک پہنچ سکتا ہے یا کسی ملک کا بادشاہ بن سکتا ہے۔ اس کی زندگی بے شک کامیاب ہے۔ مگر سپاہی شاعر یا ادیب بننے کی خواہش کرے تو اسے کامیابی کا درجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اگر وہ ایسا کرے تو اسے کوئی کامیابی کی امید نہیں رکھنی چاہیے اور نہ کامیابی پر کوئی افسوس بھی نہیں ہونا چاہیے۔ اسی طرح ایک گویے کی مثال ہے۔ وہ خواہ گانے اور موسیقی کی تمام تکنیک سے واقف ہو مگر ریڈیو گلیے یا خوش آواز کی عدم موجودگی میں وہ لوگوں کو محفوظ نہیں کر سکے گا۔ اس لئے وہ عام اصطلاح میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ لیکن جہاں تک اس کی اپنی ذات کا تعلق ہے۔ اسے کامیابی حاصل ہے کیونکہ وہ تکنیک کا ماہر ہے۔ اور اس علم کو وہ موسیقی کی طرز میں اختراع کرنے میں استعمال کر سکتا ہے۔ اور ناموری حاصل کر سکتا ہے۔ مگر خود کامیاب گویا نہیں بن سکتا۔ اگر قدرت نے اسے آواز عطا نہیں کی۔ آواز قدرت کا عطیہ ہے۔ گانے کا علم اپنی محنت سے حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح شاعرانہ مذاق قدرت کا عطیہ ہے۔ ایک قدرتی جرنیل۔ لیڈر سائنسدان۔ شاعر یا ادیب کا درجہ اس سے کہیں زیادہ بلند ہوتا ہے۔ جو صرف محنت کے بل بوتے پر پروان چڑھے۔ اس لئے پہلا اصول یہ ہے کہ خواہشات اور قدرتی صلاحیتوں میں امتیاز کیا جائے۔ خواہشات کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ انسان پرندوں کی طرح پر لگا کر نہیں اڑ سکتا۔ مگر سوائی جہاز میں بیٹھ کر پرندوں پر سبقت لیجا سکتا ہے۔

اس لئے اچھی شخصیت کھنڈے یعنی بے جہاں حصول ناممکن ہو۔ اس سے نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ کامیابی کا انحصار

قدرتی صلاحیت پر ہے۔ ہر شخص ایک خاص حد تک کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ ایک کمزور انسان اپنی جسمانی قوتوں کے مطابق صحت کو بہتر بنا سکتا ہے اگر وہ سینڈ ویا گاماں پہلوان بننا چاہے تو اس کی یتنگ و دو غیر ممکن ہے۔ کیونکہ یہ اس کا قدرتی حق نہیں ہے۔ اس کی کامیابی کی ایک حد مقرر ہے جس سے آگے بڑھنے کی خواہش اس کا حق نہیں ہے۔ اس لئے خواہش کو حق تصور نہ کرو۔ اپنے بچوں کی صحت آپ بہتر بنانے کے خواہشمند ہیں تو اس آدرش کے حصول کے لئے لازمی امر یہ ہے کہ تمہاری اپنی صحت بہت اچھی ہو۔ اور بیوی کی صحت بھی اچھی ہو۔ اس طرح بچوں کی قدرتی صحت کی امید کر سکتے ہو اور پھر انکی صحت کو اور بہتر بنا سکتے ہو۔ نیلسن اسی طرح بہتر بنائی جاسکتی ہیں۔ تمہارے آبا و اجداد اگر صحت کا خیال نہیں رکھتے تھے تو اس کا نامہیں بھی بھگتنا پڑتا ہے۔ اس لئے کوشش فرض ہے جو کامیابی حاصل ہو سکتی ہے وہ جائے گی۔ اس سے زیادہ نہیں۔ اسی طرح تم بھی دولت مند ہو سکتے ہو۔ بیکراک فیلڈ نظام حیدر آباد نہیں بن سکتے۔ کیونکہ کامیابی کا انحصار چار باتوں پر ہے۔ تم

(۱) قدرتی صلاحیت۔

(۲) موافق حالات اور ماحول۔

(۳) حالات یا ماحول کو موافق بنانے کے امکانات

(۴) محنت یعنی موافق ماحول وغیرہ سے استفادہ

کامیابی قدرت کا عطیہ نہیں ہے۔ قدرت صرف قوت اور صلاحیت عطا کرتی ہے۔ اسے نشو و نما دینا۔ موافق حالات سے استفادہ کرنا۔ محنت سے حالات کو اپنے موافق بنانا اور قدرتی قوت پر جلا کر نا انسان کی اپنی جدوجہد ہے اور اسی پر کامیابی کے مدار کا انحصار ہے۔ اس روشنی میں یہ مسئلہ یہ صورت اختیار کر لیتا ہے۔

(۱) پہلے اپنی قدرتی صلاحیتوں کا جائزہ لو۔ یہ آگہی حاصل کرو کہ قدرت تم سے ک

کام لینا چاہتی ہے؟ کیا کام تم بہترین طور پر سر انجام دے سکتے ہو؟ کس پیشہ شغل یا کام میں نہیں زیادہ سے زیادہ کامیابی حاصل ہو سکتی ہے؟

(۲) اس سوال کا جواب پالینے پر اگلا قدم یہ ہے کہ موافق حالات سے پوری طرح فائدہ اٹھایا جائے۔ ناموافق حالات کو موافق بنانے کا طریق سوچا جائے۔ اور امر کافی موافق ماحول کو زیر استعمال لایا جائے۔ تمہارا ناموافق حالات سے استفادہ کرنا اس امر کی بات ہے کہ تم موافق حالات سے بہت فائدہ اٹھا سکو۔ اگر تم نے موافق حالات سے بے فائدہ نہ کیا، اٹھایا تو پھر یہ فائدہ تصور ہے۔ اپنے گریبان میں منہ ڈالو اور ایمان داری سے ان سوالوں کا جواب دو۔

(۱) کیا تم نے اپنی قدرتی قوتوں اور صلاحیتوں کو عملی جامہ پہنایا ہے؟

(۲) کیا تم نے موافق ماحول سے کوئی استفادہ کیا ہے؟ یا پوری طرح اپنے ذرائع کامیابی کو استعمال میں لائے ہو؟

اس کا جواب یقیناً نفی میں ہو گا۔

”بے شک پوری طرح نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”اس لئے مکمل طور پر اپنے آدرش کے حصول کے لئے جدوجہد کرو۔ اس بات کی پروا مت کرو۔ کہ کامیابی کس درجہ تک حاصل ہوگی۔ وقت اس کا فیصلہ کرے گا۔ تمہارا کام کامیابی کی طرف قدم بڑھانا ہے۔ ایسے بھی حالات پیدا ہو سکتے ہیں کہ کامیابی خود تمہارے قدم چوم لے۔ تمہارا آدرش تمہارے پاؤں میں آگرے۔ سب کچھ ممکن ہے۔ مگر تمہارا فرض صرف جدوجہد کرنا ہے۔ خواہ آدرش کا حصول غیر ممکن ہو۔ پھر بھی تمہاری جدوجہد ایک کارنامہ بن کر دلوں میں یاد رہے گی۔ محنت کبھی برباد نہیں ہوتی۔ کامیابی کا ایک نہریں گہ یاد رکھو اور اس پر عمل پیرا ہو جاؤ۔ کبھی امید کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دو۔ جو کچھ دوسرے انسان کر سکتے ہیں تم بھی کر سکتے ہو۔ محنت کبھی نہ ہارو۔ کامیابی تمہارے قدم ضرور چومے گی۔ اپنی قوتوں پر کامل اعتماد اور قوت ارادی ایسی صفات ہیں۔ جو ہر آدرش کا حصول ممکن بنا دیتی ہیں۔ ہر خواہش کی تکمیل کر سکتی ہیں بشرطیکہ محنت، محنت اور استقلال سے کام لیا جائے۔ احساس کمتری تمہارے راستے میں زبردست رخنہ ہے۔ تمہاری کامیابی کے حصول میں

سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہے کہ تم اپنے آپ کو کمزور سمجھتے ہو۔ دوسروں سے اپنے آپ کو کمتر تصور کرتے ہو۔ یہ خیالات تمہارا حوصلہ سیت کر دیتے ہیں۔ تم مصائب کا مقابلہ کرنے سے گھبراتے تو نہیں مگر تمہیں تشویش ضرور رہتی ہے۔ کسی کی پروا مت کرو۔ اپنے آورش کے حصول کے لئے جان لٹا دو۔ تم کسی سے کم نہیں ہو۔ قدرت نے تمہیں بھی قوت اور صلاحیت بخشی ہے۔ ان کو بروئے کار لاؤ جو موافق حالات اور ماحول سے ہر ممکن استفادہ حاصل کر چکی سہی کرو۔ ناموافق حالات کو موافق بناؤ۔ اپنی تکمیل خودی کے راستے میں جس چیز کو رکاوٹ سمجھو اسے ہٹو کر سے ہٹا دو۔ آگے بڑھتے چلو۔ آگے بڑھتے چلو۔“

دوسرے دن میں نے ملازمت سے استعفیٰ اورے دیا۔ اب میں بھی آزاد تھا۔

آٹھواں باب

دولت - سرمایہ اور مزد و محنت

مابیکل - ابتدائی انسان کی ضروریات زندگی غذا - چند کھالیں اور ایک غارتگ محدود تھیں تہذیب کی ترقی کے ساتھ اس کی روزانہ ضروریات بھی بڑھتی گئیں۔ آج کے انسان کے لئے صرف زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے ابھی غذا - طبوسات - ودائیاں - مکان - فرنیچر - برتن - کتابیں - تصاویر - ریڈیو - موٹر ایسی ضروریات کی طلب ہے۔ یہ تعیش نہیں انسان کی ذہنی ترقی کے لحاظ سے یہ راحیں ضروریات کا درجہ حاصل کر چکی ہیں! ابتدا میں ایسی راحیں میسر نہیں تھیں۔ اس لئے انسان کی ضروریات بڑی محدود تھیں۔ لیکن جب انسان نے آوارہ اور شکاری زندگی کو ترک کر کے کھڑوں میں سکونت اختیار کر لی اور ہڈبانہ سماجی زندگی بسر کرنی شروع کر دی تو اس کی ضروریات میں اضافہ ہو گیا۔ ابتدا میں ہر انسان اپنی تمام ضروریات روزانہ خود پیدا کر لیا کرتا تھا مگر ضروریات کی کثرت نے اسے کچھ اور ذریعہ اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ وہ اکیلا زمین کی کاشت نہیں کر سکتا تھا۔ غذا کا انتظام نہیں کر سکتا تھا۔ کپڑا نہیں بن سکتا تھا۔ مکان تعمیر نہیں کر سکتا تھا۔ فرنیچر اور برتن تیار نہیں کر سکتا تھا۔ ان راحوں سے وہ دست کش بھی ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اور اکیلے تمام راحوں کو جتایا کرنا بھی اُس کے لئے محال تھا۔ اس لئے جب جموں اور جموں پٹیوں نے مکافوں اور عمارتوں کی صورت اختیار کی آبادیاں - بستیوں - دیہاتوں اور شہروں میں تبدیل ہوئیں

اس وقت ہر انسان نے کوئی نہ کوئی پیشہ اختیار کر لیا۔ وہ ایسی چیز پیدا کرتا تھا جس کی دوسرے انسانوں کو ضرورت ہو۔ اور اس طرح اپنی ضرورت کی چیز کے بدلے میں وہ اپنی پیدا کردہ اشیاء کو دوسرے کے حوالے کر دیتا تھا۔ یہ تھا طریق تبادلہ۔ یعنی ایک کسان جس کے پاس غلہ یا بھیر بکریاں تو موجود تھیں۔ مگر کپڑے جوتے یا برتن نہیں تھے۔ وہ ایسے شخص کی تلاش میں مصروف رہتا تھا۔ جس کے پاس اس کی اپنی ضرورت کی چیزیں موجود ہوں۔ یہ بھی مشکل یہ پیدا ہوتی تھی کہ دوسرے شخص کو غلہ یا بھیر بکریوں کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ پھر تبادلہ کیسے ہو؟ اس وقت کو رفع کرنے کے لئے غلہ شے تبادلہ ٹھہرایا گیا۔ یعنی غلہ وہی فعل سرانجام دیتا تھا۔ جو موجودہ زمانہ کے سکتے۔ نوٹ اور چیک وغیرہ اس طریق کار سے ایک شخص اپنی اجناس کو مارکیٹ میں لے جاتا تھا۔

”اجناس کا مطلب کیا ہے۔ اس کی وضاحت فرمائیے“ میں نے کہا۔

مابیکل۔ ”اجناس ان تجارتی اشیاء کا نام ہے۔ جو کسی انسانی ضرورت کو پورا کرتی ہیں۔ یہ ضرورت کسی طریق سے پوری ہو اس سے غرض نہیں۔ مثلاً ایک روٹی ہماری بھوک کی تسکین بالواسطہ عمل میں لاتی ہے۔ مگر ایندھن۔ تو۔ پانی۔ آٹا گوندھنے کا برتن اسی ضرورت کو بلاواسطہ تسکین دینے میں مدد دیتے ہیں۔ جس حد تک کوئی جنس یا تجارتی شے کارآمد ہو سکتی ہے۔ اس کی اتنی ہی قدر ہوتی ہے۔ اس لئے قدر کا انحصار کارآمد ہونے پر ہے ہر چیز اپنی مخصوص قدر کی مالک ہے۔ اجناس کی قدر غالباً قیمت سے ظاہر کی جاتی ہے جتنی قدر کسی جنس کی زیادہ ہو اتنی ہی قیمت اس کی زیادہ ہوتی ہے۔ جب قدر کم ہو جاتی ہے قیمت بھی گر جاتی ہے۔ قدر کا موازنہ کرتے وقت ہم صفت کو ملحوظ رکھتے ہیں قیمت کا موازنہ کرتے وقت ہم تعداد کا خیال رکھتے ہیں۔ اس تبادلہ کی قیمت کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً اتنے گز ریشم کا کپڑا اتنے رول کو مل سکتا ہے۔ فرض کرو ایک شخص کے پاس بیس گز ٹمبل ہے۔ اس کی قیمت دس روپے ہے۔ وہ فروخت کرنے کے بعد دس روپے کا مالک بن جاتا ہے۔ اسے مطالعہ کا شوق ہے۔ اس لئے وہ دس روپے میں

ایک کتاب خرید لیتا ہے۔ تبادلہ یوں مختصر طور پر بیان کیا جاسکتا ہے۔

جنس سکے جنس

یعنی پہلے اس شخص کے پاس بیس گز ملل تھی۔ اب ایک کتاب ہے۔ قدر قیمت کے لحاظ سے دونوں اجناس یکساں ہیں۔ مگر کار آمد ہونے کی صورت مختلف ہے۔ سکے صرف تبادلہ کا ذریعہ ہوا۔ دراصل اس معاملہ کی صورت اتنی ہے جنس کے بدلے جنس۔ یعنی خریدنے کی خاطر فروخت کرنا۔ یہ اجناس کا کاروبار ہے۔ مگر اس کے علاوہ ایک دوسرے قسم کا کاروبار بھی ہے۔ یعنی فروخت کرنے کے لئے خریدنا۔ ایک شخص سو روپے کا مالک ہے۔ وہ سو گز گرم کپڑا خریدتا ہے۔ اور پھر اس کپڑے کو فروخت کر دیتا ہے۔ اگر وہ سو روپے میں ہی فروخت کر دے تو اس کا یہ فعل بیسود ہے۔ اس لئے وہ منافع پر فروخت کرتا ہے۔ فرض کرو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سو روپے کے ایک سو دس روپے بن جاتے ہیں اس کاروبار کی صورت یہ ہوتی۔ سکے جنس سکے جمع منافع۔

تبادلہ اجناس کا مقصد صرف ضروریات کو پورا کرنا ہے۔ کتاب اور کپڑا دونوں استعمال میں آئے اور یہ تجارت مکمل ہو گئی۔ مگر سو کے ایک سو دس بنانے والا شخص سکے کو نہ کھا سکتا ہے نہ پہن سکتا ہے۔ سکے بالواسطہ تو کوئی انسانی ضرورت پوری نہیں کر سکتا اس کا فائدہ اسی صورت میں ہے جب وہ اس سے اجناس خرید کر استعمال میں لائے یا ایک سو دس کا پھروہی چکر شروع کر دے اور ایک سو دس کے ایک سو بیس بنا ڈالے۔ اس طرح روپیہ سرمایہ میں تبدیل ہوتا ہے۔ یہ منافع ہی ایسی مد ہے جو روپیہ یا سکے کو سرمایہ میں بدل دیتا ہے۔ اسی طرح سکے بالواسطہ سود کے منافع کی صورت میں بھی سرمایہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ تمام اجناس میں ایک جزو باہم ہے اور وہ ہے محنت کی پیداوار۔ اسی محنت پر قیمت کا انحصار ہے قیمت محنت کے اظہار کی صورت ہے۔ سونا چاندی وغیرہ قیمت کی صورتیں ہیں۔ اور مہذب انسانوں میں ہی کام دے سکتی ہیں کسی صحرا یا جنگل میں سونا چاندی اور جواہرات کسی کام نہیں آسکتے۔ ان سے بھوک پیاس اور دوسری

انسانی ضرورتیں پوری نہیں ہو سکتیں۔ جہاں کوئی آبادی نہ ہو وہاں رہن سہن کر دوسو کی طرح اپنی ضروریات زندگی اپنی محنت سے پیدا کرنا ہونگی۔ نتیجہ یہی نکلا کہ محنت سے اجناس پیدا ہوتی ہیں۔ جو کچھ زمین کے اُدیر سے یا مدفون ہے۔ وہ محنت سے حاصل ہوتا ہے۔ اجناس کو ہم دولت سے موسوم کرتے ہیں۔ دولت کا مطلب صرف سونا۔ چاندی۔ زمین یا جائیداد نہیں ہے۔ ایک حسین عورت حسن کی دولت سے الامال ہوتی ہے۔ اس جنس کی قدر و قیمت بے پناہ ہے۔ اسی طرح علم و فن بھی دولت میں شمار ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے ایک مہذب سماج میں انسانی ضروریات کی تکمیل کے دو ہی ذرائع ممکن ہیں۔ ایک دولت دوسری محنت۔ پہلے دولت کو لیجئے۔ دولت یا سرمایہ کا فارمولا میں بتا چکا ہوں یعنی سکھ..... جنس..... سکھ بمع منافع۔ سرمایہ کے زیرِ تخت زر۔ زمین۔ جو اسرات۔ جائداد۔ کارخانے۔ مشینیں وغیرہ آتی ہیں۔ اس سرمایہ کی بدولت اجناس کی پیداوار کی جاتی ہے اور پھر ان اجناس کو منافع پر فروخت کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح سرمایہ میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یا سود منافع کی صورت میں بڑھتا چلا جاتا ہے اس طرح سرمایہ دار اپنے پیچھے اتنی دولت چھوڑ جاتا ہے۔ جو اس کے پیمانہ گان کو عیش و راحت مہیا کر سکتی ہے۔ سرمایہ داری کا روبرو بار کا اصول یہی ہے کہ جنس کو زیادہ منافع پر فروخت کر دیا جائے۔ یہی منافع دولت کو سرمایہ میں تبدیل کرتا ہے۔ سرمایہ کا مفہوم ذہن نشین کر لیجئے۔ فقط دولت کا مالک ہونا سرمایہ داری نہیں ہے۔ فرض کر دو ایک شخص راغب کہ دوسو کی طرح ایک جزیرہ میں آباد ہو جاتا ہے۔ اپنی محنت سے وہ ایک مکان۔ فرنیچر۔ بھیر بکریاں۔ کھیت و باغات وغیرہ کا مالک بن جاتا ہے تو اس صورت میں وہ دولت مند کہلا سکتا ہے۔ مگر سرمایہ دار نہیں۔ سرمایہ دار اس صورت میں بنے گا۔ جب وہ دوسرے انسانوں سے کام لیکر ان کی محنت کی پیداوار کو اپنی لاگت سے زیادہ قیمت پر فروخت کرے گا اور منافع اپنی جیب میں ڈالے۔ سرمایہ دار کا روبرو بار کی تین صورتیں ہیں (۱) اجناس سے بالواسطہ منافع حاصل کرنا مثلاً جائداد کا

کرایہ مصنوعات یا انسانی راحتوں کے سامان کی پیدائش وغیرہ (۳) پیدا کردہ اجناس کو خرید کر منافع پر فروخت کرنا۔“

انصر۔ اس کا مطلب یہی ہوا کہ سرمایہ داری کے درجے ہیں۔ اور چھوٹے سے لیکر بڑا کاروبار کرنے والا سرمایہ دار کہلا سکتا ہے۔“

مائیکل۔ بیشک مگر فرق صرف یہ ہے کہ ایکلاؤکاندار جو اجناس خرید کر منافع پر فروخت کرتا ہے۔ وہ سرمایہ داروں میں شامل ہیں ہے منافع اس کی محنت کا صلہ ہے جو وہ اجناس مہیا کرنے کے سلسلے میں کرتا ہے۔ اسی طرح کوئی خواجہ والا بھی سرمایہ دار نہیں کہلا سکتا جو اجناس فروخت کرتا پھرتا ہے۔ اگر یہی خواجہ والا یا دکاندار ایکٹ ملازم رکھ لے۔ انکی محنت سے جو آمدنی پیدا ہوتی ہے۔ اس سے کہیں کم ان کو اجرت دے تو وہ سرمایہ داروں کی فہرست میں شامل ہو جائے گا۔

انصر۔ اچھا تو پھر مزدور کون ہوا؟ اور مزدور محنت کا سرمایہ سے کیا رشتہ ہے؟

مائیکل۔ محنت سے مراد تمام جسمانی اور ذہنی قوتوں کا استعمال ہوتا ہے۔ ان قوتوں کو اپنے ذاتی کام میں صرف کرنا مزدوری نہیں کہلاتا۔ اپنی ضروریات کو پورا کرنے میں جو محنت صرف ہوتی ہے۔ وہ اس محنت سے مختلف ہے جو دوسرے کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کی جاتی ہے کسی دوسرے انسان کی بلا عوض خدمت یا ضرورت پورا کرنا بھی مزدوری کے تحت میں نہیں آتا۔ انسان مزدور اسی صورت میں کہلاتا ہے جب وہ دوسرے انسان کے لئے اجرت پر محنت کرے۔ اپنی ضروریات کے لئے خود اجناس کی پیداوار کرنا مزدوری نہیں کہلائی جاسکتی اور اس کی محنت کی پیداوار بھی اجناس نہیں کہلاتی ایسی اجناس بھی ہیں جو بچہ قدر قیمت رکھتی ہیں۔ مگر وہ بالکل مفت دستیاب ہوتی ہیں مثلاً ہوا۔ پانی۔ کنواری زمین اور جنگلات وغیرہ۔ ان پر کوئی انسانی محنت صرف نہیں ہوتی۔ مگر ان کی کارآمد قیمت کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اجناس کہلانے کیلئے ضروری ہے کہ کوئی جنس یا تجارتی شے تبادلاً کے قابل ہو جو چیز کسی کے کارآمد نہیں

ہو سکتی۔ وہ جنس کہلانے کی مستحق نہیں ہوتی۔ اور جو محنت اس پر صرف ہوتی ہے۔ وہ بیکار جاتی ہے۔ اور یہ محنت مزدوری نہیں کہلا سکتی کسی جنس کی قدر و قیمت اسی لئے ہوتی ہے کہ اس کی پیدائش میں محنت صرف ہوتی ہے۔ مزدوری کی پیدائش وقت کے لحاظ سے ہی ہو سکتی ہے۔ مثلاً کسی جنس کے تیار کرنے میں چھ گھنٹے صرف ہوئے۔ یہاں ایک اوسط انسانی قوتِ عمل کا ذکر ہے۔ فرض کرو کوئی شخص ایسی مشین ایجاد کرتا ہے۔ جو اسی چیز کو دو گھنٹے میں تیار کر سکتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ لاٹھ سے کام کر نیوالے کو تین گنا وقت صرف کرنا ہوگا اور اس کی پیدا کردہ جنس کی قیمت ایک تہائی رہ جائے گی۔ سرمایہ دار تجارتی اشیاء کی تیاری کے لئے جن اجناس کو خریدتا ہے انہیں اسی قیمت پر فروخت نہیں کر سکتا۔ یہ نفع وہ کس طریق سے حاصل کرتا ہے ایک غور طلب بات ہے۔ سرمایہ دار ایک ایسی جنس کا طالب ہوتا ہے۔ جو کارآمد ہونے کے علاوہ منافع کی موجب بھی بن سکے۔ اور وہ جنس ہے انسان کی قوتِ عمل یعنی مزدوری۔ سرمایہ دار اور مزدور کی مارکیٹ میں اس طرح ملاقات ہوتی ہے۔ ایک قوتِ عمل خریدنی چاہتا ہے۔ دوسرا بچنی چاہتا ہے مزدور اپنی قوتِ عمل ایک مخصوص وقت کے لئے فروخت کرتا ہے۔ اگر تمام عمر کیلئے ایسا کرے تو مزدور نہیں رہتا بلکہ غلام بن جاتا ہے۔ وہ جنس کا مالک کہلانے کی بجائے خود جنس میں مبدل ہو جاتا ہے۔ اس لئے سرمایہ دار مزدور کی قوتِ عمل خریدتا ہے۔ نہ کہ مزدور کی خودی۔ اگر کسی مزدور کے پاس سرمایہ نہیں تو وہ اپنی قوتِ عمل کے ذریعے اجناس کی پیدائش نہیں کر سکتا۔ اس لئے اسے سرمایہ دار کے پاس اپنی قوتِ عمل فروخت کرنی پڑتی ہے۔ یہ قوتِ عمل مزدور کی اپنی جنس ہے جس کا وہ مالک ہے۔ اس جنس کی بھی باقی اجناس کی طرح ایک قیمت مقرر کرنا لازمی ہے۔ ورنہ اس کی خرید و فروخت کیسے عمل میں لائی جاسکتی ہے۔ یہ بھی اسی طریق پر مقرر کی جاتی ہے۔ جیسا کہ تمام دیگر اجناس کی قیمت وقت کی پیدائش کے ذریعے مقرر کی جاتی ہے۔ قوتِ عمل کی جنس اسی لئے کارآمد ہے۔ کیونکہ اس کا مالک ایک جاندار چیز ہے۔ اور ایک جاندار چیز کی زندگی برقرار رکھنے

کے لئے چند ضروریات بہت اہم ہیں مثلاً غذا۔ کپڑے۔ جائے رہائش وغیرہ۔ ان ضروریات کی مجموعی قیمت مزدور کی قوتِ عمل کی قیمت مقرر ہو سکتی ہے۔ یہ قیمت یا اجرت اتنی ہونی چاہیے جو مزدور کی صحت کو بحال رکھے تاکہ وہ تندرست رہ کر کام میں ہر روز مصروف رہے۔ مختلف ملکوں میں مختلف معیارِ محنت اسی بنا پر مقرر ہیں۔ اس کے علاوہ اجرت میں اتنی گنجائش بھی ضروری ہے کہ یہ قوتِ عمل خفا نہ ہو کیونکہ مزدور کسی نہ کسی دن بوڑھا ہو جائے گا اور مر جائے گا۔ اس لئے سرمایہ دار کی بہبودی اسی میں ہے کہ وہ مزدور کی نسل کو برقرار رکھے۔ مزدور کی اولاد اس قوتِ عمل کو جاری رکھے گی۔ مزدور کی اجرت اس قدر ہو کہ وہ شادی کر سکے اور بچے پیدا کرنے کے بعد ان کی پرورش کر سکے۔ ایک کاریگر مزدور حاصل کرنے کے لئے اجرت میں تعلیمی اخراجات بھی شامل ہونگے۔ فرض کرو یہ تمام ضروریات مزدور کو دو روپے روزانہ اجرت دینے سے پوری ہو سکتی ہیں۔ یہ دو روپے مزدور کی قوتِ عمل کی قیمت ہونگے فرض کرو مزدور چھ گھنٹے کام کرتا ہے اور دو روپے کی قیمت کے برابر اجناس تیار کر دیتا ہے۔ یعنی جتنی اجرت اس کو ملتی ہے۔ اتنی قیمت کی تجارتی اشیاء تیار کر دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ تبادلہ اجناس ہے مزدور اپنی مزدوری کی جنس کے بدلے جنس تیار کر کے دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح بیس گز ٹمبل کے عوض ایک کتاب حاصل ہوتی تھی۔ مگر اس تبادلہ اجناس سے سرمایہ دار کو نہ کوئی نقصان پہنچا اور نہ نفع حاصل ہوا۔ یہ بھلا سرمایہ دار کیسے گوارا کر سکتا ہے۔ فرض کرو سرمایہ دار مزدور سے چھ گھنٹے کی بجائے آٹھ گھنٹے کام لیتا ہے۔ اُسے آٹھ گھنٹے کام کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ان دو گھنٹوں کی محنت کا صلہ مزدوری کی بجائے سرمایہ دار کو ملے گا یہی وہ راز ہے جو سرمایہ دار کی دولت میں اضافہ کا باعث ہوتا ہے۔ منافع اسی طریق پر پیدا کیا جاتا ہے۔ اس لئے سرمایہ دار جتنے گھنٹے فالتو کام لے سکتا ہے لینے کی کوشش کرتا ہے۔ سرمایہ دار مصنوعات وغیرہ اسی مقصد کے پیش نظر بناتا ہے۔ اسے اجناس کی پیدائش سے اسی لئے دلچسپی ہے کہ وہ منافع کا موجب ہونگی۔ وہ فروخت کرنے کیلئے

تجارتی اشیاء بناتا ہے۔ جو اجناس ان تجارتی اشیاء کی تیاری میں صرف ہوئی ہیں۔ ان کی مجموعی قیمت سے کہیں زیادہ قیمت، وہ حاصل کرنی چاہتا ہے۔ منافع تو اسی صورت سے حاصل ہوگا۔ اس لئے مزدور کو کم سے کم اجرت دینا اور نفع زیادہ سے زیادہ حاصل کرنا سرمایہ داری کا اصول ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ قوت عمل کی جنس سے منافع حاصل کرنے کا حق مساویہ دار کو کیسے پہنچتا ہے؟ صرف یہی جنس ہے جو منافع کا باعث ہو سکتی ہے۔ تمام اجناس کی قدر و قیمت کا انحصار اسی قوت عمل پر ہے۔ سرمایہ اور مزدور کا مسئلہ یہ صورت اختیار کر لیتا ہے (۱) معاشی زندگی میں سرمایہ اور مزدوری دونوں لازم و ملزوم ہیں حکومت اگر تمام کاروبار اپنے قبضے میں لے لے تو عوام کی آزادی سلب ہو جاتی ہے۔ (۲) اگر حکومت کوئی مداخلت نہ کرے تو باہمی مقابلہ جنگ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ سرمایہ دار مزدور کی موت بھی نہیں چاہتے۔ مگر اسے پوری طرح زندہ دیکھنا بھی نہیں چاہتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ مزدور سرسکتا رہے۔ کام بھی کرنے کے قابل ہے مگر اتنی قوت حاصل نہ کر سکے کہ مقابلے کے لئے سر اٹھا سکے۔ اسی طرح طاقتور اقوام بھی یہی خواہش کرتی ہیں کہ وہ کمزور اقوام سے فائدہ اٹھاتی رہیں۔ ان کو زندہ درگور بننے دیں۔“

انصر۔ ”تو اس معاشی مسئلہ کا حل آپ کے خیال میں کیا ہو سکتا ہے؟“
 مائیکل۔ ”سرمایہ اور مزدوری کی جنگ موجودہ زمانے میں ایک اہم مسئلہ بن چکی ہے۔ میری تحقیق یہ ثابت کرتی ہے کہ کارل مارکس نے جو حل پیش کیا ہے وہ نہایت مناسب اور احسن ہے۔“

انصر۔ ”اس حل کی وضاحت فرمائیے۔“
 مائیکل۔ ”میں اختصار سے کام لیکر سوشلزم کی روح رواں سے آپ کو آگاہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ پہلا قدم یہ ہے کہ اجناس کی پیدائش کے تمام ذرائع حکومت کے ہاتھوں میں سونپ دیئے جاتے ہیں۔ دوسرا قدم یہ ہے کہ پیدائش کے طریق کار میں تنظیم عمل میں لائی

جاتی ہے جس میں دو بنیادی اصول ہیں۔ ان کی میں اب وضاحت کروں گا۔ سرمایہ دارانہ نظام میں اجناس کی پیدائش مارکیٹ میں فروخت اور منافع کی غرض سے کی جاتی ہے کیونکہ مارکیٹ محدود ہوتی ہے۔ اس لئے پیدائش کے ذرائع بھی محدود ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں کروڑوں انسان ایسے ہیں جنہیں تنہا کھانکھنے کے لئے مناسب کپڑا اور جوتے نہیں ملتے۔ غذا نصیب نہیں ہوتی۔ مگر ان چیزوں کی کوئی کمی نہیں۔ آپکو شہروں کے بازار اور دکانیں ان اشیاء سے معمور نظر آئیں گی۔ دوکاندار فروخت کے خواہشمند ہیں مگر سامان سے دکانیں بھری رہتی ہیں۔ کیوں؟ کیا لوگوں کو ان اشیاء کی ضرورت نہیں بیشک ہے۔ مگر وقت تو یہی ہے کہ جنہیں یہ ضروری اشیاء درکار ہیں ان کے پاس خریدنے کے لئے دام نہیں ہیں اور جن کے پاس دولت کے انبار لگے ہوئے ہیں انہیں ان اشیاء کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے مکان اور کوٹھیاں سامان عیش و راحت سے اُٹی پڑی ہیں۔ سڑ پارانہ نظام کا یہ ایک بھاری نقص ہے۔ اجناس منافع کے لئے پیدا کی جاتی ہیں۔ انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے نہیں بنائی جاتیں۔ اگر سرمایہ دار کو ان کی فروخت سے منافع حاصل نہیں ہوتا تو ان کو فروخت کرنے کے لئے وہ آمادہ نہیں ہوتا۔ خود غرضی اسے انسان بننے نہیں دیتی۔ اس کے برعکس اشتراکی معاشی نظام میں اشیاء استعمال کی غرض سے پیدا کی جاتی ہیں۔ منافع مقصود نہیں ہوتا۔ اس لئے تنظیم ممکن ہے۔ فرض کرو ایک لستی میں ایک لاکھ روپے کی مالیت کی اجناس موجود ہیں۔ اس کی آبادی ایک ہزار نفوس ہے تو یہ رقم ان لوگوں میں تو مت عمل اور قابلیت کے معیار کے مطابق تقسیم کر دی جاتی ہے تمام اشیاء کی ایک دائمی قیمت مقرر ہو جاتی ہے۔ آبادی کے تمام بالغ مرد و عورت اکام پر لگا دیئے جاتے ہیں۔ بغیر مزدوری کے کسی کو اجرت نہیں ملتی۔ فرض کرو اس آبادی کو کپڑوں اور جوتوں کی ضرورت زیادہ ہے۔ تو بیشتر افراد ان کی پیدائش پر مامور کر دیئے جاتے ہیں۔ اگلے سال بجائے کپڑوں اور جوتوں کے فرنیچر اور سائیکل وغیرہ کی طرف توجہ مبذول کر دی جاتی ہے۔ اسی طرح جس چیز کی مانگ ہوتی ہے۔ اس کی پیدائش پر

توجہ دی جاتی ہے۔ جس قدر اشیا کی پیدائش زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ اُسی قدر افراد کی تنخواہ وغیرہ میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اجناس کی پیدائش اور ان کی تقسیم میں توازن رکھنا ہی مقصد تنظیم ہے۔ اجناس اشیا کی صورت میں تقسیم نہیں کی جاتیں۔ پیدا کردہ اجناس کی قیمت کے برابر سکتے افراد میں تقسیم کر دیئے جاتے ہیں تاکہ افراد اپنی ضرورت اور پسند کے مطابق اجناس خرید کر سکیں۔ اس طریق سے پیدائش اور کھپت میں ہم آہنگی قائم رہتی ہے۔ یہ صورت پیدا نہیں ہو سکتی کہ جنگ چھڑ گئی تو بیکار لوگوں کو کام مہیا ہو گیا۔ کاروبار میں ترقی ہو گئی۔ اجناس کی قیمتیں کمی گنا زیادہ ہو گئیں۔ اور جنگ کے خاتمہ پر حالات پہلے سے بھی بدتر ہو گئے۔ ایسے اشتراکی نظام میں توجہ کچھ بھی پیدا کیا جاتا ہے وہ تمام افراد کی ضرورت کو پورا کرنے کی غرض سے کیا جاتا ہے۔ کسان گندم پیدا کرتا ہے۔ وہ چار روپے من حکومت کو فروخت کر دیتا ہے۔ حکومت گندم کو دکانداروں کے حوالے کر دیتی ہے۔ عوام ان سرکاری دوکانوں سے چار روپے من گندم اپنی ضرورت کے مطابق خرید سکتے ہیں۔ حکومت کو نفع سے کوئی غرض نہیں۔ کیونکہ حکومت عوام کی ہے۔ اس طریق سے پیدائش کی افزائش کی کوششیں جاری رہتی ہیں۔ اور اس طرح عوام کی زندگی کا معیار بلند ہوتا جاتا ہے مجموعی دولت میں اضافہ افراد کی انفرادی دولت میں اضافہ ہے

التصرُّ۔ اجناس کی تقسیم کس اصول پر مبنی ہے؟ کیا تمام افراد کو برابر حصہ ملتا ہے؟
ماثیکل۔ ”تمام افراد کو مساوی درجہ دینا انصافی ہے۔ کیونکہ اشتراکی نظام سرمایہ دارانہ نظام کی جگہ لیتا ہے۔ اس لئے وہ افراد جو سابقہ نظام میں ایک معزز درجہ رکھتے تھے۔ ان کے لئے مناسب درجہ تجویز کیا جاتا ہے۔ ایک کاریگر اور ایک معمولی مزدور ایک ہی لامٹی سے ہانکے نہیں جاسکتے۔ جو بے انصافی سرمایہ دارانہ نظام میں روا رکھی جاتی ہے وہ اشتراکی نظام میں ہرگز برداشت نہیں کی جاسکتی۔ کارل مارکس نے اس نکتہ کو بالکل واضح طور پر بیان کر دیا تھا کہ تمام افراد کے حقوق یکساں نہیں ہو سکتے۔ انصاف کا دامن کسی حالت میں بھی نہیں چھوڑا جاسکتا۔ سوشل نظام کا فائدہ یہی ہے کہ بغیر محنت کے اجرت

کا حصول ناممکن ہے۔ جو کام نہیں کریگا۔ اسے تنخواہ نہیں ملے گی۔ اس سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ جو شخص سماج کے لئے زیادہ کام سرانجام دیتا ہے یا زیادہ سود مند ثابت ہوتا ہے۔ اس کا معیار زندگی بھی بلند ہونا لازمی ہے۔ اس لئے مزدوری کی اجرت قابلیت اور محنت پر منحصر ہے یہ ممکن نہیں کہ ایک ناقابل اور بد اخلاق انسان اس لئے عیش و راحت کی زندگی بسر کرتا ہے کیونکہ اس کا باپ یا کوئی رشتہ دار بہت دولت مند ہے۔ اس نظام میں یہ ممکن نہیں کہ بیٹھے تو نہ پر ہاتھ پھیرنے رہیں اور بنک میں روپیہ بھی بڑھتا رہے۔ تنخواہ کا یکساں مقرر نہ کرنا اصول متقابلہ کو حرکت میں لاتا ہے۔ ہر فرد قابلیت اور محنت میں سبقت لے جانے کی سعی کرتا ہے اور اس کا صلہ اس کو اجرت کی شکل میں دستیاب ہوتا ہے۔ اس طریقہ سے ہر فرد بہتر سے بہتر بننے کی کوشش کرتا ہے۔ عزت و شہرت کا حصول انسانی فطرت کا زبردست اقتضا ہے۔ ہر فرد کا بہتر بننا سماج کے لئے بیحد سود مند ہے جس قدر عوام کی قابلیت کا معیار بلندی کی طرف رُخ کرے گا۔ اُسی قدر اجناس کی پیدائش میں ترقی ہوگی یعنی عوام میں اجناس زیادہ تقسیم ہوگی اور اس طرح معیار زندگی بلند سے بلند تر ہوتا چلا جائیگا۔ اس لئے یہ خیال بالکل غلط ہے کہ اشتراکی نظام میں ترقی محدود ہوتی ہے اور افراد میں باہمی مقابلہ جاری نہیں رہتا جو ترقی کے لئے از حد ضروری ہے۔ عدم مساوات یا عدم یکسانیت اس لئے ایک ایسا صوبہ ہے جس سے تمام سماج کا معیار زندگی بلند کیا جاسکتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی طرح چند اشخاص کے معیار زندگی کو بلند کرنے کا یہ ذریعہ نہیں بنتا۔ یہ ناممکن ہے کہ چند اشخاص حکومت کریں عیش و راحت کی زندگی بسر کریں اور بیشتر انسان ضروریات زندگی تک کو ترسیں۔

انصر کیا یہ عدم یکسانیت ہمیشہ کے لئے قائم رہے گی؟

ماہیکل۔ اجناس کو قابلیت اور محنت کے مطابق تقسیم کرنا اس امر کا اعتراف کرنا ہے کہ اجناس تمام افراد کی ضروریات کو مساوی طور پر پورا نہیں کر سکتیں جس وقت پیدائش کا معیار اس قدر بلندی اختیار کر لے گا کہ ہر فرد اپنی ضرورت کے مطابق اشیا حاصل کر سکے

اس وقت امتیاز کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہے گی جس وقت یہ آدرش حاصل ہو جائے گا۔ اس وقت تقسیم اجناس کا اصول یہ ہو جائے گا۔ یعنی کام قابلیت کے موافق اور دام ضرورت کے مطابق۔ ہر شخص خوشحال اور دولت مند ہو گا۔ سبھی یکساں طور پر مزدور ہونگے۔ اور سبھی مساوی طور پر دولت مند لیکن سرمایہ دار کوئی نہیں ہو گا۔ اب آپ ہی بتائیے کیا یہ آدرش قابل جدوجہد نہیں ہے؟

انصرؒ پہلے آپ کو اسلام کا معاشی حل پیش کرتا ہوں۔ موازنہ کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچیں گے یہ تو آپ بھی مانتے ہیں کہ سرمایہ اور مزدوری دونوں ایک دوسرے کی بقا کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اسلام نے ایسے ذرائع اختیار کئے ہیں جس سے سرمایہ کی قوت کو ضعف پہنچتا رہے۔ اور مزدور کی اعانت ہوتی رہے۔ میں اختصار سے کام لیکر صرف یہ اصول بیان کر دیتا ہوں (۱) اسلام کا قانون وراثت سرمایہ کی قوت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ ایک دولت مند شخص کی باداد اور ملکیت اس کے بیٹوں اور عیال کے لئے ہے۔ بچوں وغیرہ میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ اس طرح ایک شخص قوت پر قوت نہیں بکڑ سکتا۔ سرمایہ ایک ہی مقام پر ساکن ہونے کی بجائے حرکت کرتا رہتا ہے۔

(۲) اسلام نے سود لینا اور دینا دونوں حرام قرار دیئے ہیں۔ سود کی دسالت سے سرمایہ دار دولت میں اضافہ کرنا چلا جاتا ہے۔ اور غریب لوگ بد سے بدتر حالت کو پہنچ جاتے ہیں۔ ایک انگریز مصنف کا قول ہے کہ کسی حکومت کے خزانے میں اتنا روپیہ نہیں ہوتا کہ وہ بغیر قرض لئے ایک ہفتہ جنگ جاری رکھ سکے۔ اگر سود کی ممانعت ہو جائے تو کوئی شخص حکومت کو بلا سود روپیہ قرض دینے کے لئے آمادہ نہیں ہو گا۔ اور حکومت جنگ کو جاری نہیں رکھ سکے گی۔ اس طریق سے وہ مدعا حاصل کرنا ممکن ہے۔ جو جمہیت لائق نہ کر سکی۔

”انصرؒ موجودہ بنکوں کے سود کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ یہ جانتے ہیں یا ناجانت؟ میں نے پوچھا۔

القصر میری رائے میں یہ سود جائز منافع کی صورت ہے۔ اسلام کا مقصد تو یہی ہے کہ مفلس لوگوں سے سود نہ لیا جائے۔ ان کا حق نہ حج ساجائے مگر بنک کے ادارے تو مفلس نہیں ہوتے۔ وہ لوگوں کے روپے سے کماد بار چلاتے ہیں اور منافع کماتے ہیں اس میں سے ٹھوڑا حصہ وہ لوگوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر بنک فیل ہو جائے تو اس صورت میں سارا یا بیشتر جمع شدہ روپے کا حصہ واپس نہیں ملتا۔ اس لئے اگر نقصان کا احتمال ہے تو نفع لینے کا بھی حق ہے۔ یہ ایک کاروبار کی صورت ہے جس میں نقصان اور فائدہ دونوں ممکن ہیں۔ ماں اگر کوئی شخص اس اصول کا احترام ملحوظ رکھنا چاہتا ہے تو وہ سود کے روپے کو مساکین میں تقسیم کر سکتا ہے یا کسی اور نیک کام میں خرچ کر سکتا ہے۔ مگر بنک سے وصول نہ کرنا اس امر حرام ہے۔ بنک کوئی مفلس شخص نہیں ہے۔ حیرانی ہوتی ہے کہ مذہبی جنون میں اگر لوگ اتنی سیدھی سادی بات کو سمجھ نہیں سکتے۔ خلاہری صورت کو مد نظر رکھتے ہیں مگر اسلام کے اصولوں کی روح رواں کو جاننے کی کوشش نہیں کرتے۔ اچھا تو اس کے بعد اسلام نے تیسرا قدم اس سلسلہ میں یہ اٹھایا ہے کہ سونا پاندی اور جواہرات کو جمع کرنے سے منع کیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ سکہ حرکت میں رہے۔ دولت ایک جگہ قیام کرنے نہ پائے۔ امریکیں سولے چاندی کے انبار لگے ہوئے ہیں مگر بیکاری کا اندھا د نہیں ہو سکا۔ ایک امریکی صنعت کا قول ہے کہ بیکاری کی وجہ یہی ہے کہ یورپ اور ایشیا کے عوام کے پاس اس قدر سونا اور چاندی باقی نہیں رہا جس سے وہ امریکہ سے مال خرید سکیں۔ مال کا نکاس بند ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ کانٹا نہ بند رہے اور مزدور بیکار ہو جائیں۔ اسی لئے اسلام دولت کو تجارت میں لگانے پر نہ دیتا ہے اور سود کو حرام قرار دیتا ہے۔

(۴) ان کے علاوہ اسلام نے ایک عملی طریق بھی اختیار کیا ہے اور وہ ہے زکوٰۃ کا ادا کرنا۔ اس قانون کے مطابق جس شخص کے پاس سالت تو لے سونا یا باون تو لے چاندی پانچ سو یا تیس گائیں ہوں اس کے مالک کو مجموعی قیمت کا چالیسواں حصہ بطور زکوٰۃ

اور گناہوں کے بشرطیکہ یہ اشیاء ایک سانچہ تک اس کی ملکیت میں چلی جوں۔ اب ذرا اس
 قانون پر غور فرمائیے۔ فرض کرو ایک شخص کے پاس چالیس سہرا۔ وہ بچے جمع ہیں۔ وہ ان کو
 تصرف میں نہیں آتا۔ اگر ہر سال اسے چالیسواں حصہ دینے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ یقیناً اس
 کے بڑے بچے تک یہ رقم قریب الاختتام ہو جائیگی۔ اسی طرح سونا چاندی اگر زیورات اور
 برتنوں کی صورت میں ہو تو بھی ہر سال زیورات کی رقم ادا کرتے کرتے زکوٰۃ کی مستم
 اس قیمت سے زیادہ ہو جائے گی۔ اس لئے پس انداز کی ذرہ مضیبت نہیں ہو سکتی
 ایسی زیورات کی رقم حکومت ایک علیحدہ مد کے طور پر جمع رکھتی ہے۔ جو منسلک و نادار
 اور مستحق دونوں تقسیم ہو ہی جاتی ہے۔ اس طرح اسلامی سانچے میں کوئی غفلت نہیں رہ
 سکتی یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ اگر نہ غفلت و امان۔ لوگوں کی جائز عور پر امانت نہیں
 کرتے تو وہ لوگ چوری و دزدانہ ذنی پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہیں پولیس ان کو گرفتار کرنے
 کے لئے متنبیوں کو ذی پرتا ہے نہ صحت اور کا فیصلہ کرنے پر مامور کرنے پڑتے ہیں۔ اور
 یہاں ان کو مجبور رکھنے کے لئے تعمیر کرنا پڑتی ہیں۔ یہ تمام الزامات ظاہر ہیں کہ وہ متذکر
 کی وجہ سے پورے کئے جاتے ہیں۔ اس لئے کیا یہ مناسب اور بہتر نہیں کہ زکوٰۃ خوشی
 سے ادا کی جائے۔ ورنہ حکومت ٹیکس بگاڑ چیل وغیرہ کے اختراعات سے شہ و دیہہ فراہم
 کرنے پر مجبور ہو جی۔ اسی طرح خوش قسمت لوگ کہ نصیب لوگوں کی اعانت کر سکتے ہیں۔ اور
 ان کی محبت اور تمکیر کے حقدار ہو سکتے ہیں۔ کیوں سعید آپ نے کیا نتیجہ اخذ کیا ہے
 بالکل ضد گنتی کہنا۔

سمعیہ و دونوں فنون کے مقاصد تو ایک ہی معلوم ہوتے ہیں یعنی سربازہ اور مزدوری
 میں توازن قائم رکھنا۔ فرق صرف طریقوں میں ہے۔ اس واسطے اس توازن کو قائم کرنے کا
 انتیاء فراوان ہوتا ہے سوچتا ہے۔ ان کو فرض سے آگاہ کرتا ہے۔ اپنے احکام پر
 عمل پیر ہونے کی تلقین کرتا ہے۔ مگر دنیا کا تجربہ اور شاہدہ یہی کہتا ہے کہ انسان غرض
 سے اور دنیا سے سب سے زیادہ رکتی و راکت ہے تو دوسروں کی بہبود کا خیال پس پشت

قول دیا جاتا ہے بہت جواز خیرات سے کم دیا جاتا ہے خیرات ایک غیر انصفانہ فعل ہے جس کے متعلق مائیکل نے مفصل گفتگو کی تھی حکومت کو ان خیرات کرنی چاہیے اور لوگوں کو مفلس، نادار لوگوں کی تعداد پر مجبور کرنا چاہیے اسلئے حکومت ہزاروں کو زکوٰۃ کی ادائیگی وغیرہ پر مجبور کر سکتی ہے۔ حکومت ہی یہ کام سر انجام دے سکتی ہے۔ نایم گواہ ہے کہ جب لوگوں کی پسند پر کوئی بات چھٹوس جاتی ہے تو خود غرضی بنائیں اس کی راہ میں عامل ہو جاتی ہے اس لئے شوشان میری رائے میں اسلامی مساوات کی بہترین عملی صورت ہے۔ اسوں کا کوئی تسادم نہیں ہے۔

مائیکل - بیشک شوشانم کے ذریعے مانع میں کوئی شخص خود خیرات نہ دے گا۔ کسی کو خیرات دینے یا لینے کی ضرورت پیش نہیں آتی اگر پیٹ بھوکے گھائیں گے تو سب اکتے اور اگر بھوکوں میں گئے تو سب ہی اکتے معاشی زندگی کا بہترین حل ہونے کے علاوہ اثبات کثرت میں اور بہت سی خوبیاں ہیں جن کو میں اب بیان کر دینگا۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انسان کے لئے یہ طریقہ کار کس قدر مفید ثابت ہوتا ہے۔ اس کی مثال آپ کے سامنے ہے جہاں یہ تجربہ کامیاب ہو چکا ہے۔ شوشانم، بکر گے فعل نے ہو جب پہلا قدم ہے جبکہ انسان کی پیدائش کے تمام فوائد عوام کی ملکیت بن جاتے ہیں۔ اور اس طرح انسان انسان کی عوامی است آزاد ہو جاتا ہے۔ اور یہی اسلام کا مقصد ہے جیسا کہ انصر نے فرمایا تھا معاشیات کا بہترین حل ہونے کے علاوہ شوشانم دینی اخلاقی، دینی ترقی کی بنیاد رکھتا ہے۔ (۱) پہلا نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ عوام میں سے نفس، قوم اور ملت کی دیواریں اٹھ جاتی ہیں۔ رنگ اور مذہب کا اقل یا زود ہو جاتا ہے تمام افراد ایک ہی حکومت کی رعایا کہلاتے ہیں۔ اور اس لئے حکومت کی نظریں مساوی درجہ رکھتے ہیں کسی کو کسی پر کوئی فوقیت نہیں۔ فوقیت قابلیت پر منحصر ہے۔ قوم کو اپنی مذہبی نفسی یا دینی دیتوں کو بے قرار رکھنے میں مدد ملتی ہے۔ مختصر الفاظ میں سر قوم اپنے محرک ترقی دینے کو مجبور کر سکتی ہے۔ اقلیتی دینی انسانیت ہر قوم کے بچوں کیلئے

یکساں فراہم کی جاسکتی ہے۔ والدین کی حیثیت خواہ کچھ ہی ہو۔ بچے جہاں تک چاہیں تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ اور انہیں بیکاری سے دوچار ہونے کا کبھی اندیشہ نہیں رہتا۔ تمام افراد تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تمام مزدور (۲) عورت مرد کے برابر حقوق رکھتی ہے۔ وہ بھی کام کرتی ہیں اور اپنی قابلیت کے مطابق مردوں کے برابر اجرت پاتی ہیں۔ (۱) دیہات اور شہر کا امتیاز نہیں رہتا۔ زندگی کا معیار ہر جگہ برابر ہو جاتا ہے۔ (۵) ان قوم باتوں کا مطلب یہ ہے کہ جنگ کی ضرورت ہی پیش نہیں آئیں گی بشرطیکہ وہ ممالک اس پر عمل پیر ہو جائیں۔ کسی بھی اشتراکی ملک میں ایسا کر وہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ دوسرے ممالک یا قوموں کو ترقی نہیں لانے کی خواہش کرے۔ ایک سرمایہ دار ملک یا قوم اسی لئے دوسری کمزور قوموں اور ملکوں پر حملہ آور ہوتی ہے تاکہ اپنی تجارت کی مندی و وسعت سے سکے۔ اپنے سرمایہ کو منافع بخش تجارتوں میں لگا سکے۔ اس کے برعکس ایک اشتراکی حکومت کو اس بات میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی کہ کسی ملک یا قوم کو ترقی پذیر ہونے دے۔ اسے غلام بنائے رکھے۔ اس کی تجارت اور صنعت و حرفت کی ترقی میں سدا اپنے لئے کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے نہ ہو سکیں۔ یہ سب سرمایہ داری کے عیوب ہیں اشتراکیت ان تمام عیوب سے پاک ہے۔ جو ممالک موستکرم کو اپنالیں گے۔ وہ ترقی یافتہ ممالک پرستارہ اقوام اور ممالک کی صنعت کو فروغ دینے میں امانت کریں گے۔ کیونکہ انکا سودا ایک ہی ہوگا۔ اگر تمام دنیا اس پر عمل پیرا ہو جائے۔ توانائی ذہن اس ترقی کا اندازہ نہیں کر سکتا جو عمل میں آسکتی ہے۔ ہر ملک کی صنعتی ترقی اور تمام ممالک کا ترقی کیلئے جدوجہد کرنا اور اگر مضبوط نظام سے عمل میں لایا جائے تو دنیا بہشت میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ تاکہ کی ایجادات اور اس کے انکشافات سب ممالک کیلئے یکساں طور پر مفید بنائے جائیں۔ انشائی اور ذہنی ترقی میں باہمی کشمکشیں کی جائیں۔ اس طرح انسان ترقی کی طرف بقی رفتار سے پرواز کر سکتا ہے۔ اس ترقی کی انتہا کئے مطلق مارکس نے کوئی تشریح کی کوشش نہیں کی اور اس پر غور و خوض کی ضرورت ہے لیکن اتنی بات اظہر من الشمس ہے کہ ایک ایسی ترقی

کا امکان ضرور ہے جس وقت انسان کے پاس اس قدر پیدا نش کے ذرائع موجود ہونگے کہ ہر انسان صرف دو گھنٹے کام کریگا اور اسے تمام عیش و راحت کے سامان مہیا ہوں گے باقی وقت وہ کھیل۔ تفریح۔ علمی مشاغل میں صرف کیا کریگا۔ انسان کہ وہوں میں تقسیم نہیں ہوں گے سب انسان کہلائیں گے اور وہ سب معنوں میں انسان ہونگے۔ نیکی بدی پر فتح کامل پائے گی دنیا جنت ہوگی۔ اس وقت انسان انسان سے برسرِ پیکار ہونے کی بجائے قدرت کی طاقتوں سے جنگ آزا ہوگا۔ وہ قدرت کو سرنگوں کرنے کا قدم اٹھائے گا۔ مگر اس وقت تقدیر اس کا ساتھ دے گی۔ وہ قدرت کی طاقتوں کو جادو و خشتادہ دیتاؤں کی چال پھوسی کے ذریعے ہم کرنے کی سعی نہیں کرے گا۔ وہ اپنی قوتوں سے آگاہ ہوگا۔ اس کی ذہنی قوتیں پوری طرح بیدار ہوں گی۔ وہ قدرت کی قوتوں پر اختیار حاصل کر لے گا۔ تقدیر اس کی اذیتا غلام بن جائے گی۔ محفل پر خاست ہو گئی۔ میں اکیلا رہ گیا۔ اشتراکیت کے معنی آج صحیح طور پر مجھے معلوم ہوئے۔ زندگی کے تمام مسائل اوسان کے جوابات پر میں نے طاباذنگا ڈالی۔ مائیکل اور انصر کے نظریات کا موازنہ کیا۔ جہاں تک زندگی موت کی سرحد سے ملتی تھی سائنس اور مذہب کے مقاصد میں کوئی تضاد نہیں تھا۔ البتہ کہیں کہیں نظام عمل میں کچھ اختلاف تھا۔ مثلاً پردہ اور معاشی نظام۔ یہ بات تو طے شدہ ہے کہ سچائی۔ نیکی اور خدا ایک ہی چیز کے نام میں۔ میں سچائی کے راستے کا جو یا ہوں۔ مذہب کا راستہ خدا کی اطاعت ہے جس کا مفہوم ہے نیکی اور سچائی کے راستے پر کامزن ہونا۔ مذہب کے اصول بھی انسان کی بہبود و خیر نظر رکھتے ہیں۔ اس سے دونکات جو تشنہ تشنہ تھے ان کا بھی تصنیف ہو جاتا ہے۔ یعنی (۱) جمہوری نظام حکومت بہتر ہے یا جمہوری حکومت کا نظام بہتر ہے؟ (۲) مذہب کو قومیت کی بنا قبول کیا جائے کہ وطن کو یا کسی اور جزد کو؟ عملی زندگی میں یہ امر یا یہ شہوت تک پہنچ چکا ہے کہ جمہوری طریقہ حکومت میں کثرت رائے سچائی کی ہمیشہ ترجمانی نہیں کرتی جس کی مثال امریکہ کے قانون اتقناع شراب کا مشہور ہے اس لئے بہتر یہی ہے کہ سچائی کو اصول یا قانون تسلیم کیا جائے اور اس میں کوئی دوہرا

صرف کثرت رائے کے بل بوتے پر عمل میں نہ لایا جائے۔ سپانی کبھی بدل نہیں سکی انسان کی فطرت بھی کبھی نہیں بدل سکتی۔ زندگی کے قوانین بھی مائنس کے اصولوں کے مطابق آتے ہیں۔ اور زندگی کا دستور العمل انہیں اصولوں پر مبنی ہونا چاہیے۔ ایک پانی کا دودھ ان اصولوں کی پیروی عشقِ حق کی بنا پر کرتا ہے۔ بلکہ ان قوانین کی پیروی پر مجبور کرنے کے لئے خوف کا حربہ بڑا کر اشد ثابت ہوتا ہے جس کی مثال چوک پر کھڑے ہونے سپانی کی ہے جو لوگوں کو راہِ راست پر چلنے کے لئے مجبور کرتا ہے۔ غنا کو حاکم اعلیٰ تصور کرنے میں انسان پر ایک بڑی بھاری ذمہ داری عاید ہو جاتی ہے۔ حاکم اعلیٰ کی ناراضگی کا خوف اسے راہِ راست سے جھکنے نہیں دیتا۔ یہی خوف عام انسانوں کی زندگی کو بچ کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ ایک حق پرست خوفِ خدا کی نیلے نیلی کی طرف راہ نہیں ہوتا۔ اس کی نظر میں خدا راستی ہے۔ دو نقطوں کے درمیان ایک ہی خط مستقیم کھینچا جا سکتا ہے یعنی وہ راست ایک ہی ممکن ہے لیکن ٹیڑھے سے خطوط کی راہیں نہیں۔ اس لئے راہِ راست انہی اہل قوانین فطرت پر مبنی دستور العمل کا نام ہو سکتی ہے۔ اس سے ہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ انسانوں کا اسی دستور العمل پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ اس میں رد و بدل کا انہیں کوئی حق نہیں ہونا چاہیے جس طرح قوانین قدرت اہل ہیں۔ اسی طرح انسانی زندگی کا آئین بھی مستحکم ہو۔ یعنی طرزِ حکومت جمہوری حکومت الہیہ ہو۔ اس طریق سے دنیا میں دو ہی گروہ وجود میں آتے ہیں۔ ایک راہِ راست کا علمبردار اور دوسرا شیطنیت کا پیروکار۔ اور ایک گروہ سے دوسرے میں منتقل ہونا ہر وقت ممکن ہے یعنی اپنے خیالات یا رائے کی تبدیلی ہر وقت ہو سکتی ہے۔ منکر رنگ نسل اور طے پیدائش کی تبدیلی ناممکن ہے۔ اس لئے جمہوری حکومت الہیہ کی پاک و دور ایک ہی گروہ کے ماتحت میں ہونی چاہیے۔ اس کا مطلب یہی ہوا کہ ہر راہِ راست کے دعویدار کا معنی کسی مذہب کی حکومت کے لئے ایک منجمد علاقہ مقرر ہو۔ یہی مذہب کا بنیادی اصول ہے۔ جس کی بنا پر پاکستان، افغانستان وغیرہ کے مطالبات پیش کئے جا رہے ہیں۔ جسے حاکم جہاں ایک ہی مذہب کے دعویدار

آباد ہیں۔ مثلاً یورپ۔ امریکہ۔ ایران۔ مصر اور عرب وغیرہ وہاں ایک ہی مذہب کی حکومت ممکن ہے۔ مگر ہندوستان اور خاص طور پر پنجاب اور بہاولپور جیسے صوبوں میں جہاں مختلف مذاہب کے لوگ آباد ہیں۔ ایسی حکومت کا قیام مشکل ہے۔ کیا کوئی ایسی صورت ممکن نہیں جس سے لوگوں کو اپنا اپنا وطن ترک کئے بغیر جمہوری حکومت الایمیترا سکے؟ کل یا مکمل سے یہی سوال کرونگا۔

دوسرے دن میں نے سوال پیش کیا۔

مائیکل : تاریخ عالم کے مطالعہ سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ قوموں کی بنیاد تین امور پر ہے یعنی نسل۔ وطن اور مذہب۔ ان تینوں عناصر میں سے کوئی ایک عنصر قوم کو دائرہ عمل میں لانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مثلاً یہودی ایک ہی نسل کے افراد ہیں اگرچہ وہ تمام دنیا میں آباد ہیں لیکن ان کا وطن فلسطین ہی تصور کیا جاتا ہے۔ نسل اور مذہب کی بنا پر تمام دنیا کے یہودی ایک ہی قوم کہلاتے ہیں۔ امریکہ کے ممالک متحد ہیں بشمول نیلیس آباد ہیں۔ جو مختلف ممالک سے آکر آباد ہوئیں۔ مگر وہ تمام امریکی کہلانے پر فخر محسوس کرتی ہیں۔ قومیت کی بنا وطن قرار دی جا چکی ہے۔ جرنی کے لوگ مدلوں سے دوسرے ممالک میں آباد ہونے کے باوجود جرمن قوم کے افراد کہلانے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ تمام دنیا کے مسلمان ایک ہی مذہب کی بنا پر ایک ہی قوم کے افراد ہیں۔ ایسی طریق پر قومیں بنتی ہیں۔ ایک ہی عنصر قوم کا بانی ہو سکتا ہے۔ جتنے عناصر کسی قوم کے افراد میں باہم مشترک ہونگے اتنی ہی افراد میں انسیت کی شدت زیادہ ہوگی۔ مثال کے طور پر ایک پنجابی مسلمان طالب علم برطانیہ میں سکونت پذیر ہے۔ اس کے دو ہم جماعت ہیں۔ ایک پنجابی مسلمان ہے۔ دوسرا مصری مسلمان۔ دونوں کو مالی امداد کی ضرورت پیش آتی ہے اور وہ صرف ایک شخص کی اعانت کی استطاعت رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دو پنجابی مسلمان کی مدد کے گا۔ کیوں؟ اس لئے کہ مذہب کے علاوہ وطن کا عنصر بھی دونوں میں مشترک ہے اور اس لئے یہ عنصر اسے مصری مسلمان پر ترجیح دینے پر مجبور کرتا ہے۔

فرض کرو انتخاب کا دائرہ اور محدود ہو جاتا ہے یعنی ایک مسلمان اس کی اپنی نسل سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا گونہ جانی ہے۔ مگر نسل مشترک نہیں ہے تو اس صورت میں تینوں مشترک عناصر زیادہ باعث کشش ہونگے۔ ان حقائق سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ جب مذہب مشترک ہو مثلاً یورپ۔ امریکہ یا ایران۔ تو اس صورت میں حسب الوطنی قومیت کی بنیاد جاتی ہے۔ مذہبی اختلاف اتنی شدت اختیار نہیں کرتا کیونکہ ان ممالک میں ہندوستان کی طرح مذہبی سوال درپیش نہیں آیا۔ اس لئے وہ لوگ وطن کی بنا پر اپنے آپ کو دوسروں سے علیحدہ تصور کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ہندوستان کے لوگ مذہب کو بنائے قومیت مقرر کرتے ہیں کیونکہ ان کا ملک ایک ہے۔

”مگر صحیح راستے پر کون ہے؟ قومیت کی بنیاد کیا ہونی چاہیئے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”میکل“ میرے نزدیک صحیح قومیت کی تعریف یہی ہے کہ ایک قوم کے افراد میں تینوں اہم عناصر مشترک ہوں۔ تینوں عناصر زبانی اپنی جگہ پر نہایت اہم درجہ رکھتے ہیں۔ نسل میں جسانی خصوصیات وراثت میں عطا کرتی ہے۔ وطن میں زبان۔ لباس اور رسم و رواج وغیرہ۔ فراہم کرتا ہے۔ مذہب ہمیں زندگی کا راستہ پیش کرتا ہے۔ یہ تینوں مل کر ایک مخصوص کلچر یا طرز معاشرت کی بنیاد رکھتے ہیں۔ اس لئے صحیح معنوں میں قومیں کلچر سے پیدا ہوتی ہیں۔ کسی ایک عنصر کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ تینوں کسی قوم کی بقا کیلئے لازمی ہیں۔ کسی قوم کے افراد میں ان نسبت اسی بنا پر استواء ہوتی ہے۔ تمام اقوام کے کلچر کو ایک ہی رنگ میں رنگنا عملی طور پر ناممکن ہے۔ جب دو گھڑیاں بالکل یکساں وقت کی پابند نہیں ہو سکتیں تو دو انسان کس طرح بالکل ایک ہی سانچے میں ڈھل سکتے ہیں نیز انسانی فطرت ہے۔ دنیا کی دلچسپی اس نیزنگی پر موقوف ہے مختلف زبانیں۔ صورتیں۔ لباس اور رسم و رواج اسی تضاد کی کشش کی تسکین دے سکتے ہیں۔ تمام انسانوں کو ایک ہی کلچر پر لانا امر محال بھی ہے اور ناگوار بھی۔ صرف ایک چیز مشترک ہو سکتی ہے یعنی فطرت انسان اور ایک ہی راستہ مشترک ہو سکتا ہے یعنی انسانی ضروریات کی تکمیل کا بہترین طریق۔ زندگی کے

حقائق پر ہمیں نگاہ رکھنی چاہیے۔ مذہبی اختلافات کو ہم دور نہیں کر سکتے۔ مذہب۔ زبان۔ لباس۔ رسم و رواج کو یک رنگ کرنے کی سعی بیکار میں وقت ضائع کرنا عقلمندی سے بعید ہے۔ ہر قوم اپنے کلچر کے تحفظ کا حق رکھتی ہے۔ انسانی فطرت کا انتصاف یہی ہے کہ ہر شخص اپنے عقائد و غیرہ کو صمیم تسلیم کرتا ہے۔ اپنے عقائد کے ناکارہ ہونے کا اعتراف کرنا اسے قبول نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح قومیں احساس برتری کے جذبہ کو مختلف طریقوں سے تسکین دینے کی سعی کرتی ہیں۔ قوموں پر نظر کیجئے۔ اسی جذبہ کی تسکین کی خاطر مقابلہ جاری ہے۔ ایک قوم دوسری قوموں سے اور ایک ملک دوسرے ملکوں سے اور ایک تہذیب دوسری تہذیب سے ٹکراتی جا رہی ہے۔ ہر قوم یہی دعویٰ کر رہی ہے کہ اس کا تمدن۔ مذہب۔ طرز معاشرت۔ زبان اور آرٹ بہترین ہیں۔ اور دوسری قوموں کو اس برتری کو تسلیم کر دینے کے لئے برسرِ پیکار رہتی ہے۔ اپنی برتری ثابت کرنے کے لئے وہ دوسری قوموں سے جنگ آ رہا ہوتا ہے۔ کمزور انسانوں اور کمزور قوموں کو مغلوب کر کے وہ تسکین حاصل کرنے کی سعی کرتی ہے اور وہ تسکین جنت و دولت کے حصول سے ہوتی ہے۔ یہی جذبہ جنگوں کی بنیاد ہے۔ گناہ اور کشت و خون کا یہی سرچشمہ ہے۔ دنیا کے تمام مصائب کی یہی جڑ ہے اس کا یہی علاج ہے کہ ہر قوم کے تمدن کو بہترین تسلیم کر لیا جائے۔ اپنی اپنی جگہ سب اسی احساس برتری میں تسکین پائیں۔ فارسی کی مثل مشہور ہے کہ اچھا عطر وہی ہے جس کا ثبوت خود عطر کی خوشبو پیش کرے نہ کہ عطر فروش۔ اس لئے جس قوم کا تمدن اچھا ہوگا۔ وہ خود بخود دوسروں کو اپنی طرف کھینچے گا۔ منطق و دلائل کی کوئی حاجت ہی پیش نہیں آئے گی۔ اب رہا دولت کے حصول کا سوال۔ جب انسانوں کو تمام ضروریاتِ زندگی میسر ہوں تو کسی کو چوری۔ ڈاکہ زنی۔ فریب کاری اور مکاری کی ضرورت ہی پیش نہیں آ سکتی اور اس آورش کے حصول کا بہترین طریقہ میں بیان کر چکا ہوں یعنی اشتراکِ نظامِ معاش۔ اس سے بہتر دنیا میں اور کوئی معاشی حل نہیں ہو سکتا۔ دنیا کی نجات اسی حل کو عملی جامہ پہنانے میں ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جو مالکیٹامن کا ضامن ہو سکتا ہے۔ یہی وہ طرزِ حکومت ہے

جس میں تمام قومیں اپنے اپنے تمدن کو فروغ دے سکتی ہیں۔ اپنے اپنے علاقہ میں جمہوری حکومت الٰہیہ کا قیام عمل میں لائی جاسکتی ہیں۔ ہر انسان خود جی سکتا ہے اور دوسروں کو جینے دے سکتا ہے۔ کشت و خون کئے بغیر فطری جذبہ جنگ کی تسکین بھی کر سکتا ہے۔ برتری کی جنگ کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ تمام فطری ضروریات کو بہترین طریق پر پورا کر سکتا ہے۔ اس طریقہ کو میں نے ایک آئین کی صورت میں ترتیب دیا ہے۔ کل آپ کو اس سے روشناس کراؤں گا۔

تیسرا حصہ

پہلا باب

آئین مسرت

مائیکل : زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں اسے آپ پر واضح کرتا ہوں۔ عالمگیر امن قائم کرنے کا اور کوئی بہتر طریق مجھے سمجھائی نہیں دیتا۔

(۱) اقوام کی بنا جغرافیائی حدود پر نہ رکھی جائے جن افراد کا کلچر ایک سا ہے۔ وہ ایک ہی قوم کے رکن شمار کئے جائیں۔ کلچر سے مراد یہ ہے کہ مذہب۔ وطن۔ نسل۔ زبان۔ لباس۔ طرز معاشرت وغیرہ میں تقریباً ہم آہنگی ہو۔ ہر ملک اور صوبہ کی آبادی کو اقوام میں بانٹ دیا جائے۔ ہر شہر۔ قصبہ اور دیہات کو بستیوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ہر ایک بستی میں ایک قوم آباد ہو۔ ایک بستی میں ایک ہزار مکانات ہوں۔ ایک مکان میں ایک خاندان آباد ہوں۔ یعنی ایک مرد۔ اس کی بیوی اور بچے۔ بچے جب جوان ہو جائیں اور شادی کر لیں تو وہ اپنے اپنے علیحدہ مکانوں میں منتقل ہو جائیں۔ مثال کے طور پر لاہور جیسے شہر کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ حصوں کی تقسیم آبادی کے تناسب کے مطابق ہوگی۔ بڑے شہروں میں کئی کئی بستیاں اکٹھی ایک ہی قوم کے افراد سے آباد ہونگی۔ بستیوں کے مجموعے ٹاؤن یا آبادی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس طریق سے لاہور میں مسلم ٹاؤن۔ ہندو ٹاؤن۔ سکھ ٹاؤن۔ اچھوٹ ٹاؤن اور کرسمچن ٹاؤن وغیرہ بنائے جاسکتے ہیں۔ قابلیت

کے لحاظ سے انسانوں کو تین گروہوں یا طبقوں میں بانٹ دیا جائے۔ ایک طبقہ عام مزدوروں پر مشتمل ہو۔ دوسرے طبقہ میں درمیانی قابلیت اور تعلیم کے لوگ شامل ہوں۔ ان کو معاون کہہ سکتے ہیں۔ اور تیسرے طبقہ میں اعلیٰ و مانع کے اشخاص کا شمار ہو جو حکام کا درجہ رکھیں گے اسی طرح مکانات کو بھی تین قسموں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اعلیٰ رہائشی مکانات میں اعلیٰ و مانع کے افراد اور عام مکانات میں عام لوگوں کی رہائش کا انتظام حکومت کی طرف سے کیا جائے۔

(۲) ہر ٹاؤن کی تنظیم نہایت اہم امر ہے۔ تنظیم سے بہت فائدے وابستہ ہیں۔ ایک تو فائدہ انتخابات کے سلسلے میں پہنچ سکتا ہے۔ دوسرے فوجی تنظیم آسان ہو جائیگی اس کی وضاحت پھر کر دیگا۔ کوشش یہ کی جائے کہ ہر ٹاؤن کی ہر ایک بستی میں ایک ہی نسل کے لوگ آباد کئے جائیں مثلاً مسلم ٹاؤن میں پٹھانوں، مغلوں، شیعوں، سیدوں، شیخوں وغیرہ کی بستیاں بنائی جاسکتی ہیں۔ ہر ٹاؤن کی آبادی اپنے کلچر کی ترقی کیلئے آزادانہ اقدام کر سکتی ہے جہاں تک ٹاؤن کے نظم و نسق کا تعلق ہے وہ صوبائی حکومت کا پابند نہیں ہوگا مثلاً مسلم، ہندو یا سکھ ٹاؤن میں اپنے اپنے مذہب کے قوانین نافذ ہونگے۔ دوسرے لفظوں میں جمہوری حکومت الہیہ رائج ہوگی۔ ہر شخص کو آزادی ہوگی کہ جو کلچر وہ پسند کرے اس ٹاؤن میں سکونت اختیار کرے۔ ہر ٹاؤن اس طریق سے پاکستان، خالصتان وغیرہ بن سکتا ہے۔ ہر ٹاؤن کی اپنی پولیس چوکیاں اور عیالیں ہوں اور مقدمات کا فیصلہ مذہبی قوانین کی بنا پر کیا جائے۔ ہر ٹاؤن میں کئی کئی سکول اور ہسپتال ہوں۔ ہر ٹاؤن کا ایک ٹاؤن ہال ہو۔

(۳) ٹاؤن کمیٹی کا انتخاب اس طریق سے عمل میں لایا جائے۔ ہر بستی سے ایک ایک نمائندہ بلا یا جائے۔ ہر شخص ایک ہزار خاندانوں کی نمائندگی کا فرض سر انجام دیکھا۔ انتخابات کے لئے کسی قسم کا پروپیگنڈا کرنا منع ہوگا۔ بستی میں جو شخص سب سے زیادہ قابل تعلیم یافتہ اور صاحبِ کردار ہوگا وہی نمائندگی کا حق رکھے گا۔ یہ چند نمائندے اپنا صدر چن سکتے ہیں۔ ان نمائندوں کے علاوہ ہر ایک ٹاؤن کا اپنا اعلیٰ منصف، پولیس انسپکٹر، سکول انسپکٹر، ہسپتالوں کا انچارج اور محکمہ تعمیرات عامہ کا حاکم اعلیٰ۔ یہ تمام ٹاؤن کمیٹی کے

رکن ہوں۔ ٹاؤن کے معاملات صنفی وغیرہ اس کمیٹی کے ذمہ ہونگے اور ٹاؤن کی بہتری کی تجاویز صوبائی حکومت کے پاس بھیجنا وغیرہ بھی اسی کمیٹی کا فرض ہوگا۔

(۴) صوبائی حکومت کے ارکان کا انتخاب اس طریق سے عمل میں لایا جاسکتا ہے۔ ایک تعداد مہتمموں کی مقرر کی جاسکتی ہے۔ مثلاً دو سو مہتمموں کی نمائندگی ایک شخص کرے اس طرح مجلس نمائندگان وجود میں آئے گی۔ صدر اعظم کا انتخاب بھی مجلس عمل میں لائیگی۔ مجلس کی تشکیل جمہوری اصولوں پر مبنی ہوگی۔ مجلس کے ذمہ دو اہم فرائض ہونگے۔ (۱) دفاع یعنی سیاسی معاملات کا تعقیب اور (۲) معاشیات یعنی پیدائش اجناس کے ذرائع کو فروغ دینا اور اجناس کو عوام میں تقسیم کرنا یا زندگی کے معیار کو بلند سے بلند تر کرتے جانا۔ اخلاقی سماجی تعلیمی اور جہانی ترقی مذہب کے ہاتھوں میں سونپ دی جائے۔

(۵) مرکزی حکومت کے ارکان کا انتخاب اس طرح بہتر رہے گا۔ مثال کے طور پر ہندوستان کے ہر صوبے سے پانچ پانچ نمائندے لئے جائیں۔ یہ پانچ نمائندے صوبے کی پانچوں اقوام کی ترجمانی کر سکتے ہیں یعنی ہندو سکھ۔ اچھوت۔ عیسائی یا اینگلو انڈین۔ صوبوں کی حد بندی کا مقصد صرف نظام حکومت کو چلانے کی غرض سے ہو۔ یہ تمام منصب اعزازی ہونگے۔ اجلاس ہر سہ ماہ کے بعد منعقد ہو سکتے ہیں۔ صرف وزیر اسارا وقت کام کریں گے۔ ہر صوبے میں پانچ وزرا حکومت کی باگ ڈور سنبھال سکتے ہیں۔ ہر ایک وزیر اپنی قوم کی نمائندگی کرے گا۔ اجلاس کے دوران میں قیام و طعام اور سفر وغیرہ کے اخراجات حکومت کے ذمہ ہونگے۔ وزرا کو ایک رقم بطور الاؤنس دی جاسکتی ہے۔ مرکزی حکومت کے بھی صوبائی حکومتوں کی طرح وہی دو فرائض ہونگے۔ مرکزی حکومت پیمانہ صوبوں کی صنعتی ترقی کو ملحوظ رکھے گی۔ صوبوں کی اجناس کا تبادلہ ان کے ذمہ ہوگا۔

(۶) سب سے پہلے آبادیوں کی حدود و بندی ضروری ہوگی۔ ایک ایک ہزار مکانات پر ایک بستی مشتمل ہوگی۔ تمام اراضی اور مکانات و عمارات حکومت کی ملکیت ہونگی۔ مکان

سے مراد ایک عمارت نہیں ہے۔ بلکہ اتنی جگہ مقصود ہے۔ جو ایک خاندان کے لئے آرام دہ ثابت ہو سکے۔ اس نقطہ نگاہ سے کئی عمارات میں ایک سے زیادہ خاندان آباد ہو سکتے ہیں۔ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے مکانات اور آبادی کی تعداد معلوم کی جائے۔ تمام کار آمد اجناس کی قیمت مقرر کر دی جائے۔ اور اس طرح مجموعی دولت کی قیمت کا اندازہ لگایا جائے۔ موجودہ انسانوں کو قابلیت کے معیار کے مطابق تین طبقاتوں میں تقسیم کیا جائے۔ ان کو مزدور۔ معاول اور حاکم کے الفاظ سے موسوم کر سکتے ہیں۔ اس موجودہ دولت کو تینوں طبقاتوں میں تقسیم کر دیا جائے یعنی اجناس کی مجموعی قیمت کے برابر کے تقسیم کر دیئے جائیں۔ یہ سکہ پہلے رائج شدہ سکے سے بالکل مختلف ہونا چاہیئے۔ سکہ تمام نوٹوں کی شکل میں ہو۔ نیا سکہ اس لئے ضروری ہے۔ کیونکہ لوگوں کے پاس جو پہلے روپے اور نوٹ موجود ہونگے وہ بیکار جائیں گے اور کسی سے واپس لینے کی دقت کا سامنا کرنا نہیں پڑے گا۔ جن لوگوں کے پاس ضروریات سے زیادہ دولت ہو۔ وہ دولت دکانوں میں اور گوداموں میں جمع کی جاسکتی ہے۔ دکانیں تمام حکومت کی ملکیت ہونگی۔ دکاندار تنخواہ دار ملازم ہونگے۔ حکومت دکانداروں کے حوالے ٹاک اسی طریق پر کرے گی جس طرح ٹاکس کمپنی بٹا شاپ کو مال سپلائی کرتی ہے۔ کارخانے تمام حکومت کی ملکیت ہونگے۔ کارخانوں سے تیار شدہ مال تمام دکانوں میں منتقل کر دیا جائے جس چیز کی مانگ زیادہ ہو اسی کی پیداوار پر توجہ اور محنت صرف کی جائے۔ مکانات حکومت کی ملکیت ہونگے مگر مکانات کی آرائش کا سامان وغیرہ ذاتی ملکیت ہونگے۔ اسی طرح زمین حکومت کی ملکیت ہوگی۔ مگر اس زمین کی پیداوار کسان کی ملکیت ہوگی۔ اس کے علاوہ ذاتی استعمال کی تمام اشیاء مثلاً فرنیچر کپڑے۔ برتن وغیرہ کسان کی ملکیت ہونگی۔ ذاتی استعمال کے لئے گھوڑا۔ گائے مرغیاں وغیرہ ہر کوئی رکھ سکتا ہے۔ کاشتکاری کے آلات حکومت کی ملکیت ہونگے۔ اور حکومت کسانوں کو یہ آلات کو ایہ پر فراہم کرے گی۔ لگان وغیرہ کوئی نہیں ہوگا۔ مجموعی کاشتکاری کو ترجیح

دی جائے گی۔ اس کے متعلق زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں سویٹ روس کی مثال موجود ہے۔ اس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے جب تک کوئی تعلیم حاصل کرے گا۔ اسے تنخواہ نہیں ملے گی۔ اس کے اخراجات کے کفیل اس کے والدین یا سرپرست ہونگے ذہین ہونے کی صورت میں وظیفہ دیا جائے گا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر اگر وہ کام کرنا چاہے تو حکومت اسے فوراً کام پر لگا سکتی ہے۔

(۷) موجودہ زمانے کی بیکاری اور عسرت کی سب سے بڑی وجہ آبادی کی کثرت ہے۔ صحت مند اور ذہین افراد کے مقابلے میں کمزور۔ اپاہج اور جاہل لوگوں کی بید کثرت ہے۔ اس کا انسداد ایک نہایت اہم امر ہے نسلوں کو بہتر بنانے کی غرض سے ہر بستی کی آبادی کو تین طبقوں میں تقسیم کیا جائے۔ یقیناً جہاں فی صحت کے لحاظ سے کی جائے گی۔ اول درجہ کی صحت رکھنے والے کو تین بچے پیدا کرنے کی اجازت ہوگی۔ دوم درجہ کے انسانوں کو دو بچے اور سوم درجہ کی صحت رکھنے والوں کو صرف ایک بچہ کی پیدائش کی اجازت ہوگی۔ یہ فرض ٹاؤن کے محکمہ صحت کے حاکم کے ذمہ ہوگا۔ ٹاؤن کے تمام ڈاکٹروں پر مشتمل ایک کمیٹی ہوگی جو لوگوں کو صحت کے لحاظ سے درجہ عنایت کرے گی۔ کوشش یہی کی جائے کہ ہر شخص کی زندگی دراز ہو سکے۔ کر دڑوں جانوں کو بیماری۔ قحط اور افلاس کے منہ میں دھکیلنے سے یہ ہزار درجے بہتر ہے کہ بچوں کی پیدائش کم کر دی جائے تاکہ وہ خوشحال زندگی بسر کر سکیں اگر ایک کر دڑ انسان خوشحال رہ سکتے ہیں۔ تو ایک کر دڑ سہی۔ اگر ایک لاکھ مشکل اطمینان کی زندگی گزار سکتے ہیں تو کثرت سلسلہ حماقت ہے۔ دنیا ایک محدود جگہ ہے۔ اس لئے یہ مسئلہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ شادی سے قبل شادی کی قابضیت کی سند حاصل کرنا ضروری ہوگا۔ جس کے بغیر شادی قرار نہیں پاسکتی۔ اگر کوئی شخص نامرد ہے یا کسی مخصوص مہلک مرض کا شکار ہے۔ جو اس کے بچوں میں منتقل ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں اگر عورت رضا مند ہو تو شادی کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ مگر بچے پیدا کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ ہر قوم کو ایک ہی تناسب سے آبادی میں

اضافہ کرنے کی اجازت ہوگی۔ ہر ماؤن ہال میں پیدائش و اموات کا رجسٹر ہوگا۔ ہر قوم کے ذمے یہ فرض ہوگا کہ وہ ایمانداری سے اس سلسلہ میں کام لے۔ ہر تین سال بعد مردم شماری ہو کر گی ان قوانین کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت ترین سزا دی جائے گی۔ سب سے بڑی سزا شہری حقوق سے محروم کرنا ہوگی۔ اسے ملک بدر کر دیا جائے۔ ضبط تولید کی تعلیم عام سکول میں دی جائے۔ مردم شماری سے پتہ چل سکتا ہے کہ کس قوم نے اس پیدائش کے معاملے میں کمی بیشی سے کام لیا ہے۔ اگلے تین سالوں میں وہ قوم تناسب کو برقرار رکھنے کے اقدام اختیار کر سکتی ہے۔ مقصد یہی ہو کہ پیدائش و اموات کے مساوی ہو۔ تاکہ

خوشحال زندگی بسر کرنے کا امکان پیدا ہو۔ اور اس کے علاوہ ہر قوم کے ذمہ یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ مردوں اور عورتوں کی تعداد تقریباً یکساں رہے۔ عورتوں کی تعداد بڑھنے نہ پائے اس سلسلہ میں بھی طبی انکشافات سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ ابتدائی تعلیم میں اس کے متعلق بھی واقفیت حاصل ہو سکتی ہے۔ ایسے بچے جو ایسا سچ پیدا ہوں اور جن کی صحت بہتر ہونے کی کوئی امید نہ ہو۔ بہتر یہی ہے کہ انہیں بچپن میں ہی ختم کر دیا جائے۔ یہ امر باعث رنج و ضرر معلوم ہوتا ہے۔ مگر انکی بہبود اسی میں ہے۔ تمام صحت گاہیں اور ہسپتال عوام کے لئے مفت ہونگے۔ ہر ماؤن میں ایک بڑا ہسپتال ہو نا ضروری ہے اور ڈسپنسریاں اس تناسب سے کھولی جاسکتی ہیں۔ مثلاً ہر سو خاندانوں کے افراد کیلئے ایک ڈسپنسری یعنی ایک بی بی میں دس شفا خانے۔ ایک ڈسپنسری میں ایک ڈاکٹر۔ ایک لیڈی ڈاکٹر۔ ایک نرس۔ ایک کپاوند و غیرہ مقرر کئے جاسکتے ہیں۔ یہ تمام عملہ ان ایک سو خاندانوں کی خدمت کے لئے مامور ہوگا۔ جو کہیں زیادہ خطرناک ہو وہ ماؤن ہسپتال میں بھیجا جاسکتا ہے۔ موجودہ حالات میں ایسا ہو سکتا ہے۔ کہ ہر شہر کا بڑا ہسپتال تمام اقوام کے لئے مشترک ہو۔ مگر اسے آبادی کے تناسب سے حصوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے اسی طرح ایک ہی قوم سے آباد شدہ بستیوں کا ماؤن ہال بھی مشترک ہو کہ سرکاری عمارات میں قائم ہو سکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ماؤن ہال بستیوں کے درمیان ہی واقع ہو۔

کیونکہ موجودہ رہائشی مکانات، محلات اور آبادیاں بالکل ناقص ہیں اور ان کے درست کرنے میں ابھی وقت درکار ہوگا۔

(۸) اسی طرح تعلیم بھی ابتدائی تعلیم سے لیکر ماہر علم و فن کی ڈگری حاصل کرنے تک مفت ہوگی۔ ہر ماؤن میں ابتدائی سکول اور کالج ہونگے۔ ہر قوم کا ایک کالج ہوگا۔ ہر بستی کا ایک سکول ہوگا۔ ماہر علم و فن کی ڈگری کے حصول کے لئے کالج مشترک ہونگے۔ جہاں تمام اقوام کے طالب علم مفت تعلیم حاصل کر سکتے ہیں تعلیم کے نصاب کے متعلق میں پہلے ذکر چکا ہوں۔ ابتدائی تعلیم ہر لڑکے لڑکی کے لئے لازمی ہوگی۔ جو طالب علم ذہین ثابت ہونگے یا ارباب ذوق ہونگے انہیں کالج میں شامل ہونے کی ترغیب دی جائے گی۔ مدرس اس سلسلے میں ان کی رہنمائی کریں گے۔ جن لائب علموں کے متعلق معلموں کی رائے ناقص ہوگی انہیں ابتدائی تعلیم کے بعد مختلف پیشوں میں بطور شاگرد بھرتی کر لیا جائے گا۔ اور ان کو ادھی اجرت ملے گی اور کام بھی نصف کرنا ہوگا۔ جو ذہنی طور پر بالکل نیکمے ثابت ہونگے وہ بالکل معمولی کام مثلاً صفائی۔ بار و بکشی اور قلی کا کام سرانجام دیں گے۔ اچھوت قوموں کو ان کاموں پر مجبور نہیں کر سکتے۔ ان کی اپنے آبادیاں ہونگی۔ اس لئے ہر قوم کو اپنی بستیوں کی صفائی وغیرہ اپنے ہی قوم کے کند ذہین انسانوں سے کروانی ہوگی۔ کوئی قوم کسی قوم کی غلام نہیں ہوگی۔ کوئی شخص کسی شخص کا نوکر نہیں کہلا سکتا ہے سبھی مزدور ہونگے۔ سبھی آقا۔ قابلیت پر اجرت کا انحصار ہوگا۔ ہر قوم قابل بننے کی سعی کرے گی۔ اقوام میں اصول مقابلہ عمل میں آئے گا۔ ہر قوم سبقت لیجانے کی کوشش کرے گی۔ اپنی اپنی بستیوں کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرے گی۔ اپنے اپنے کلچر کو بلند کرنے کی سعی کرے گی۔ انسان کا فطری اقتضائے جنگ یہ صورت اختیار کرے گا۔ بجائے لٹنے کے۔ دست و گریبان ہونے کے وہ انسانیت کی جنگ لڑیں گے۔ وہ بہتر سے بہتر انسان بننے کی کوشش کریں گے جس قوم کا کلچر بلند ہوگا۔ لوگ اس کو قبول کرنے پر خواہ مخواہ آمادہ ہونگے یہ تبلیغ کا صحیح طریقہ ہوگا۔ اعمال سے کوئی قوم اپنے کردار کو پیش کرے گی۔ اقوال

لاقوتوں کی زینت نہیں بنیں گے۔

(۹) ہر قوم کی عورتیں بھی اسی طریق پر عمل پیرا ہونگی۔ اپنی اپنی بستیوں میں وہ کام کریں گی انہیں مردوں کے برابر تنخواہ ملے گی۔ جو عورت کام نہیں کریگی۔ اسے کوئی اجرت نہیں ملے گی۔ یہ اس کی مرضی پر منحصر ہے۔ حکومت کو افراد کی انفرادی اور سماجی زندگی میں کوئی دخل نہیں ہوگا۔ یہ کام مذہب کے ذمہ ہوگا۔ ہر قوم اس کی خود ذمہ دار ہوگی۔ اپنے قوانین کے مطابق وہ افراد کے چال چلن کے متعلق باز پرس کر سکتی ہے۔ مثلاً کہ بچن ٹیاؤن کی بستیوں میں ایسے افراد ہیں جو برہنہ رہنے کے قائل ہیں۔ ایسے افراد ایک بستی میں منتقل ہو سکتے ہیں۔ اور اپنی پسند کے مطابق سماجی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ کسی دوسری قوم یا حکومت کو ان سے باز پرس کرنے کا کوئی حق نہیں ہوگا۔ اگر وہ دوسری اقوام کے امن عامر میں دخل انداز ہونگے۔ تو حکومت کو بیشک انہیں سزا دینے کا اختیار ہوگا۔ اسی طرح مسلمانوں کی بستیوں میں بھی مذہبی اختلافات کی بنا پر ہر بستی ایک ہی کلچر کے پیروکاروں سے آباد ہونی چاہیے۔ مثلاً ایسے مسلمان بھی ہیں جو پردہ کے پابند نہیں رہنا چاہتے۔ یا وہ مغربی طرز زندگی اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے مسلمان ایک علیحدہ بستی میں منتقل کئے جاسکتے ہیں۔ مگر ان کو مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ اصلاح اور تبلیغ کی اجازت ہوگی۔ مگر کسی قوم کے مسلک یا مذہب کی توہین گوارا نہیں کی جائے گی۔ اسی طرح ہر ٹاؤن سماجی طور پر آزاد ہوگا۔

(۱۰) ہر مرد و عورت کو گیارہ مہینے کام کرنے کے بعد ایک مہینہ کی چھٹی تنخواہ کے ساتھ ملے گی۔ عورتوں کو حاملہ ہونے کی صورت میں ایک مہینہ کی چھٹی مزید دی جائے گی۔ تفریح گاہیں سیر گاہیں صحت گاہیں وغیرہ سب مشترک ہونگے۔ ان کا انتظام حکومت کے ماتھے میں ہوگا۔ معمولی دام خرچ کرنے پر ان مقامات سے ہر کوئی لطف اندوز ہو سکے گا۔ حکومت کی طرف سے کھیل۔ تفریح۔ رقص اور موسیقی کا انتظام ہوگا۔ ایسی درس گاہیں بھی ہونگی جہاں عوام فنون لطیفہ کی تعلیم حاصل کر سکیں گے۔ یہ درس گاہیں مفت تعلیم دیں گی۔ یہ ادارے مشترک ہونگے اور سیر گاہوں اور پارکوں میں قائم کئے جائیں گے۔ اس کے علاوہ ہر قوم اپنے علا

میں ایسی تفریح گاہیں اور کھلیں بنا سکتی ہے۔ جہاں قوم کے افراد مل جل سکتے ہیں۔ اور سماجی زندگی سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

(۱) حکومت کی امانت میں ایسے محکمے ہوں مثلاً (۱) محکمہ تعمیرات عامہ جس میں مختلف شعبے ہو سکتے ہیں۔ عمارتیں۔ سڑکیں۔ نالیاں۔ پل وغیرہ (۲) محکمہ صنعت و حرفت یعنی تمام مصنوعات کی تیاری کے کارخانے وغیرہ (۳) محکمہ تقسیم اجناس یعنی اشیائے خورد و پی اور مصنوعات کے ڈیپو اور دکانیں (۴) محکمہ فروج یا دفاع (۵) تار اور ڈاک کا محکمہ (۶) محکمہ ریل و سائل۔ یعنی ریل۔ لاریاں۔ بسیں۔ ٹرینیں وغیرہ۔ بقایا محکمے مثلاً محکمہ صحت تعلیم۔ امن عامہ۔ عدالت اور صفائی وغیرہ بستیوں کی بنیادیں یا ٹاؤن کمیٹی کے سپرد ہوں۔ اس تقسیم کو سرکاری محکموں اور قومی محکموں کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ایک بستی میں ایک ہزار خاندان آباد ہوں گے۔ عملی تجربہ سے یہ معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ ایک بستی کے قومی اداروں کے لئے کتنے اشخاص کی ضرورت ہوگی۔ مثلاً ایک بستی میں اگر دس ڈسپنسریاں ہوں تو دس ڈاکٹر۔ دس کمپاؤنڈر۔ دس لیڈی ڈاکٹر۔ دس نرسیں درکار ہوں گی۔ ایک ابتدائی تعلیم کا سکول ہوگا۔ یہ مخلوط ہو یا علیحدہ علیحدہ ایک تعداد مدرسوں کی مقرر کی جاسکتی ہے۔ فرض کرو یہ تعداد ایک سو ہے۔ اسی طرح پولیس۔ عدالت۔ صفائی کے محکموں کے عملہ کی تعداد مقرر ہو سکتی ہے۔ اسی طریق پر سرکاری محکموں کے عملہ کی تعداد معلوم ہو سکتی ہے۔ قومی اداروں کا عملہ اس بستی میں سکونت اختیار کرے گا۔ سرکاری اداروں کا عملہ ٹاؤن کی کسی بستی میں مقیم ہو سکتا ہے۔ ہر ٹاؤن کے سرکاری اداروں میں ایک ہی قوم کے افراد کام کریں گے۔ مشترکہ اداروں مثلاً ریلوے۔ کارخانے۔ کالج۔ دفاع وغیرہ میں سب اقوام کے افراد اکٹھے کام کریں گے۔

دوسرا باب

کلمہ نماز۔ زکوٰۃ۔ روزہ اور حج کا صحیح مفہوم

انصرؒ ٹائیکل میں تو ساری رات خواب میں بھی آپ کے آئین کے متعلق سوچتا رہا حکومت تو واقعی ایک وقت میں ایک ہی گمراہ کی بہتر ہے۔ بہتر معاشی نظام میں ہی بہتر زندگی کا راز منظر ہے۔ اسلام بھی مکمل نظام حکومت پیش کرتا ہے۔ خواہ اشتراکی حکومت آپ کے آئین کے مطابق قائم کی جائے یا اسلامی حکومت الہیہ کے مطابق علیحدہ علاقے مقرر کر دیئے جائیں۔ دونوں صورتوں میں اسلامی نظام زندگی کامیاب ہو سکتا ہے۔
ٹائیکلؒ۔ اس کی ذرا وضاحت فرمائیے۔ آپ کا اسلام تو سائنس کی کسوٹی پر بھی پورا اُترتا ہے۔

”انصرؒ کو میں پیدائشی مسلمان ہوں مگر اسلام کی حقیقی روح سے اب واقف ہوا ہوں آپ مجھے مسلمان بنا لیجئے۔“ میں نے کہا۔ اپنے لئے میں مذہب یعنی زندگی کا راستہ انتخاب کر چکا تھا۔ انصرؒ اسلام کے دستور العمل سے آپ کو کما حقہ واقفیت ہو چکی ہے۔ اگر آپ اس پر عمل پیرا ہونا چاہتے ہیں تو شوق سے کلمہ پڑھ کر یعنی حلف و فدا داری اٹھا کر اس پارٹی میں شامل ہو جائیجئے۔ مگر اتنی بات اور ذہن نشین کر لیجئے کہ ہر سیاسی پارٹی کا ایک نصب العین ہوتا ہے جس کے حصول کے لئے ایک لائحہ عمل وضع کیا جاتا ہے۔ اسلام کا نصب العین ہے کہ انسانوں پر خدا کی حکومت ہو۔ یعنی دنیا میں نیکی اور سچائی کا بول بالا ہو۔ اس لئے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ زندگی کے تمام معاملات میں وہ صرف خدا کی اطاعت کرے یعنی راہِ راست پر

گامزن ہے۔ راہِ راست کیا ہے اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ اس لحاظ سے ہر مسلمان ایک سپاہی ہے اور خدا کی حکومت قائم کرنا اس کی زندگی کا مقصد اولیٰ ہے۔ سپاہی کے ذمہ چار فرائض ہیں (۱) پانچ وقت روزانہ نماز (۲) سال میں ایک مہینہ روزے رکھنا (۳) سال کے بعد زکوات ادا کرنا (۴) تمام عمر میں ایک دفعہ مکہ کا حج کرنا۔

ٹائیکل ٹیہ مذہبی رسوم ہیں یا ان کا کچھ اور بھی مفہوم ہے؟ اسکی وضاحت فرمائیے۔

انصر۔ ”میں بھی یہی بیان کرنے والا ہوں۔ آپ غور سے سنتے رہیے مطلب خود بخود واضح ہو جائے گا۔ پہلے نماز کو لیجئے۔ نماز کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ انسان برائیوں سے بچ سکتا ہے۔ وہ کیسے سب سے پہلے اذان کو لیجئے۔ ”اللہ سب سے بزرگ ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد اللہ کے رسول ہیں۔ نماز کے لئے آؤ۔ بھلائی کے لئے آؤ۔ مازیند سے بہتر ہے اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔“ اللہ کے سپاہی کے لئے اذان کی آواز دہی اثر رکھتی ہے جو بگل کی آواز ایک فوجی کے لئے۔ اس آواز کو سنتے ہی وہ تمام کاروبار و میں چھوڑ دیتا ہے اور مسجد کا رخ کرتا ہے۔ اگر کوئی سپاہی دن میں پانچ دفعہ اس بگل کی آواز پر حاضر نہیں ہوتا تو اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ اللہ کی فوج میں شامل نہیں ہو سکتا ایسے کامل اور باغی سپاہی کو دنیا کی کوئی فوج قبول نہیں کر سکتی۔ اس لئے نماز کا پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ یہ پابندی وقت کا درس دیتی ہے۔ اور سپاہی کی مستعدی کا امتحان بھی ہو جاتا ہے اس کے بعد وقت مقررہ پر تمام حاضر سپاہی ایک ہی امام کی قیادت میں قطاروں میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ امیر اور مفلس۔ قابل اور جاہل شانہ بشانہ ایک ہی شخص کی حرکات کی پیروی کرنے میں۔ یہ مساوات کا عملی ثبوت ہے۔ نماز ایک ہی امیر کی اطاعت کرنا سکھاتی ہے فوج میں تعلیم کس قدر اہم امر ہے کسی سے مخفی نہیں۔ نماز انہی خوبیوں کی حامل ہے۔ فوج کے سپاہی قطاروں میں ترتیب وار کھڑے ہونے کے بعد بالکل ساکت (اینشن) ہو جاتے ہیں یعنی حکم کی تعمیل کے لئے مستعد ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اللہ کا سپاہی کعبہ کی طرف منہ کر کے

ایک ہی زبان یعنی عربی میں خواہ وہ کسی ملک کا باشندہ ہو یہ اعلان کرتا ہے۔ کہ میں نے اپنا رُخ خلوص دلی سے اس سہتی کی طرف کر دیا ہے جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا۔ اور میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو خدا کی حکومت میں کسی دوسرے کو شریک کرتے ہیں۔ یہ کہنے کے بعد سپاہی و دونوں ہاتھ کا نون تک اٹھاتا ہے جس کا یہ مفہوم ہے کہ اس نے اپنے حاکم اعلیٰ کے لئے سب کچھ ترک کر دیا اور وہ اللہ کو سب سے بڑا کہہ کر پھر ہاتھ باندھ لیتا ہے اور یہ الفاظ ادا کرتا ہے کہ پاک ہے تیری ذات جس کی میں پرستش کرتا ہوں۔ تمام تائش تیرے ہی لائق ہے۔ تیرا تہ سب سے بلند ہے۔ تیرے سوا کوئی ہماری اطاعت گزاری کا حقدار نہیں ہے۔ اس کے بعد قرآن کی آیات پڑھی جاتی ہیں۔ جو اللہ کے احکام۔ قوانین یا زندگی کے طرز عمل کو بیان کرتی ہیں۔ کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ مسلمان دن میں پانچ دفعہ اپنے حاکم سے علف و فاداری اٹھاتا ہے۔ اللہ کے سوا کسی کی اطاعت نہ کرنے کا اقرار کرتا ہے۔ لیکن مسجد سے نکلنے کے بعد وہی مکاری۔ قریب دہی۔ رشوت سنانی جھوٹ بولنا۔ سود لینا۔ دوسرے انسانوں کو ایذا پہنچانا۔ مفلس انسانوں پر ظلم کرنا۔ زنا کرنا۔ غیبت کرنا وغیرہ شروع کر دیتا ہے۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد جب پھر وہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ تو اقرار کرتا ہے کہ وہ سوائے اس کے کسی کی عبادت نہیں کریگا۔ کس طرح ممکن ہے کہ تم بار بار علف و فاداری اٹھاؤ۔ نیکی اور سچائی کے راستہ پر گامزن ہونے کا اقرار کرو اور پھر تمام عمر وعدہ خلافی کرتے رہو۔ گناہوں کا ارتکاب کرتے رہو۔ کیا تمہارا ضمیر تمہیں ملامت نہ کرے گا۔ اگر نماز سے بھی کسی کی اصلاح نہیں ہو سکتی تو اس میں اسلامی نظم کار کا کیا قصور۔ صابن اور پانی کا کام میل کو دھونا ہے اگر ان کی مدد سے تار کو لکا داغ و دور نہیں کیا جاسکتا تو صابن اور پانی کو نا کارہ قرار دینا نامناسب ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ نماز کو ایک مذہبی رسم تصور کر لیا گیا ہے۔ پوجا یا ٹھٹھہ لیا گیا ہے۔ اللہ کوئی جسم نہیں رکھتا۔ اس لئے وہ انسانی جذبات سے عاری ہے۔ اسے خوشامد اور تعریف کی ہرگز ضرورت نہیں۔ وہ شیریں الفاظ سے بھسلا یا۔ نہیں جاسکتا۔ وہ اعمال کو چانتا ہے۔ اقبال کو وہ ہرگز خاطر میں نہیں لاتا۔ تمام رات یا اللہ یا محمد کا درو کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگر تمہیں اتنی ہی فرصت ہے تو جاؤ خلق خدا

کی خدمت کرو۔ انسانوں کو راہِ راست پر لگاؤ۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کا کارِ ثواب ہاتھوں میں لو۔ مگراہوں کو ہدایت دو۔ دنیا کو ایسے لوگوں کی اشد ضرورت ہے۔ دنیا والے تمہیں سر آنکھوں پر جگہ دیں گے۔ اللہ تمہارے لئے جنت کے دروازے وا کر دے گا۔ یہ ہے نماز کا مفہوم یعنی سچائی کے راستے پر گامزن ہونے کی کوشش۔ اگر تمہیں جو کچھ عربی زبان میں نماز کے دوران میں پڑھایا جاتا ہے۔ اس کے معانی سے واقفیت ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ تمہارا کردار بلند نہ ہو سکے۔“

”بیشک اکثریت ایسے مسلمانوں کی ہے جنہیں عربی کے الفاظ قیاد میں مگر نہ اُن کا ترجمہ معلوم ہے اور نہ نماز کے مفہوم کا علم ہے۔“ میں نے کہا۔

”انصرمہ رونا تو یہی ہے اور بدنام اسلام کو کرتے ہیں۔ یہ تو ہونا نماز کا اصلاحی رخ اب نماز باجماعت کے مفہوم پر غور کیجئے۔ اسلام میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ایک ہی منہم ہے یعنی خدا کی اطاعت کرنا اور کروانا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے نماز اور کثرتِ بیت دیتی ہے ایک ہی کمانڈر یا امیر کے احکام کی پیروی کرنا سکھاتی ہے۔ اللہ کے سپاہیوں کی تنظیم عمل میں لاتی ہے۔ جو مسلمان اس قواعد میں حصہ نہیں لے سکتا وہ اللہ کی بلازمت سے برطرف ہو جاتا ہے۔ یہ تو ہے نماز کا سیاسی پہلو۔ اب لیجئے سماجی اور معاشرتی پہلو مسجد ایک کلب کی مانند ہے جہاں سماج کے افراد جو ایک ہی اللہ کی اطاعت کرتے ہیں اور ایک ہی رسول کی پیروی کرتے ہیں دن میں پانچ دفعہ جمع ہو۔ تے ہیں۔ لازمی بات ہے کہ ایک دوسرے سے رابطہ اتحاد قائم ہو۔ اخوت کا عملی ثبوت پیش کیا جائے۔ اگر کوئی بھائی پھٹے ہوئے کپڑوں میں ملبوس ہے یا اس کا چہرہ فاقہ زدہ ہے یا وہ بیمار ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک سچا مسلمان اس کی حالت سے متاثر نہ ہو اور اس کی تکلیف رفع کرنے کی سعی نہ کرے۔ اگر کوئی شخص غیر حاضر ہے تو فطری طور پر اس کی غیہ حاضری کا سبب دریافت کیا جائیگا۔ اگر وہ بیمار ہے یا کسی مصیبت میں مبتلا ہے تو آپ کو اس کی احوال پرسی کے لئے گھر جانا مناسب ہوگا۔ اسی تمام چھوٹی چھوٹی بانیں اخوت کے رشتے کو مضبوط بنا سکتی ہیں۔ یہ نہیں کہ مسجد میں آئے۔ چند منٹ رسمی طور پر رکوع و سجدہ کیا اور باہر نکل گئے۔ اللہ کو یہ سرگز قبول نہیں کہ اس کی ذات

سے محبت کی جائے۔ مگر اس کے بندوں سے نفرت کا اظہار ہو۔ کہاں تک بیان کروں۔ نماز کے بشمار محاسن اور فوائد ہیں۔ کاش مسلمان ایک ہی خوبی اپنائیں مسجدوں کو مندر تصور کرنا چھوڑ دیں۔ مسجد ایک دیوان عام ہے۔ جہاں پنچایت کے ذریعے معمولی تنازعوں کا تصفیہ ہو سکتا ہے۔ آپس کے جھگڑے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے بغیر طے ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے حالات کو بہتر بنانے کے اقدام تجویز کئے جاسکتے ہیں کس قدر مواقع مسلمانوں کو دستیاب ہوتے ہیں جن سے کوئی استفادہ نہیں کیا جاتا۔ روزانہ پانچ وقت کی ملاقات۔ پھر جمعہ کے دن تمام شہری مسلمانوں کا اجتماع۔ سال میں دو دفعہ عید کے موقع پر سارے شہر اور گرد و نواح کے دیہات کا جم غفیر اور پھر ہر سال حج کے موقع پر تمام دنیا کے مسلمانوں کا اجتماع۔ نماز کا سیاسی پہلو نہایت اہم ہے۔ جسے بیدردی سے نظر انداز کیا جاتا ہے۔

مائیکل : ”یہ تو بہت زبردست تنظیم ہے۔ مسلمان تو اس قسم کی نماز سے دنیا کی کایا پلٹ سکتے ہیں۔“

انصر : ابھی تو اسلام کے ایک ہی اصول کی تشریح کی ہے۔ نماز کے بعد زکوٰۃ کو اہمیت دی جاتی ہے۔ معاشی نظام کا بہتر ہونا ایک نہایت ہی لازمی امر ہے۔ سرمایہ اور مزد و محنت کے مسئلہ کا اسلامی حل میں بیان کر چکا ہوں۔ زر۔ زان۔ زمین تمام فسادات کی جڑیں ہیں۔ دوستوں۔ رشتہ داروں۔ عہدوں وغیرہ کی محبت اور انس کا امتحان اسی زہر پر منحصر ہے۔ مثل مشہور ہے کہ مفلسی میں سب کا رہ کشی کر جاتے ہیں۔ حقیقی دوست کی پہچان اسی وقت ہوتی ہے۔ اسی طرح اللہ بھی اپنے اطاعت گزاروں کا امتحان لیتا ہے۔ جو اللہ کی راہ میں خرچ کر سکتا ہے وہی اس کا دوست بن سکتا ہے۔ اللہ قرآن میں فرماتا ہے ”نیکو اسی امر پر موقوف نہیں کہ تم اپنا رخ نماز کے وقت مشرق یا مغرب کی طرف کر لو۔ نیک وہ ہے جو اللہ کی رستی۔ روتہ جزا فرشتوں۔ تمام رسولوں اور آسمانی کتابوں پر یقین رکھتا ہے۔ اور اللہ کی راہ میں اپنی دولت میں سے ایک حصہ اپنے حاکم و رشتہ داروں یتیموں عیالوں مسافروں اور غم دور کرنے والوں کی اعانت میں صرف کرتا ہے جو مفلسی کی دہ سے

مسرت سے محروم ہوتے ہیں یا مفلس قرض داروں اور غلاموں کو ان آفات کے چنگل سے آزاد کروانا ہے۔ اللہ کو اس اعانت کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایک مہذب سماج میں خیرات ایک اہم ادارہ ہے۔ اس لئے دولت مندوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی دولت میں سے ایک حصہ ناداروں کی حاجت روائی کے لئے وقف کر دیں۔ اشتراکی نظام کی عدم موجودگی میں خیرات ہی اعانت کی دوسری صورت ہے۔ قرآن کی روشنی میں خیرات کا مفہوم یہ ہے (۱) خیرات صرف اللہ کی خوشنودی کے حصول کی خاطر کی جائے۔ اگر خیرات کسی فانی مفاد کے پیش نظر کی جائے۔ تو خیرات کا مفہوم ہی فنا ہو جاتا ہے۔ اللہ فرماتا ہے کہ خیرات اس طرح کرو کہ اگر وہاں ہاتھ دے تو باتیں ہاتھ کی خیر نہ ہو۔

ماہیکل۔ یہ ہم باتیں تو میرے نظریے کے مطابق ہیں یعنی نیکی برائے نیکی یہی سب سے بلند آدرش ہو سکتا ہے۔ سچائی اگر اللہ کا نام ہے تو سائنس اور اسلام میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

القصر: بیشک۔ اصولوں میں کوئی فرق نہیں بمنزل ایک ہی ہے راستے دو ہیں۔ اللہ فرماتا ہے کہ ہمیشہ اچھی چیز خیرات کرو۔ پھٹے پرانے کپڑے اور دسترخوان کا بچا کھپا کھانا خیرات میں دینا اللہ کو پسند نہیں ہو سکتا۔ جو چیز تم خود پسند نہیں کرتے۔ وہ دوسروں کے لئے پسند کیوں کرتے ہو خیرات صرف حق داروں کو دو۔ اچھی غذا اور اچھے ابوسات ایسی ضروریات ہیں جو ہر ایک انسان کو میسر آنی چاہئیں۔ خواہ وہ قیدی ہو یا مجرم بلکہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ خیرات ناداروں کو شراب اور انجم مہیا کرے۔ اگر خیرات سست کاہل اور دست نگاہ بننے میں مدد دیتی ہے تو ایسی خیرات ناجائز ہے۔ خیرات کا مقصد یہی ہے کہ جائز ضروریات کے مہیا کرنے میں ناداروں کی مدد کی جائے (۴) اگر کسی کو روپیہ قرض دو تو اسکی ادائیگی پر زور مت دو۔ قرضدار کو ہمت دو اور اگر واقعی وہ قرضہ ادا کرنے کے نا قابل ہو تو اس کو قرضہ معاف کر دو۔ اللہ اس کا اجر کبھی گنا زیادہ عطا کرے گا (۵) حد سے تجاوز کرنا مہرجات میں برائے ہے۔ اس لئے اللہ اپنی خیرات اور سخاوت کرنے سے بھی منع کرتا ہے جس سے

وہ خود مفلس ہو جائے اور اُس کے بیوی بچوں کو فاقہ کشی کرنا پڑے۔ خیرات اتنی ہی مناسب ہے جو ذاتی اخراجات کے بعد آسانی سے کی جاسکے۔ یہ تو ہیں پسندیدہ خیرات کے اصول۔ اب لیجئے زکوات کو یعنی لازمی خیرات کی ادائیگی کے قوانین (۱) بارش سے جو اناج، سبزیاں اور پھل وغیرہ پیدا ہوں ان کا دسواں حصہ۔ آبپاشی سے جو پیداوار ہو اس کا بیسواں حصہ۔ یہ حصہ فصل کی تیاری پر واجب الادا ہو جاتا ہے (۲) اگر کسی شخص کے پاس کم از کم ساڑھے سات تو لے سونا ہے یا ساڑھے باون تو لے چاندی ہے۔ یا دونوں ملا کر اس قیمت کے مساوی ہیں اور جو ایک سال کے لئے ملکیت میں رہ چکے ہوں تو اس قیمت کا چالیسواں حصہ زکوات ہے۔ اسی طرح اگر کسی کے پاس کم از کم چالیس بیٹریں یا بکریاں یا گائیں ایک سال سے قبضہ میں ہیں تو ان کی مجموعی قیمت کا چالیسواں حصہ بطور زکوات دینا ہوگا۔ اس لئے اسلام دولت کو خرچ کرنے کا درس دیتا ہے۔ اگر کوئی جمع کرتا ہے تو اسے خسارہ ہی رہے گا۔“

مابینکل۔ ”بڑے ہی کارآمد قوانین ہیں۔ بیشک، یہ اشتراکیت کے متقابل بن سکتے ہیں مگر کیا ان قوانین پر عمل درآمد ہوتا ہے؟ اس صورت سے کوئی مسلمان مفلس و نادار نہیں رہنا چاہیے۔“

انصر۔ ”یہی تو کمی ہے۔ جو کام کی چیز ہے اسے علمائے دین نظر انداز کئے بیٹھے ہیں میرے تنہا زکوات دینے سے کیا بنتا ہے۔ میں جی میں بہت کڑھتا ہوں۔ مگر فکرِ معاش سے مجھے فرصت نہیں ملتی ورنہ۔۔۔۔۔“

مابینکل۔ ”اس لئے اشتراکیت بہتر ہے کہ شخص کو مجبوراً وہ طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے جس کی آپ کا اسلام تلقین کرتا ہے۔“

انصر۔ ”میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔ کہ دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ اشتراکیت یا جمہوری حکومتِ الہیہ آخر الذکر نظام میں دوسرے مذہب کے پیروکار بطور رعایا ہی رہ سکتے ہیں اس کے برعکس اول الذکر میں تمام مذاہب اور قومیں نشوونما پاسکتی ہیں۔ اس لئے میں تو

اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ آپ کے نظریے کے مطابق ہر ملک میں اشتراکیت ہو گا یا دیوں میں مذاہب کی حکومت ہو۔“

مائیکل۔ ”اچھا تو یہ بتائیے کہ زکوات کے روپے کی وصولی اور تقسیم کا کیا طریقہ اسلام نے تجویز کیا ہے۔“

انصر۔ ”زکوات کی رقوم ایک بیت المال میں جمع ہوں اور پھر مستحق لوگوں میں تقسیم کی جائے۔ مستحق لوگوں کی فہرست اسلام نے یہ پیش کی ہے (۱) ایسے اشخاص جو تنگی سے گزارنا کرتے ہیں بلکہ دست سوال نہیں دراز سکتے (۲) ایسے افراد جو نابینا ہوں۔ اپاہج یا مایوس العلاج ہوں۔ کام کی تلاش کے باوجود بیکار ہوں (۳) زکوات وصول کرنے والے جو حکومت کی طرف سے مقرر ہوں۔ ان کی تنخواہ یا ان کا معاوضہ بھی اسی بیت المال میں سے ادا کیا جائے (۴) ایسے اشخاص جو اسلام کو قبول کرنے کی وجہ سے اپنی وراثت جانا دیا ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھیں (۵) غلام جو آزادی کے خواہاں ہوں۔ کیونکہ غلامی کا انسداد ہو چکا ہے۔ اس لئے اس لئے تحت میں ایسے سیاسی قیدی شامل کئے جاسکتے ہیں جو روپیہ کے نہ ہونے کی وجہ سے اغیار کی قید میں ہوں (۶) ایسے اشخاص جو اپنا قرضہ چکانے کے بعد بہت کم اثاثہ کے مالک رہ جائیں ان پر زکوات فرض نہیں ہے لیکن شرط یہ ہے کہ قرضہ فضول خرچی کا نتیجہ نہ ہو (۷) مجاہد یعنی وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں اپنا وقت اور قوت صرف کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ مالدار ہی کیوں نہ ہوں مگر غیر معمولی اخراجات کو برداشت کرنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں (۸) ایسے لوگ جو سفر میں ہوں مگر چودہ اپنے گھر پر مالدار ہوں مگر زاد راہ میں کمی واقع ہو جائے یا روپیہ چوری ہو جائے ان کو وطن پہنچانا ہر ایک انسان کا فرض ہے۔ نماز اور زکوات کا مفہوم تو واضح ہو گیا ہو گا۔ اب لیجئے اسلام کا تیسرا فرض یعنی ماہ رمضان کے روزے۔ روزہ رکھنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ صبح سے لیکر شام تک تیس دن فاقہ کیا جائے اور اس کے بعد جو جی میں آئے کھا لیا جائے۔ یہ کوئی رسم نہیں ہے بلکہ نماز اور زکوات کی طرح ایک خاص مقصد کے

کا ذریعہ ہے۔ اللہ فرماتا ہے۔ اے ایمان والو۔ روزے تم پر بھی اسی طرح فرض کئے گئے ہیں جس طرح کہ ان لوگوں پر جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں تاکہ تم شاید پرہیزگار بن سکو۔ شاید کا لفظ قابل غور ہے۔ قرآن یہ نہیں کہتا کہ تم یقیناً پرہیزگار بن جاؤ گے۔ اللہ نے تو نسخہ تجویز کر دیا ہے تیس دن بھوک پیاس اور شہوت پر قابو رکھنا تسخیر نفس کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اس کے علاوہ روزہ رکھنے کا یہ مطلب ہے کہ انسان تمام گناہوں کے ارتکاب سے پرہیز کرے۔ ایک مہینہ کی یہ تربیت سائے سال کام آسکتی ہے۔ ہر سال کی کوشش سے انسان اپنے جذبات پر زیادہ سے زیادہ قابو حاصل کر سکتا ہے۔ اس حقیقت کو ملحوظ رکھیں کہ اسلام نفس کشی کی تعلیم نہیں دیتا۔ جذبات کو فنا کرنے کا درس نہیں دیتا۔ البتہ جذبات کو جائز طور پر تسکین دینے کی تلقین ضرور کرتا ہے۔ بھوک پیاس اور جنسی بھوک ایسی ضرورتیں ہیں جن کو نظر انداز کرنا امر محال ہے۔ صبح سے شام تک روزہ دار ان ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتا۔ مگر روزہ افطار کرنے کے بعد روزہ رکھنے کے وقت تک وہ ان تینوں ضرورتوں کو قوت ارادی کے تابع کر سکتا ہے۔ وہ سال میں کسی وقت بھی ضرورت پڑنے پر ایسا کرنے کا حوصلہ رکھ سکتا ہے۔ اس لئے اگر آپ رمضان کے مہینے کے ختم ہوتے ہی پھر وہی شراب نوشی زنا کاری۔ فریب کاری۔ بھوٹ ظلم اور نا انصافی کا ارتکاب کرنے لگیں تو اس کا یہی مطلب ہوا کہ کیا کرنا یا سب خاک میں مل گیا۔ اسی لئے رسول عربی کا قول ہے کہ اکثر روزہ دار ایسے ہیں جو سوائے بھوک اور پیاس کے اور کچھ حاصل نہیں کرتے۔ ایسے بھی ہیں جو تمام رات عبادت میں کھڑے رہتے ہیں مگر تھکاوٹ کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اس حدیث سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ صرف فاتحہ کشی ہی روزہ کا مفہوم نہیں۔ روزہ جذبات پر اختیار حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ روزہ درحقیقت وہی ہے جو تمام گناہوں کی آلائشوں سے پاک ہو یہ تو ہے روزہ کا انفرادی اصلاح کا پہلو۔ اب مذہبی پہلو پر غور کیجئے۔ کیا اس بات کا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ کوئی شخص جس کے ذہن میں خدا کے وجود اور روز جزا و سزا کے متعلق کوئی ذرا سا بھی شک و شبہ موجود ہے۔ جون کی چلپاتی دھوپ اور بے پناہ گرمی میں بھوکا اور پیاسا

رہنا پسند کر سکتا ہے؟ یہ انسانی فطرت ہے کہ شک و شبہ قوتِ ارادی کو کمزور کر دیتا ہے۔ اسلئے یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص جو خدا کی ہستی کا قابلِ نہ ہو یا یقینِ کامل نہ رکھتا ہو وہ روزے کی معصبتوں کو بخوشی جھیلنے کی تاب رکھ سکتا ہے۔ اس لئے روزہ اللہ کے سپاہی کا زبردست امتحان ہے۔ فوجی تربیت کی طرح یہ امر لازمی ہے کہ تمام افراد کی مجموعی طور پر تربیت کی جائے۔ اسی مقصد کے پیش نظر سال میں رمضان کا مہینہ مقرر کر دیا ہے تاکہ ساری قوم کی ایک ہی وقت میں تربیت عمل میں لائی جائے۔ قوموں کی اصلاح و تربیت میں تنظیم کا عنصر نہایت اہم درجہ رکھتا ہے۔ اب ایسے کعبہ کا حج مختصر طور پر کعبہ کی تاریخ یہ ہے کہ سب سے پہلے کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ یہ مقام صرف عبادت کیلئے مخصوص نہیں کیا گیا تھا۔ اصلی غرض و غایت یہ تھی کہ کعبہ اسلام کا مرکز بنے جہاں ہر سال دنیا کے تمام کونوں سے توحید کے پرستار اکٹھے ہوں۔ ایک پروگرام مرتب کیا جائے اور اس پیغام کو حاجیوں کے ذریعے تمام دنیا میں نشر کیا جائے۔ مگر کچھ عرصہ گزرنے پر کعبہ سب سے بڑے تنجانی میں تبدیل ہو گیا۔ ہر طرف سے لوگ ہر سال جمع ہوتے مگر یہ اجتماع میلہ کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ اس موقع پر دعوتیں اڑتیں۔ موسیقی۔ رقص۔ عورت اور شراب اپنے جوبن پر ہوتی۔ حج کرنے والے کعبہ کا طواف بھی کرتے تھے مگر کس طرح؟ مرد و عورت برعینہ حالت میں کعبہ کے گرد چکر لگاتے اور یہ کہتے کہ خدا کے پاس وہ اسی حالت میں لوٹیں گے جس میں وہ پیدا ہوئے ہیں۔ یہ حالت دو ہزار برس تک رہی اور ایک بار پھر رسول عربی نے حضرت ابراہیم کی تاریخ کو دہرایا اور بتوں کی جگہ اللہ کی حکومت مکتہ میں قائم کر دی۔

مائیکل : حج کا مقصد کیا ہے؟ کیا یہ بھی مذہبی رسم ہے؟

انصر : جس مقصد کے حصول کے لئے نماز۔ زکوٰۃ اور روزہ اعانت کرتے ہیں حج اس تربیت کے آخری قواعد میں سے ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ حج ایک ایسا سفر ہے جو تمام ذاتی اغراض سے پاک ہے۔ میرا تجارت اس کا مدعا نہیں ہوتا۔ حج کو جانو لاشخص اپنے وطن۔ آرام و آسائش۔ دوستوں اور رشتہ داروں کو نصرت اللہ کی اطاعت گزاری کا

ثبوت دینے کی خاطر چھوڑتا ہے۔ وہ ایک نیک مقصد پیش نظر رکھ کر روانہ ہوتا ہے۔ اس لئے ہر ادنیٰ گناہ سے بھی اجتناب کرنا نہایت لازمی ہے۔ بڑے اعمال تو کجا بگے خیالات سے پرہیز بھی ضروری ہے۔ گناہ کا تصور بھی نہیں کرنا چاہیئے۔ جبکہ وہ ایسے مقدس کام کو باختوں میں لیتا ہے۔ یہ اس کا آخری امتحان ہے اور اس میں کامیابی حاصل کرنا اشد ضروری ہے۔ حج کے سفر کا تصور کیجئے۔ وہ اس مقام تک پہنچ جاتا ہے۔ جہاں اسے اپنا پسندیدہ یا مکی لباس اتار کر احرام، باندھنا پڑتا ہے یعنی صرف ایک سفید چادر۔ جو استعمال کرنے کی اجازت ہے۔ اس منزل کے بعد عطر آرائش و زیبائش۔ مواصلت اور شکار ممنوع ہیں۔ اس کا باطن ایسا ہی سفید اور بے داغ ہونا چاہیئے جیسا کہ ظاہری لباس۔ احرام باندھنے کے بعد وہ بلند آواز سے یہ الفاظ عربی زبان میں ادا کرتا ہے۔ ”میں حاضر ہوں اے میرے خالق میں حاضر ہوں تیرا کوئی ثانی نہیں۔ تیرا حکم بجا لایا ہوں۔ تمام تائش تیرے ہی لائق ہے۔ تمام کائنات کا تو ہی مالک ہے اور تیری شہنشاہی میں کوئی شریک نہیں۔“ یہیں وہ الفاظ جو نماز کے بعد چڑھتے اترتے۔ دوسرے لوگوں کے پاس سے گذرتے وقت اور بیدار ہوتے ہوئے ادا کرتا رہتا ہے۔ یہ الفاظ یہ دراصل حضرت ابراہیم کی پکار کا جواب ہیں۔ جو آپ نے کعبہ کی تکمیل کے بعد بلند آواز سے کہے تھے ”اے اللہ کے خادمو۔ اللہ کے گھر کی طرف آؤ۔ دنیا کے تمام کونوں سے آؤ۔ پیدل آؤ۔ سوار ہو کر آؤ۔“ اس نظارہ کا تصور کرو۔ جب لاکھوں کی تعداد میں حاجی اس پکار کا جواب دیتے ہیں۔ چار ہزار سال کا عرصہ نیست و نابود ہو جاتا ہے یوں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کھڑے دوسری طرف سے پکار رہے ہیں اور تمام حاجی اس طرف سے جواب دے رہے ہیں۔ اس انداز سے توحید کا پرستار۔ سچائی کا عاشق۔ صداقت کا رشتہ کعبہ کی طرف کھینچا جاتا ہے۔ مکہ پہنچتے ہی وہ سیدھا کعبہ کا رخ کرتا ہے تین دفعہ طواف کرتا ہے اور ہر دفعہ حجر اسود کو بوسہ دیتا ہے۔ وہ پتھر جو حضرت ابراہیم نے اپنے ہاتھوں سے رکھا تھا۔ اس کے بعد چند دن وہ وہاں قیام کرتا ہے اور چند مذہبی احکام بجا لاتا ہے۔ اس کے بعد احرام کھول دیا جاتا ہے اور عارضی پابندیاں دور ہو جاتی ہیں۔ یہ تو

ہے۔ حج کا انفرادی پہلو۔ یعنی تکمیل تربیت۔ اب اس کے سیاسی پہلو پر غور کیجئے۔ جو زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ خیال کیجئے کہ حج کے موقع پر تمام دنیا کے ملکوں سے لاکھوں مسلمانوں کا اجتماع ہوتا ہے مختلف ممالک سے وہ ایک ہی مرکز پر ایک ہی مقصد لیکر جمع ہوتے ہیں۔ جس وقت وہ حج کے سفر پر روانہ ہوتے تھے مختلف لباس زیب تن کئے ہوئے تھے۔ مگر اب ایک ہی قسم کے لباس یعنی وردی میں ملبوس ہیں۔ شاہ و گدا میں کوئی تمیز نہیں رہتی۔ نماز کی ادائیگی اور پیکار کا جواب دیتے وقت ایک ہی زبان استعمال کرتے ہیں۔ اور ایک ہی امام کی قیادت میں نماز پڑھتے ہیں۔ اور ایک ہی طریقے سے مذہبی رسومات ادا کرتے ہیں۔ مسافات اور اخوت کا اس سے بہتر نظارہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ یہ ہے وہ طریق جس سے رنگ و نسل۔ قوم و وطن۔ دولت و افلاس کے اختلافات کو ایک ہی دار میں دو کر دیا جاتا ہے۔ اس کی مثال اور کوئی مذہب پیش نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ اسلام نے حج کے چار مہینوں کو مقدس قرار دیا ہے اور کسی قسم کا فساد یا کسی قسم کی جنگ کرنے سے منع کیا ہے سال میں کم از کم چار مہینے امن قائم رکھنے کا یہ عملی طریق ہے۔ اور ایک ایسا مرکز مہیا ہو جاتا جہاں تمام مسلمانوں کے حقوق برابر ہیں۔ رسول عربی نے فرمایا تھا کہ جو کوئی بھی اس شہر میں آکر آباد ہو گا وہ اسی کی اقامت گاہ بن جائے گا۔ مگر افسوس کا مقام ہے کہ وہ مرکز جہاں سے علم و صداقت کی روشنی تمام دنیا میں پھیلی۔ وہی مرکز اسی جہالت کے پرشے میں مستور ہو چکا ہے جس کو رسول عربی نے دور کیا تھا۔ اللہ کا گھر ایک جاگیر بن چکا ہے۔ اور منظمین کعبہ زر کے بندے بن چکے ہیں۔ حج ایک رسم میں تبدیل ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حاجیوں کی اکثریت سچے مسلمانوں کا نمونہ بن کر واپس نہیں آتی۔ ان کے کردار میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آتی۔ کیا یہ شرمناک بات نہیں ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں مسلمان ہر سال ایک ہی مرکز پر جمع ہوتے ہیں اور کوئی تعمیری کام نہیں کرتے اور جوں کے توں واپس آکر پھر وہی گناہ آلود زندگی بسر کرتے شروع کر دیتے ہیں۔ اگر یہ حاجی صداقت کا پیکر بن کر لوٹیں تو کیا یہ لوگ دوسروں کے کردار پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ ان کا اپنا اعلیٰ کردار جہاں بھی وہ رہیں جہاں سے گزریں۔ ایک انقلاب کا باعث

ہو سکتا ہے کسی تبلیغ کی ضرورت نہیں کسی پروپیگنڈا کی ضرورت نہیں۔ لوگ خود بخود جوق و جوق اسلام کی صداقت تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ ایک وقت تھا غیر مسلم ایما غاری کی مثال یوں دیا کرتے تھے کہ وہ ایسا ہی ایمانا رہا ہے جیسا کوئی مسلمان۔ اور اب مسلمانوں نے بددیانتی جھوٹ اور فریب میں غیر مسلموں کو زک پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ خالی الفاظ کبھی مفید نہیں ہو سکتے۔ مسلمان کے گھر پیدا ہونے سے تم غیر مسلموں پر کوئی فوقیت نہیں رکھتے۔ فوقیت وہ رکھتا ہے جو قابلیت اور کردار میں بلند درجہ رکھتا ہے اور کردار کی تربیت کا بہترین طریقہ اسلام نے پیش کیا ہے۔ اگر ان چاروں قواعد پر صحیح ممنوں میں عمل ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ دنیا تمہارے قدموں میں نہ آگے۔ یہ کوئی مفروضہ نہیں ہے۔ ایک حقیقت ہے جو بول علی اور خلفائے راشدین نے دنیا کے سامنے عملی ثبوت کی سعادت میں پیش کی تھی۔ تم یہ تاریخ پھر دہرا سکتے ہو۔ دنیا جنگ سے تنگ آچکی ہے۔ تمام اقوام امن عالمگیر کے نسخہ کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ چار سو اندھیا را چھایا ہوا ہے۔ روشنی کی سخت ضرورت ہے۔ یہ روشنی تم ہیٹا کر رکھتے ہو۔ تم راہ راست کی طرف رہنمائی کر سکتے ہو۔ سائنس بولکھلا چکی ہے۔ اس نے ہر چیز پر مادیت کا رنگ چڑھا دیا ہے۔ علم الطبیعات۔ علم الحیات اور نفسیات روشنی میں ہر چیز کی اصلیت کو بے نقاب کرنے کا قدم اٹھایا۔ مگر جس قدر علم حاصل ہوتا جا رہا ہے اُسی قدر علم کے بے پایاں ہونے کا ثبوت ہم پہنچ رہا ہے۔ اور یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ابھی انسان کا علم بہت خام ہے۔ وقت آگیا ہے کہ مشرق پھر مغرب کو روشنی دکھائے مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ تم خود پہلے ایک مثالی کردار بنو۔

تیسرا باب

ایک تجویز

انصر کی باتیں میرے دلفشیں ہو گئیں۔ مذہب کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ مذہب کا ظاہری وجود تو قائم ہے مگر مفہوم مردہ ہو چکا ہے۔ لوگ مذہب کے نام پر مرنے مٹنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر مذہب حقیقی استفادہ نہیں اٹھاتے۔ مائیکل ایک ایسے ٹاؤن بنانے کی فکر میں رہتا تھا۔ جہاں سب آزاد ہوں۔ سب مسرور ہوں۔ سب صحیح معنوں میں انسان ہوں۔ انصر اور میں اس ٹاؤن کو اللہ کے زیر سایہ آباد کرنے کے خواہشمند تھے۔ میں نے ایک پروگرام بھی اس سلسلے میں وضع کر لیا تھا۔ انصر نے اسے بہت پسند کیا۔ مائیکل نے بھی اس کی تائید کی۔ تجویز یہ تھی کہ مائیکل کے آئین کے مطابق جب ایک قوم ایک ٹاؤن میں آباد کی جائے تو قوموں کی اس طریق پر تنظیم آسانی ہو سکتی ہے۔ ایک بستی میں ہزار خاندان آباد کئے جائیں۔ ایک ہزار بالغ مردوں کے جو اپنے اپنے خاندان کے نمائندے ہونگے دس دستے بنائے جائیں۔ یعنی ایک سو ہسٹیاں کا ایک دستہ ہوگا۔ دس مہائے مل کر اپنے میں سے بہترین شخص کو انتخاب کریں جو انکا حوالدار کہلا سکتا ہے۔ دس حوالدار مل کر ایک سارجنٹ منتخب کر سکتے ہیں۔ اسی طریق پر ایک بستی کے دس سارجنٹ مل کر بہترین شخص کو اپنا لفٹنٹ منتخب کر سکتے ہیں یعنی ایک

بستی کے ایک ہزار بالغ مرد ایک لفٹنٹ کے ماتحت ہونگے۔ یہ ایک کمپنی کہلائی جاسکتی ہے ایک ٹاؤن میں اگر کسی بستیوں میں تو کئی لفٹنٹ مل کر بہترین فرد کو اپنا کیپٹن منتخب کر سکتے ہیں۔ اس طرح ایک ٹاؤن کا ایک کیپٹن ہوگا۔ ایک ضلع کے تمام کیپٹن مل کر ایک مسٹر کمانڈر کا انتخاب عمل میں لاسکتے ہیں۔ تمام اضلاع کے کمانڈر مل کر صوبہ کے اعلیٰ کمانڈر کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ اس طرح پریگنڈا کے بغیر بہترین شخص کا انتخاب عمل میں آسکتا ہے۔ جو شخص قابل۔ ہر دلعزیز اور اعلیٰ کردار کا مالک ہوگا وہی منتخب ہو سکتا ہے۔ حوالداروں کے فرائض یہ ہوں (۱) جو نو اشخاص اس کے ماتحت ہیں ان کو اوقات نماز کی پابندی پر مجبور کرے۔ یعنی ایک مقررہ جگہ پر خواہ مسجد ہو یا میدان بسببوں حاضر ہوں۔ جو غیر حاضر ہوں انکی سارجنٹ کے پاس رپورٹ کی جائے۔ اگر کوئی شخص بیمار ہے یا کئی تکلیف کی وجہ سے حاضر نہیں ہو سکا تو اس کی اطلاع ہونی چاہیے۔ اس طریق پر ایک سو آدمی تربیت پاسکتے ہیں (۲) صبح کی نماز کے بعد حوالدار اپنے نو سپاہیوں کو لیکر کھلی ہوئی زمین پہنچے جہاں سارجنٹ کی قیادت میں جسمانی تربیت کی جائے۔ غیر حاضر ہونے کے لئے زبردست وجہ ہونی چاہیے (۳) رمضان کے مہینے میں وہ ان نو اشخاص سے زکوٰۃ وصول کرے۔ اس رقم کو سارجنٹ کے حوالے کرے۔ لیت و حل کرنے والوں کی رپورٹ کرے۔ یہ رقم عید سے پہلے بیت المال میں جمع ہونی چاہیے (۴) اگلے سال کے لئے حوالدار کا انتخاب عمل میں لائے اور اس کے نتیجہ سے سارجنٹ کو مطلع کیا جائے کسی قوم کی اصلاح مقصود ہو تو اس کے ہر فرد کی اصلاح کر دو۔ قوم خود بخود سدھر سکتی ہے پانیوں کے جمع کرنے کی طرف توجہ دو، روپے خود بخود بن جائیں گے۔ یہ سنہری اصول مد نظر رکھنا چاہیے۔ اسی طرح سارجنٹ کے فرائض یہ ہونگے (۱) زکوٰۃ کی رقم کا اندراج کرنا اور حوالداروں سے مشورہ کرنے کے بعد اپنے دستہ کے مستحق لوگوں میں تقسیم کرنا۔ اگر کوئی رقم بچ رہے تو اسے بستی کے بیت المال میں جمع کرنا۔ بیکار اشخاص کے لئے کام دینا کرنا۔ اپنا بچ اور لاپرواہ اشخاص کو بیت المال سے امداد دلانا۔ (۲) مسجد کے قریب کلب

کی بنیاد رکھنا۔ جہاں کتابیں۔ رسالے اور کھیل تفریح کے سامان جتیا ہوں۔ خیرات اور زکوات کی رقوم اس کام کے لئے صرف ہو سکتی ہیں۔ ہر جمعہ کی رات کو تمام ایک سو افراد ضرور مسجد میں حاضر ہوں۔ ایک خاص پروگرام مرتب کیا جاسکتا ہے مثلاً مشاعرہ۔ مناظرہ۔ تقاریر۔ محفل میلاد وغیرہ اسی طریق پر ایک بستی کی ایک کلب قائم کی جاسکتی ہے جس کے ارکان صرف سارجنٹ اور حوالدار ہونگے۔ اگر کوئی بستی پردہ کی پابند نہیں ہے تو وہ اسی کلب کو مخلوط قرار دے سکتی ہے۔ یہ افراد کی رضا پر منحصر ہے مقصد یہی ہے کہ مجلس زندگی کو فروغ دیا جائے (۳) جمعہ کے دن تعطیل ہو۔ اور اس بات کا خیال رکھے کہ اس کے دستہ کے تمام سپاہی جامع مسجد میں حاضر ہوں۔ جمعہ کی نماز کے بعد ایک پنچایت کا اجلاس منعقد کیا جائے جس کے اراکین لفٹنٹ اور سارجنٹ ہوں۔ معمولی مقدمات اور شکایات اسی مجلس میں پیش کی جائیں۔ اگر ان کا تصفیہ نہ ہو سکے تو یہ مقدمات شہری عدالت میں پیش ہو سکتے ہیں۔ اگر حکومت غیر اسلامی ہو تو یہی کوشش کرنی چاہیے کہ ان کا تصفیہ جلد ہی میں ہو جائے عدالت میں جانے کی نوبت نہیں آنی چاہیے۔ اب لیجے لفٹنٹ کے فرائض (۱) تمام سارجنٹ باقاعدہ اپنے فرائض انجام دیں۔ ان کے فرائض میں سے حسب ذیل باتیں ہوں۔ زکوات کی رقوم جو سارجنٹوں سے موصول ہوں ان کو مستحق و متون میں تقسیم کرنا۔ بستی کے کلب کو فروغ دینا۔ اگر کوئی ٹاؤن ایک ہزار سے کم خاندانوں پر مشتمل ہے تو لفٹنٹ کا کیپٹن کے فرائض سرانجام دینا۔ کیپٹن کے فرائض یہ ہونگے (۱) تمام لفٹنٹ زکوٰۃ کی رقوم اس کے پاس جمع کروائیں۔ اور وہ انکو مستحق بستیوں میں صرف کرے (۲) جبکہ کیٹاؤں پر رکھا ہو خطبہ میں وہ پیغام کو گون تک پہنچائے جو اسے حاکم صلیع یا حاکم صوبہ سے موصول ہوں۔ (۳) عید میلاد النبی کا جلوس اور جلسہ کا انتظام کرے۔ اسی طرح حاکم ضلع کا یہ فرض ہے کہ تمام کیپٹن اور لفٹنٹ اپنا کام باقاعدہ کرتے رہیں۔ حاکم صوبہ کے احکام کو ان تک پہنچانے خطبہ کے لئے پیغام کی جتنی نقول چاہیں ان کی تعداد سے حاکم صوبہ کو اطلاع دے۔ عید سے پہلے پہلے ہر ٹاؤن کے کیپٹن کا انتخاب ہو جانا چاہیے۔ عید کے بعد کوئی دن مقرر

کر کے تمام کمیٹین بلائے جائیں اور حاکم ضلع کا انتخاب عمل میں لایا جائے۔ اسی طریق پر حاکم صوبہ ایک دن مقرر کرے تاکہ آئندہ سال کے لئے حاکم صوبہ کا انتخاب کیا جائے۔ حاکم صوبہ کے یہ فرائض ہوں گے (۱) ہر حاکم ضلع کے کام کی نگرانی کرنا (۲) جمعہ کے خطبہ کے لئے ایک اسی پیغام کی نشر و اشاعت کا انتظام کرنا۔ اس کے مصارف ہر ٹراؤن کے کمیٹین سے آبادی کے تناسب سے وصول کرنا (۳) دوسرے صوبوں کے حاکموں سے رابطہ و اتحاد قائم کرنے کی سعی کرنا۔ تمام صوبوں کا ایک سپریم کمانڈر یا قائد اعظم منتخب کیا جاسکتا ہے۔ یہ سپریم کمانڈر دوسرے ممالک سے رابطہ و اتحاد قائم کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اس طرح مکہ پھر اسلام کا مرکز بن سکتا ہے اور خلیفہ المسلمین کا انتخاب عمل میں لایا جاسکتا ہے۔ حج کے موقع پر تمام ملکوں کے قائد اعظم جمع ہو سکتے ہیں اور ایک ہی نظام پر عمل پیرا ہونے کا پروگرام مرتب کر سکتے ہیں۔ خلیفہ کا انتخاب اس طریق پر کیا جاسکتا ہے۔ جب تمام ممالک کے قائد اعظم حج کے موقع پر جمع ہوں تو وہ بہترین شخص کو خلیفہ مقرر کر سکتے ہیں۔ اگلے حج تک یہی شخص خلیفہ کے عہدہ پر ممتاز رہ سکتا ہے۔ ایک ہی اللہ۔ ایک ہی رسول۔ ایک ہی نائب اللہ۔ یعنی خلیفہ اور ایک ہی طرز عمل کی مثال اس تنظیم سے پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ طریقہ اب بھی رائج ہو سکتا ہے۔ غیر اسلامی حکومت اس طریق انتخاب میں کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتی جس وقت اسلامی حکومت قائم ہو جائے۔ تو آئین مسرت کا نفاذ کر دیا جائے۔ اشتراکیت سے بہتر معاشی حل اور کوئی ممکن نہیں۔ اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں (۱) ہندوستان کے مختلف صوبوں کی آبادی کو مخلوط رہنے دیا جائے اور ہر شہر اور دیہات میں علیحدہ علیحدہ بستیاں قائم کر دی جائیں (۲) یا صوبے علیحدہ علیحدہ مقرر کر دیئے جائیں۔ ان صوبوں کی حد بندی نئے سرے سے ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں ایک ہی صوبے میں ایک ہی مذہب کی حکومت قائم ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں ایک ہی مذہب کی حکومت قائم ہو سکتی ہے اس صورت میں تمام اضلاع کے حکام صوبہ کی مجلس نمائندگان کے اراکین کو رائے دیئے جاسکتے ہیں۔ اور حاکم صوبہ صدر اعظم بھی کہلا سکتا ہے۔ سرکاری ادارے صدر اعظم اور اسی کی کابینہ

کو سونپ دیے جائیں۔ اس طرح ہر ٹاؤن کمیٹی کا صدر ٹاؤن کمیٹین ہوگا۔ لفٹ اس کے معاونین ہونگے اور سرکاری حکام اعزازی ارکان ہونگے مثلاً ٹاؤن کا سب سے اعلیٰ ڈاکٹر انجینئر۔ پولیس آفیسر۔ جج اور مقامی کالج کا پرنسپل۔

اس تجویز پر موجودہ حالات میں بھی عمل ہو سکتا ہے۔ تنظیم نہایت اہم ہے۔ قومی ترقی کا سب سے سلازینہ یہی تنظیم ہے۔ مخالف حالات میں کامیابی اس امر کی دلیل ہوگی کہ موافق حالات میں تم کیا کچھ کر کے دکھا سکتے ہو۔ اب منزل تمہارے سامنے ہے اور منزل کو جانے والی شاہراہ بھی۔ کوئی قوم جو اس وقت قدم آگے بڑھا دے گی وہی منزل کو جائے گی۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاک اپنی فطرت میں نوری ہے ناری ہے
(اقبال)

